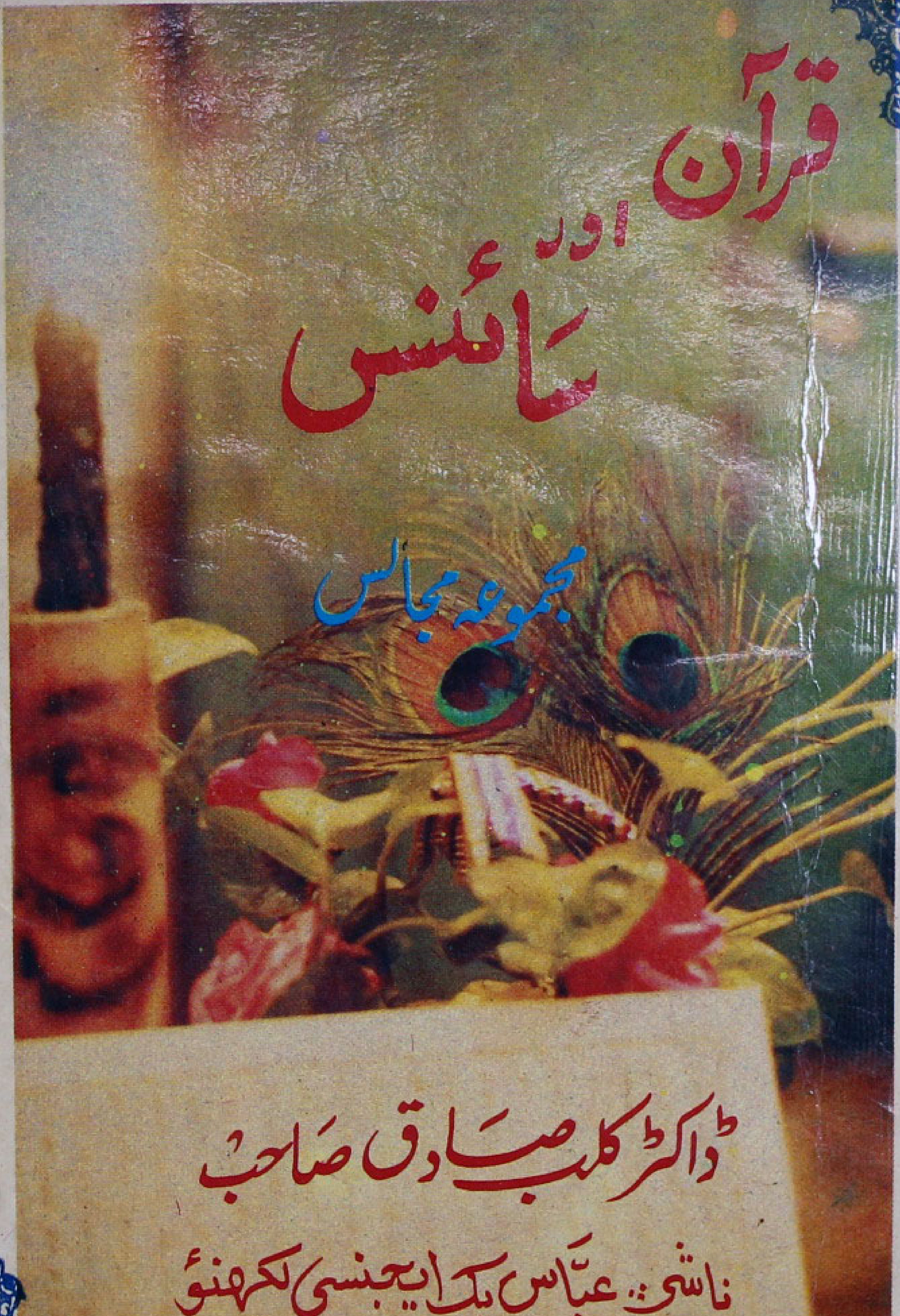
قرآن اور سائنس



مجموعہ مجالس

ڈاکٹر کلب صادق صاحب

ناشر: عباس بک ایجنسی لکھنؤ

ملنے کا پتہ ❀ **عبّاسؑ بک ایجنسی** رستم نگر درگاہ حضرت عباسؑ لکھنؤ

ملنے کا پتہ عباسؑ بُک ایجنسی رستم نگر درگاہ حضرت عباسؑ لکھنؤ

قرآن اور سائنس

بارہ مجالس ۱۹۸۴ء لاس اینجلیس (امریکا)

سیّد کلب صادق

ناشر

عبّاس بُک ایجنسی

رُستم نگر، درگاہ حضرت عباسؑ، لکھنؤ (انڈیا)

نام کتاب ... ... قرآن اور سائنس، بارہ مجالس، لاس اینجلیس (امریکا)
مقرر ... ... سید کلب صادق
کتابت ... ... شکیل حامد، ادبستان، دین دیال روڈ، لکھنؤ
سنہ طباعت ... نومبر ۱۹۹۵ء مطابق جمادی الثانیہ ۱۴۱۶ھ
تعداد ... ... دو ہزار (۲۰۰۰)
سرورق ... ... عباس حسنین
مطبوعہ ... ... اے، بی، سی آفسیٹ پریس دہلی
ناشر ... ... عباس بک ایجنسی، رستم نگر، درگاہ حضرت عباس لکھنؤ

ھدیہ : چالیس روپے

ملنے کا پتہ

عباس بک ایجنسی درگاہ حضرت عباس لکھنؤ

عرضِ ناشر

ڈاکٹر سید کلب صادق صاحب نے ۱۹۸۴ء میں لاس اینجلیس (امریکا) میں جو مجلسیں پڑھی تھیں انھیں محترمہ حنا بانو صاحبہ بنت جناب غلام عباس صاحب نے بڑی کاوش اور جاں فشانی کے ساتھ کیسٹوں سے نقل کیا ہے اور مولانا موصوف کی بے پناہ مصروفیات کی بنا پر جناب چودھری سبط محمد صاحب نے ان مسودات کو بالترتیب ملاحظہ فرمالیا ہے نیز انگریزی الفاظ کو ڈکشنری سے چیک کرنے میں سید عامر ابن جناب علی امام صاحب نے اپنا وقت صرف کیا ہے۔

ادارہ ان تمام حضرات کا تہِ دل سے ممنون و متشکر ہے اور اس کے ساتھ ہی مولانا موصوف کا بھی شکر گزار ہے کہ انھوں نے اشاعت کی اجازت مرحمت فرمائی۔

ہم اپنے ان محترم قارئین سے معذرت خواہ ہیں جنھیں اس کتاب کے لیے اب تک انتظار کی زحمتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب ہر خاص و عام میں مقبول ہو گی اور مولانا موصوف کو "معصومہؑ" اس کی جزا سے سرفرازفرمائیں گی۔

سید علی عباس طباطبائی

عباسؑ بک ایجنسی، رستم نگر، لکھنؤ

فہرست

پہلی مجلس ـــــــ ۷

دوسری مجلس ـــــــ ۳۴

تیسری مجلس ـــــــ ۶۰

چوتھی مجلس ـــــــ ۹۳

پانچویں مجلس ـــــــ ۱۲۱

چھٹی مجلس ـــــــ ۱۴۶

ساتویں مجلس ـــــــ ۱۸۴

آٹھویں مجلس ـــــــ ۲۲۰

نویں مجلس ـــــــ ۲۵۴

دسویں مجلس ـــــــ ۲۹۴

گیارہویں مجلس ـــــــ ۳۱۱

بارہویں مجلس ـــــــ

ابتدائیہ

میں یقیناً عالم ہوں مگر صرف ایک شے کا اور وہ یہ کہ میں جاہل ہوں۔ ۱۹۸۴ء میں حقیر نے جو مجلسیں لاس اینجلیس (امریکا) کے عشرۂ اولیٰ میں پڑھی تھیں، عزیزم مولوی سید علی عباس طباطبائی نے ٹیپ سے اتروایا ہے اور انھیں "قرآن اور سائنس" کے عنوان سے شائع کر رہے ہیں۔

ایک ضخیم تفسیر کے لیے یہ بات مشہور ہے کہ اس تفسیر میں سب کچھ ہے بس تفسیر ہی نہیں ہے۔ کچھ یہی بات اس کتاب کی بھی ہے۔ قرآن اور سائنس کے عنوان سے شائع ہونے والی ان تقاریر میں نہ قرآن ہے نہ سائنس۔ اس لیے کہ حقیر نہ سائنس سے واقف ہے نہ قرآن سے آشنا۔

شہرہ آفاق سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ سائنس کے بحرِ زخّار میں اب تک ہم نے قدم بھی نہیں رکھا ہے۔ صرف اس سمندر کے کنارے ریت کے ذرّوں سے کھیل رہے ہیں اور قرآن وہ کتاب ہے جس کے متعلق بابِ مدینۃ العلم کا ارشاد ہے کہ اس کے رموز و معارف سے صبح قیامت تک پردے اٹھتے رہیں گے۔

یہ تقاریر تحقیقی معیار پر بالکل بھی پوری نہیں اترتیں۔ پھر یہ کہ تقریر کی زبان اور ہوتی ہے اور تحریر کا انداز اور ہوتا ہے۔ میں اس پر نظرِ ثانی بھی نہیں کر سکا ہوں۔ اس میں حقیقتاً اشتباہات بھی ہوں گے۔ اگر ان کی طرف متوجہ کیا گیا تو آئندہ ایڈیشن میں ان کا ازالہ ہو جائے گا۔

سگِ بابِ اہلِ بیتؑ
کلب صادق

اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ؕ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ
عَلٰی سَیِّدِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ اَبِی الْقَاسِمِ
مُحَمَّدٍ خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ وَاٰلِہِ الطَّیِّبِیْنَ
الطَّاهِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ
اللّٰہُ سُبْحَانَہٗ فِیْ کِتَابِ الْمُبِیْنِ وَھُوَ اَصْدَقُ
الصَّادِقِیْنَ وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا
فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ وَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ٥

(سورہ آل عمران آیت ۸۵)

پہلی مجلس

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط وَمَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡہُ وَھُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ٥ (آل عمران آیت ۸۵)

برادران عزیز! یہ آیہ جو آپ کے سامنے تلاوت کی گئی ہے اس میں ہم سب کا پیدا کرنے والا ارشاد فرما رہا ہے کہ ہم نے تم کو پیدا کیا تو نظام زندگی اور طریقۂ حیات بھی دیا جس کا نام ہے اسلام۔ اب ہر وہ شخص کہ جو دنیا اور آخرت میں کامیاب زندگی گذارنا چاہتا ہے اس کو چاہیے کہ وہ اپنے بنائے ہوئے کسی نظام پر عمل پیرا نہ ہو بلکہ ہمارے دین پر عمل کرتا رہے۔

اس آیہ کریمہ سے متعلق جو کچھ امکان میں ہے وہ عرض کرتا رہوں گا لیکن مجلس پڑھنے والا تو وہ پیش کرتا ہے جو اس کے دل میں ہوتا ہے۔ سننے والوں کے دلوں میں کیا ہے وہ پڑھنے والا کیا سمجھے؟ اس لیے ہر مجلس کے خاتمہ کے بعد اگر آپ حضرات بھی تیار ہوں اور اسے پسند فرمائیں تو میں تھوڑی دیر یہاں بیٹھا رہوں تاکہ وہ مسائل جو آپ کے

دل میں ہیں اور وہ شکوک جو آپ کے ذہن میں ہیں اُن پر آزادئ فکر کے ساتھ غور کیا جاسکے اس لیے کہ اسلام میں تقلید واجب ہے فروع میں اور حرام ہے اصول میں، تقلید واجب ہے احکام میں اور حرام ہے اعتقادات میں۔ اسلام کا حکم ہے کہ معاشرے کے دباؤ سے، سوسائٹی کے پریشر سے کبھی اپنا عقیدہ نہ بناؤ کہ تم اپنی لگام دوسروں کے ہاتھوں میں نہ دو۔ اللہ نے تمھاری رہنمائی کے لیے عقل تم کو دی، فکر تم کو دی ہے اور اس کے نزدیک سب سے بڑا کفرانِ نعمت یہ ہے کہ انسان نعمت کا استعمال نہ کرے۔ اُس کا اصول یہ ہے کہ جس نعمت کو تم استعمال نہ کروگے وہ تم سے دھیرے دھیرے چھین لے گا۔ اس نے آنکھیں دی ہیں، آپ آنکھوں پر پٹی باندھ کر بیٹھ جائیں، کچھ روز بعد جب آپ آنکھیں کھولیں گے تو آپ کو دیکھنے میں دشواری محسوس ہوگی۔ پیر دیے ہیں آپ پیروں کو باندھ کر بیٹھ جائیں اور چند دن پیروں سے کام نہ لیں تو آپ کا کھڑا ہونا دشوار ہو جائے گا۔ ہاتھ اس نے دیے ہیں کسی شئے کو تھامنے کے لیے اگر آپ اپنے ہاتھوں سے کام نہ لیں تو اس کفرانِ نعمت کی سزا یہ دے گا کہ تھامنے کی صلاحیت ہاتھوں سے لے لے گا۔ تو اسی طرح اس نے آپ کو عقل دی ہے، عقل کی ورزش اور EXERCISE ہے فکر، اگر آپ فکر نہ کریں گے تو آپ کی عقل کم ہوتی چلی جائے گی۔ انسان اور جانور میں فرق عقل ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے، انسان کو اگر امتیاز اللہ نے دیا ہے تو عقل ہی کے ذریعہ۔ اگر ہم عقل کو استعمال نہ کریں گے تو دھیرے دھیرے

جانوروں والے صفات ہمارے کردار میں نمایاں ہوتے چلے جائیں گے۔

اسی لیے اسلام کہتا ہے کہ اللہ کو کسی کے کہنے سے نہ مانو بلکہ عقل اور فکر کی روشنی میں غور کرو، رسولؐ کو رسولؐ کسی کے کہنے سے نہ مانو، امامؑ کو امامؑ کسی کے کہنے سے نہ مانو۔ قرآن کو کلام الٰہی کسی کے دباؤ سے نہ مانو۔ آخرت پر ایمان کسی کے دباؤ سے نہ لاؤ۔ ہم کو معلوم ہے کہ یہ سب چیزیں تمھاری فطرت میں داخل ہیں۔ اگر تم اپنی فطرت کو آزاد چھوڑ دو گے تو تمھاری عقل اور تمھاری فکر تم کو خود کھینچتی ہوئی اسلام کی طرف لے آئے گی۔ یہ اسلام کیا ہے قرآن مجید میں ارشاد ہے فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا اسلام تمھاری فطرت ہے، اسلام تمھارا نیچر ہے تو اسلام سے بغاوت نیچر سے بغاوت ہوگی۔

بہر حال اصول دین میں کوئی تقلید نہیں۔ برادران عزیز! اگر ہم اللہ کو مان رہے ہیں مگر اپنی عقل کے ذریعہ نہیں، اگر ہم قرآن کو مان رہے ہیں مگر عقل کے استعمال کیے بغیر۔ اگر ہم رسولؐ کو رسولؐ مان رہے ہیں مگر فکر کے بغیر تو یاد رکھیے کہ یہ ساری چیزیں صحیح ہیں یہ ساری چیزیں درست ہیں مگر اس کا پھل ہمیں کچھ ملنے والا نہیں ہے جب تک کہ ہم اپنی عقل استعمال کر کے انھیں نہ مانیں اور پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتا ہوں کہ اگر ہم نے تحقیق کی، ریسرچ کی اور فرض کیجیے ہم سے غلطی ہوگئی یا فرض کیجیے ہم کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے تو دنیا میں آپ کو مسلمان نہ کہا جا سکے مگر آخرت میں آپ کو نجات مل جائے گی۔ اس لیے کہ آپ نے اپنی فکر کو استعمال کیا ہے۔ اسلام

اس بات پر اتنا زور دیتا ہے کہ جو حضرات فتوے دیا کرتے ہیں، مسائل میں اجتہاد کرتے ہیں، اُن کے لیے بھی رسولؐ کی حدیث ہے کہ ایک فتویٰ دینے والا جب مکمل ریسرچ اور مکمل تحقیق کے بعد فتویٰ دیتا ہے تو اگر وہ صحیح فتویٰ دیتا ہے تو خدا اس کو دوہرا اجر دیتا ہے اور اگر وہ غلط فتویٰ دیتا ہے تب بھی اس کو سزا نہیں دیتا ہے بلکہ پھر بھی اس کو اکہرا اجر دیتا ہے اس لیے کہ اُس نے اپنی عقل کو استعمال کیا ہے۔

اس لیے مجلس کے ختم ہونے کے بعد میں یہاں حاضر رہوں گا، جو آپ کے مسائل ہوں، جو آپ کے شکوک ہوں، جو آپ حضرات کے شبہات ہوں، میرے سامنے رکھیں۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ آپ جو سوال میرے سامنے رکھیں میں فوراً جواب دے ہی دوں۔ میں ایک معمولی سا انسان، میں اس بات کا وعدہ نہیں کر سکتا کہ میں ہر سوال کے جواب سے آپ کو مطمئن کر ہی دوں گا۔ ہو سکتا ہے کہ آپ میرے جواب سے مطمئن نہ ہوں تو ٹھیک ہے، مجھ سے ہزار درجہ بہتر پڑھے لکھے لوگ ہیں میں ان سے پوچھ کر آپ کو بتا دوں گا۔ دوسری کتابیں پڑھ کر آپ کو مطمئن کر دوں گا۔ تو مطمئن کرنا میری ذمہ داری ہے اور پوچھنا آپ کا کام۔ اور آپ کو مطمئن کروں مسلک اہل بیتؑ میں سوالات کرنے والے کو کبھی کُفر کا فتویٰ نہیں دیا جاتا مسلک اہل بیت میں سوال کرنے والے کو کبھی زندیق اور مرتد نہیں قرار دیا جاتا ہے۔ عباسی دور کا واقعہ ہے کہ ایک بہت بڑا فلسفی بھٹک گیا اپنی تحقیق میں۔ ایک دربار میں گیا، شاہی دربار، وہاں بادشاہ نے کہا تو کیا کہنا چاہتا

ے DOCUMENTS یہاں کیسے آئیں؟ تو اس مشکل کے حل کے لیے سائنس آگے بڑھی۔ اب کیا ہونا ہے؟ انھوں نے ایک میز پر بڑے بڑے MAPS کھول کر ڈال دیے، بڑے بڑے CHARTS کھول کر ڈال دیے، کتابیں کھول کر ڈال دیں اور اس کی ایک تصویر، ایک فوٹو لے لیا اور اس کے بعد اس کو ایک خاص پروسس کے ذریعہ چھوٹا کرنا شروع کیا، چھوٹا کرتے کرتے اتنا چھوٹا کر دیا کہ اس کا سائز ہو گیا FULL STOP کے برابر جو ٹائپ رائٹر سے ٹائپ ہوتا ہے اسے مائکروڈاٹ کہا جاتا ہے۔ اب انھوں نے یہاں سے ایک بالکل سیدھا سادہ خط اپنی پارٹی کو اُدھر TYPE ٹائپ کیا جس میں بچوں کی خیریت اور وہاں کی خیریت وغیرہ کا بیان۔ مگر ان سے طے ہے کہ پانچویں چھٹے جملے کے بعد جہاں پر جملہ ختم ہوگا وہاں پر جو فُل اسٹاپ FULL STOP ہوگا وہیں پر بس سب کچھ ہے۔

اب جناب وہ لیٹر ٹائپ ہوا اور وہ فُل اسٹاپ وہاں پر گرا مخصوص مصالحہ کے ذریعہ۔ اسی فل اسٹاپ کے اوپر مائکروڈاٹ جس کا سائز بھی وہی ہے، کلر بھی وہی ہے، حجم بھی وہی ہے۔ اس کو انھوں نے وہیں پر چپکا دیا۔ وہ خط چلا گیا، اب اسے آپ لاکھ سنسر کیجیے، پتہ نہیں لگا سکتے۔ غرض کہ جب خط وہاں پہنچا تو انھوں نے وہ خط تو پھاڑ کر پھینک دیا اور وہ جو تھا MICRODOTT انھوں نے نکال لیا اور اس MICRODOTT کو جب انھوں نے اس کے PROJECTOR پر لگایا تو ساری دنیا روشن ہو گئی۔ نقشے دکھائی دینے لگے DOCUMENT دکھائی دینے لگے، کتابیں

دکھائی دینے لگیں۔ تو بھائی صاحب ملاحظہ فرمایا آپ نے، یہ بیسویں صدی کا صدقہ ہے کہ آج سائنس کے ذریعہ سے کتابوں کو سمیٹ کر ایک نقطہ بنا سکتے ہیں۔ اگر ہمارے ہاتھوں کی لکھی ہمارے پریس کی چھپی کتاب نقطہ میں سمٹ سکتی ہے تو خدا کی کتابِ نور سمٹ کر نقطہ میں سما جائے تو حیرت کی کیا بات ہے۔

اچھا اب یہ بتائیے کہ اگر آپ نے وہ MICRODOT میرے ہاتھ پر رکھ دیا اور کہا کہ دیکھیے صاحب! یہ کیا ہے، تو ہمیں کیا معلوم، کالا سا دھبّہ اور کیا ہے؟ میں اڑا دوں گا اس کو پھونک مار کر۔ لیکن جو صاحب نظر ہے، کہے گا اس کو نہ اڑائیے، اسی میں تو ساری کائنات ہے، اسی میں تو ساری دنیا چھپی ہوئی ہے۔ تو اگر قرآن شریف میں یہ صفت پائی جاتی ہے کہ قرآن سمٹ کر ایک نقطہ میں آجائے گا تو اس میں پڑھنے کے لیے بھی ایک بصیرت والے کی ضرورت ہے۔ بس برادرانِ عزیز! آج مجھے اور بھی باتیں عرض کرنا ہیں آپ کے سامنے۔ آپ کی یہ بات ادھوری رہ گئی آدھی انشاء اللہ میں کل عرض کروں گا۔ (صلواۃ)

یہ ہے قرآن مجید اور یہ ہے اس کی عظمت، اس کی جلالت۔ اب میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر ذرا سی، تھوڑا سا مَس نہ ہوتی دنیا کے علوم سے زیرو کے برابر، تو میں یہ بات آپ کے سامنے کہہ سکتا تھا؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ سائنس اور مذہب میں دشمنی نہیں ہے بلکہ سائنس مذہب کی معاون ہے، سائنس مذہب کی مددگار ہے

INTERPRETOR کے ذریعہ سے آپ مذہب کو بہتر طریقہ پر SCIENTIFIC KNOWLEDGE کر سکتے ہیں۔ جو حقیقتیں چھپی ہوئی ہیں ان کو ظاہر کر کے دنیا کو متاثر کر سکتے ہیں اور جب دنیا متاثر ہو جائے گی تو اسلام کو قبول کرنے پر راضی ہو جائیگی آج جو اسلام کو قبول نہیں کیا جا رہا ہے وہ کیوں؟ وہ کہتے ہیں کہ ہم MODERN MINDED جدیدیت پسند ہیں اور اسلام قدامت پسند ہے۔ لیکن جب ان کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ اسلام ان سے بھی منزلوں آگے چل رہا ہے تو اس کے پیچھے چلنے کو خود بخود تیار ہو جائیں گے۔ تو بس آپ کے ذمہ اتنا کام ہے کہ آپ خالی یہ دکھا دیں کہ اسلام تمھارے آگے آگے ہے تمھارے پیچھے نہیں ہے تو دنیا خود بخود اسلام قبول کر لے گی۔

ملاحظہ فرمائیں اس لیے کہ آج کی مجلس میں آپ کی خدمت میں خاص طور سے یہ بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ علم کی قدر کریں۔ علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے ماننے والوں کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ جاہل رہیں علی ابن ابی طالب علیہ السلام کو امام کہنے والوں کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ علم کی کسی منزل پر پہنچ کر یہ سمجھنے لگیں کہ وہ عالم ہو گئے۔ آپ کہاں رہے ہیں، کہاں ہیں آپ؟ بُرا نہ مانیے گا۔ علم اس منزل پر پہنچ چکا ہے کہ ہمارے بڑے بڑے علاّمہ بھی ناقابل تذکرہ قرار پا گئے ہیں۔ یہ ہے آپ کی پوزیشن، یہ اس قوم کی پوزیشن ہے کہ جس کے امامؑ کے بارے میں رسولؐ نے یہ ارشاد فرمایا تھا اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَ عَلِیٌّ بَابُھَا میں علم کا

شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں۔

میرے عزیز بھائیو! دولت سے اقتدار نہیں آتا، خاندان سے اقتدار نہیں آتا، پارٹی سے اقتدار نہیں آتا۔ اللہ نے اقتدار و اختیار وابستہ کیا ہے علم سے، جتنا علم ہوگا اتنا ہی اقتدار بڑھتا چلا جائے گا۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں آج جو میں چند گھنٹے میں لکھنؤ سے چل کر یہاں پہنچ گیا، آج سے سو برس پہلے یہ کوئی سوچ سکتا تھا؟ یہ کمپیوٹر COPMUTER کا زمانہ ہے۔ جو مسائل پہلے برسوں میں نہ حل ہو سکے، یہ چٹکی بجاتے حل کر دیتا ہے۔ یہ سب کیسے ہوتا ہے، یہ اختیار انسان کا کائنات پر کیسے ہو پایا، یہ اختیار دولت دلوا رہی ہے؟ خاندان دلوا رہا ہے؟ علم اور صرف علم اور اسلام میں علم کی اہمیت کیا ہے؟ امام جعفر صادق علیہ السلام کے ہزاروں شاگرد تھے جنھیں امامؑ درس دیا کرتے تھے اور جس جگہ درس دیا کرتے تھے، وہاں ایک چھوٹی سی مسند بچھی ہوئی تھی اور مسند کے پیچھے ایک چھوٹی سی تختی لگی ہوئی تھی، اس تختی پر یہ شعر لکھا ہوا تھا:

لَیْسَ الْیَتِیْمُ الَّذِیْ قَدْ مَاتَ وَالِدُہٗ

اِنَّ الْیَتِیْمَ یَتِیْمُ الْعِلْمِ وَ الْاَدَبِ

بالکل سر کے پیچھے کہ جو امام کے چہرے کو دیکھے تو وہ شعر بھی دیکھے اور پڑھے۔ وہ شعر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ یتیم نہیں جو اپنے باپ سے محروم ہو جائے، یتیم وہ ہے جو علم سے محروم ہو جائے۔ اب بھلا امامؑ کی بات غلط ہو سکتی ہے؟ اب اگر بے علم یتیم ہوتے ہیں تو قوم کو

دیکھ کر فیصلہ کریں کہ کتنا بڑا یتیم خانہ کھولنا پڑے گا۔

آپ کی حالت تو پھر بھی غنیمت ہے، ذرا ہندوستان میں تشریف لائیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ہندوستان کے شیعوں کی بہت بڑی اکثریت ایسی ہے میں نے پورے ہندوستان کے شیعوں کا سروے کیا تھا جس میں کم سے کم ۳۰٪، ۳۵٪ ایسے لوگ ہیں جو دستخط نہیں کر سکتے انگوٹھا لگاتے ہیں یہ لوگ۔ لکھنؤ میں جو کہ علم کا مرکز تھا، اب جناب والا! صورتِ حال یہ ہے کہ ہم نکاح پڑھنے کے لیے گئے تو نکاح نامہ پر ان کو دستخط بھی کرنا ہو تو اکثر و بیشتر یہ منظر دیکھنے میں آتا ہے کہ دولھا میاں دستخط بھی نہیں کر پاتے، نکاح نامہ پر، اور انگوٹھا لگاتے ہیں۔ تو یہ جو زوال آرہا ہے وہ بھی آپ کے پیش نظر ہے۔

چلیے علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا قول آپ کے سامنے رکھوں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ سائنس نہ پڑھو، اگر سائنس پڑھو گے تو کافر ہو جاؤ گے، سائنس کی دشمنی لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو گئی ہے اور یہ پیدا بھی ہونا چاہیے کہ حضرت علی نے فرمایا ہے "اَلنَّاسُ اَعْدَاءُ مَا جَهِلُوْا" انسان جس بات سے ناواقف ہوتا ہے اس کا دشمن ہو جاتا ہے۔ تو ہمارے یہ سادہ لوح علماء ہیں جو سائنس سے واقف نہیں ہیں تو اس کے دشمن ہو گئے۔ عجیب و غریب بات ہے۔ علیؑ نے تعلیم فرمائی ہے کہ انسان ناواقف چیز کا دشمن ہو جاتا ہے۔ میں ایک تھوڑا سا سائنس کو جانتا ہوں، مجھ پر انکشاف ہوا کہ سائنس مذہب کی دشمن نہیں ہے، یہ دوست ہے۔

یہ جو رسولؐ نے فرمایا انا مدینۃ العلم و علیؑ بابھا "میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ" تو کیا معنی ہیں یہاں علم کے۔ علیؑ کو صرف نماز کے مسائل معلوم ہیں؟ صرف روزہ کے مسائل معلوم ہیں؟ تو اگر یہی معنی ہیں علم کے تو علیؑ منبر پہ بیٹھ کر کبھی نہ کہتے کہ سَلونی سلونی قبل اَن تفقدونی آپ نے تو اتنا ہی سنا ہے، یہ جملہ پورا یوں ہے، سنیے! فرمایا سلونی سلونی قبل ان تفقدونی فانِی بطرق السّمَاء اَعلم مِنی بطرق الارض یہ جملہ یہاں پہ آ کے ختم ہوتا ہے۔ لیکن کچھ لوگوں نے اسے آدھا ہی بیان کیا ہے۔ کیونکہ اگر آگے پڑھیں گے تو اس کا مطلب بھی بیان کرنا پڑے گا، لہٰذا وہی بات فرماتے ہیں کہ پوچھو جو چاہے پوچھو اور میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ زمین کے مسائل پوچھو بلکہ تم مجھ سے آسمانوں کی راہوں کے بارے میں بھی سوال کرو۔ اس لیے کہ زمین کی راہوں سے زیادہ آسمانوں کی راہوں سے واقف ہوں۔ (صلواۃ)

تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں۔ اچھا میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ یہاں کچھ افغانی بھائی دکھائی دے رہے ہیں، کچھ ایرانی ہیں۔ تو افغانی بھائی پشتو میں دیکھیں، ایرانی بھائی فارسی میں دیکھیں، پاکستان سے آنے والے اردو میں دیکھیں، میں ہندوستان سے آیا ہوں، اپنی راشٹریہ بھاشا ہندی میں دیکھوں، کوئی انگریزی میں دیکھے، کوئی کسی اور زبان میں دیکھے۔ ذرا انصاف سے بتائیے گا کہ دنیا کی کسی زبان میں کبھی بھی علم کے لیے شہر کی تشبیہ آئی ہے۔ CHALLENGE

دعویٰ ہے، فلاں علم کا چاند ہے، فلاں علم کا آفتاب ہے، فلاں شخص کیا کہنا بھئی اس کا، علم کا دریا ہے، علم کا سمندر ہے، علم کا خزانہ ہے، علم کا چراغ ہے، یہی سب تو کہا جاتا ہے۔

کہیں آپ نے سنا ہے کہ فلاں آدمی علم کا شہر ہے؟ شہر کا کیا تعلق علم سے۔ مگر رسولؐ ایک عجیب و غریب لفظ استعمال کر رہے ہیں۔ نہ یہ کہتے ہیں کہ میں علم کا چراغ ہوں علیؑ اس کی روشنی ہیں، یہ نہیں کہتے ہیں میں علم کا آفتاب ہوں علیؑ اس کی کرن ہیں، میں علم کا چاند ہوں علیؑ میری چاندنی ہے، میں علم کا خزانہ ہوں علیؑ میری کلید۔ فرماتے کیا ہیں کہ میں علم کا شہر ہوں علیؑ اس کا دروازہ ہیں۔ اپنی مصلحت حضورؐ ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں لیکن میری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ فرما سکتے تھے کہ میں علم کا چاند ہوں، علم کا دریا ہوں، علم کا آفتاب ہوں، علم کا سمندر ہوں، علم کا چراغ ہوں۔ مگر اس میں مشکل یہ تھی کہ دریا کے پاس جائیے گا تو صرف پانی ملے گا، سورج کے پاس جائیے گا صرف روشنی ملے گی، چاند کے پاس جائیے گا تو صرف چاندنی ملے گی، خزانہ کے پاس جائے گا صرف زر و جواہرات ملیں گے، لیکن شہر وہ ہوتا ہے کہ جہاں ضرورت کی ہر شے مل جایا کرتی ہے (صلوٰۃ) تو گویا رسولؐ چاہتے تھے کہ دنیا کو بتا دیں کہ یہاں ایک علم ملنے والا نہیں ہے بلکہ جس آدمی کو جس علم کی ضرورت ہو وہ علیؑ کے دروازے پر آجائے۔ (صلواۃ) اس لیے فرمایا انا مدینۃ العلم وعلی بابہا میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں فَمَن اَرَادَ العِلمَ

فَلْیَأُتِی اُلْبَاب جس کو بھی علم کی ضرورت اور تمنا ہے وہ دروازے پر آئے وہاں اس کو مل جائے گا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تو ٹھیک ہے کہ میں نے آپ کے سامنے عرض کیا اور آپ نے سماعت فرمالیا کہ علم کا شہر ہوں اور شہر کی عظمت کیا تھی، وہ بھی میں نے آپ کے سامنے پیش کر دی۔ بس میں آپ کے سامنے دو، چار نمونے پیش کر دوں۔ میں نے عرض کیا نا کہ مجھے تھوڑا سا TOUCH ربط ہے ASTRONOMY سے، تو اس کی کچھ کتابیں میں نے پڑھی ہیں تو دیکھیے مجھے کچھ چیزیں ملیں کہ نہیں؟ دیکھیے پہلے ایک بات عرض کر دوں آپ کے سامنے RUSSEL (رسل) کہتا ہے کہ اگر میرا بس چلے تو یہ جتنے کالج ہیں، جتنی یونیورسٹیاں ہیں اور ان میں جتنی ETHICS اور اخلاق کی کتابیں ہیں، ان سب کو نکال دوں اور اس کی جگہ ASTRONOMY کو لے آؤں۔ کہتا ہے ETHICS اور اخلاقیات کی جتنی کتابیں ہیں سب کو نکال دوں، کیا اچھی بات لکھی ہے اس نے۔ کہتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان قتل و غارت گری پر اس وقت کمر باندھتا ہے جب کہ اس کو اپنے کچھ ہونے کا احساس ہوتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں اور کچھ ہوں تو کچھ کرنا چاہتا ہے، اس لیے جرائم پیدا ہوتے ہیں۔ کہتا ہے کہ ASTRONOMY دنیا میں اس لیے لانا چاہتا ہوں کہ ASTRONOMY کو پڑھنے کے بعد انسان کو یہ احساس ہو جائے گا کہ وہ ہے کیا! اس دنیا میں زیرو کی بھی تو اس کی حیثیت نہیں ہے اس کائنات میں، تو یہ جو دماغ میں خنّاس ہے کچھ

ہونے کا وہ نکل جائے گا اور جب اس کو یہ احساس ہو جائے گا تو وہ راہ راست پر بڑھنے کی کوشش کرے گا کہ اگر میں کچھ نہیں ہوں تو کچھ ہو جاؤں۔

مگر میں رسل سے کہنا چاہتا ہوں کہ تجھ میں اور اسلام میں اتنا فرق ہے کہ تو ASTRONOMY کے ذریعہ کائنات کی عظمت کو، اس کی بزرگی کو انسان کے سامنے پیش کر دے کہ اس کو اپنی خوردی کا احساس ہو جائے اسلام کہتا ہے کہ یہاں پر کیوں رکتا ہے؟ اس کائنات کے پیدا کرنے والے کو انسان کے سامنے پیش کر دے۔ جب پیدا شدہ کائنات کی عظمت سے انسان متاثر ہو جائے گا تو پیدا کرنے والے کی عظمت سے کتنا متاثر ہوگا

میں علی بن ابی طالب علیہ السلام کے علم کے بارے میں چند باتیں آپ کے سامنے عرض کرنا چاہتا ہوں تو پہلے عرض کردوں کہ میری بات نہیں، ایک کرسچین مورخ ہے جارج جرداق کہ جس نے علی ابن ابی طالب کی جو سوانح عمری لکھی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ویسی BIOGRAPHY علیؑ ابن ابی طالب کی نہیں لکھی گئی۔ اصل کتاب عربی زبان میں ہے صوت العدالۃ الانسانیہ اور اس کا FRENCH میں بھی ترجمہ موجود ہے۔ ممکن ہے انگریزی میں بھی ترجمہ ہوا ہو لیکن یہ میری نظر سے نہیں گذرا۔

اچھا اب اتنا اور سن لیجیے کہ اس کتاب کا جب ایڈیشن آیا تو ایک اور عرب نژاد ادیب اور صاحب قلم میخائیل نعیمہ نے دوسرے ایڈیشن میں بہترین اور دلچسپ داستان لکھی ہے کہ جارج جرداق نے کتاب

تو لکھ دی لیکن کتاب چھاپنے کے لیے پیسہ نہیں تھا تو وہ جو پبلشر تھے چھاپنے والے، ان کے پاس گیا کہ اس کتاب کو چھاپ دو۔ الحمد للہ! وہ مسلمان ادارے کتاب چھاپنے پر تیار نہیں تھے۔ خدا جو کرتا ہے اچھا کرتا ہے۔ کوئی تیار نہیں ہوا۔ اب اس بے چارے نے خون جگر سے برسوں محنت کی، محنت کر کے اتنی اچھی کتاب لکھی تھی، وہ سمجھتا تھا کہ مسلمان اس کو آنکھوں میں جگہ دیں گے۔ مگر ہر جگہ سے کورا جواب! اب کیا کرے؟ چرچ گیا، چرچ میں مضمحل بیٹھا ہوا تھا تو وہاں کے پادری نے پوچھا، کیا بات ہے؟ تم بہت غمگین بیٹھے ہوئے ہو؟ اس نے کہا کہ میں عیسائی ہوں مگر میں نے علیؑ ابن ابی طالب سے متاثر ہو کر ایک کتاب لکھی ہے مگر حیرت ہے کہ کوئی مسلمان چھاپنے کو تیار نہیں ہے۔ اس پادری نے کہا تم کیوں جاتے ہو مسلمانوں کے پاس، ہم سے فنڈ لو اور کتاب کو چھاپو اور جب کتاب بک جائے گی تو ہمارا پیسہ ہم کو واپس کر دینا۔ جو منافع ہو وہ تمہارا۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کو یہاں سے مدد مل جائے گی۔

اس چرچ کا احسان ہے ہمارے اوپر، ہم کسی کے احسان کو فراموش نہیں کرتے۔ چرچ نے اس کو فنڈ فراہم کیا اور کتاب چھپی اور جب کتاب چھپ کر بازار میں آئی تو اس کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ کچھ ہی روز میں اس کا سارا پیسہ واپس مل گیا۔ پھر جرداق گیا، کہا کہ کتاب چھپ بھی گئی، فروخت بھی ہو گئی، قرض واپس کرنے آیا ہوں۔ مگر اس راز سے پردہ اٹھا دیجیے، جس کتاب کو کوئی مسلمان چھاپنے کے

ہے، اس نے کہنا شروع کیا یہ بات وہ بات۔ آپ یاد رکھیں کہ جو آدمی ریسرچ کر کے کسی نتیجہ تک پہنچتا ہے چاہے وہ باطل ہی کیوں نہ ہو، شجاعت پیدا ہو جاتی ہے تو اس نے کہنا شروع کیا یہ ہے وہ ہے۔ درباری مُلّاؤں نے کہا یہ سب تو کفر ہے، قتل کے مشورے ہونے لگے، بھاگ وہاں سے سر پہ پاؤں رکھ کر اور وہاں آیا جہاں دولت نہ تھی علم تھا۔ اور جب امامؑ کے دربار میں آیا اور سب کچھ کہہ چکا، تب فرمایا کہ بیٹھ جا یہ عباسی دربار نہیں ہے جہاں شبہ کرنے والوں کی، سوال کرنے والوں کی گردن کو کاٹ دیا جاتا ہے۔ ہم لوہے کی تلوار سے گردن نہیں کاٹتے ہیں بلکہ علم کی تلوار سے شبہ کی گردن کاٹ دیتے ہیں۔

برادرانِ عزیز! یہ جو چھوٹی سی MINORITY ہے، جو اقلیت در اقلیت ہے، تاریخ شاہد ہے کہ اس اقلیت کو اموی اور عباسی طوفانوں سے اگر بچایا ہے کسی شئے نے تو وہ اس کی شرافت اس کی تہذیب اس کی ذہانت اور سب سے بڑھ کر آزادیٔ فکر نے۔ یہ فکری آزادی جو آپ کے مسلک میں آگئی ہے بطفیل محمدؐ و آلِ محمدؐ، اسی شئے نے آپ کو بچایا ہے۔ اسی فکری آزادی سے پیدا ہونے والی آپ کی ذہانت نے بچایا ہے۔ اس لیے میں عرض کر رہا ہوں کہ آپ سب کچھ اپنے ہاتھ سے جانے دیں، یہ آزادیٔ فکر کی دولت جو اسلام نے آپ کو دی ہے اسے ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ قوموں کو عزت تعداد سے نہیں شخصیتوں سے ملتی ہے اور شخصیتوں کی تعمیر علم اور ذہانت سے ہوتی ہے اور علم و ذہانت جس زمین سے پیدا ہوتے ہیں وہ ہے

لیے تیار نہیں ہوا، اسے چھاپنے کے لیے آپ کیوں تیار ہو گئے؟ تو اس پادری نے کہا کہ بات یہ ہے کہ ہم پر علیؑ کا احسان ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس احسان کو ادا کر دیں۔ تم کو معلوم نہیں لیکن ہماری پرانی کتابوں میں لکھا ہے کہ جس وقت علی بن ابی طالب تخت حکومت پر بیٹھے تو علیؑ کے زیر حکومت جو MINORITY تھیں، اقلیتیں تھیں یہ سب ایک DELEGATION بنا کر علیؑ ابن ابی طالب کے پاس گئے اور جانے کے بعد کہا کہ بتائیے آپ کے نظام حکومت میں ہماری پوزیشن کیا ہوگی؟ علیؑ نے صرف اتنا کہا کہ تمہارے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوگی۔ کہا تو اتنا تھا کہ کوئی ناانصافی نہیں ہوگی مگر ہم کو وہ RIGHT اور حقوق علی ابن ابی طالب نے اپنے دور حکومت میں دے دیے جو ہم کو اپنی حکومتوں میں بھی حاصل نہیں تھے۔ تو ہم احسان کا بدلہ دینا چاہتے ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ کہ کہیں صحیح حکومت اسلامی ہو تو وہاں مذہبی اقلیتوں کے حقوق اتنا محفوظ ہوتے ہیں کہ سیکڑوں برس بھی انھیں بھلا نہیں پاتے۔

جارج جرداق صوت العدالۃ الانسانیۃ میں لکھتا ہے، بڑے پتہ کی بات لکھتا ہے کہ علیؑ ابن طالب ہر لحاظ سے خوش نصیب تھے۔ دنیا کا کوئی شرف ایسا نہ تھا جو علیؑ ابن ابی طالب کو نہ ملا ہو، دنیا کی کوئی فضیلت ایسی نہ تھی جو علیؑ ابن ابی طالب کو نہ ملی ہو۔ اسلام کے سب سے بڑے عالم، اسلام کے سب سے بڑے مجاہد، اسلام کے سب سے بڑے عبادت گذار، یہ ایک لمبی لسٹ چلتی ہے، اس کے بعد وہ کہتا

ہے مگر علیؑ اس لحاظ سے بہت بڑے بدنصیب تھے کہ زمانہ ان کو بڑا غلط ملا تھا۔ علیؑ اس زمانے کے لیے نہیں تھے، علیؑ آج کے زمانے کے لیے تھے۔ اگر اس دور میں، آج کے زمانے میں علیؑ ابن ابی طالب ہوتے تو دنیا قدر کرتی کہ علیؑ کیا تھے مگر "بدنصیبی علیؑ کی" (یہ اس کے جملے ہیں) ایک ایسے زمانے میں تھے جو جاہلیت اور جہالت کا دور تھا۔ یعنی علیؑ کے سینہ میں علوم کے سمندر ابلتے تھے مگر ان کو قبول کرنے کو کوئی تیار نہ تھا۔ یہ علیؑ کی بدنصیبی تھی۔

بس ایک واقعہ عرض کر دوں آپ کے سامنے اور اس کے بعد آگے بڑھ جاؤں۔ علیؑ ابن ابی طالب خطبہ دے رہے ہیں مسجدِ کوفہ میں اور دورانِ خطبہ آپ ارشاد فرماتے ہیں کہ مسلمانو! اگر کہو تو میں تم کو ایسا طریقہ بتا دوں کہ جس کے ذریعہ سے شلاّل! شلاّل عربی میں کہتے ہیں جھرنے کو، آبشار کو۔ فرماتے ہیں اگر کہو تو میں ایسا طریقہ بتا دوں کہ ان گرتے ہوئے آبشاروں سے اپنے گھروں میں نور اور روشنی پہنچا دو۔ ملاحظہ کیا آپ نے اور یہ بات کئی سو برس بعد مصر کے ایک سائنسداں ابو الہیثم تک پہنچی اور پھر اس نے کوشش کی تھی اس فارمولے پر عمل کر کے بجلی پیدا کرنے کی۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جو میں آپ کے سامنے عرض کر رہا ہوں مگر میں آپ کو علیؑ کا زمانہ دکھا رہا ہوں، جب علیؑ نے کہا کہو تو میں تم کو ایسا طریقہ بتا دوں کہ تم آبشاروں سے اپنے گھروں میں روشنی پہنچا دو،

تو ایک شخص اٹھا، نام بھی آپ کو بتادوں اشعث بن قیس کندی۔ اس نے کہا، یا علیؑ! آپ کو اپنے علم پر بڑا ناز ہو گیا ہے تو ہم طریقہ آپ سے سیکھنا نہیں چاہتے کہ جس سے اپنے گھروں کو روشن کرلیں، ہاں اگر آپ کو اپنے علم پر بڑا ناز ہے تو یہ بتا دیجیے کہ میرے سر پر کتنے بال ہیں؟

ملاحظہ فرمایا آپ نے ان کی قابلیت۔ علیؑ کا جگر خون ہو گیا ہو گا یہ سن کے۔ تو اب علیؑ جواب دیتے ہیں کہ میں تو یہ بتا دوں گا کہ تیرے سر میں کتنے بال ہیں؟ لیکن اگر میں بتا دوں تو کیا تو اپنے بال گن بھی سکے گا کہ میں نے صحیح کہا یا غلط۔ فرمایا کہ میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ تیرے سر میں کتنے بال ہیں اور بتا بھی سکتا ہوں۔ مگر میں اس سے آگے کی بات کہنا چاہتا ہوں۔ یاد رکھ! تیرے ہر بال کے ساتھ ایک شیطان ہے جو تجھے ورغلاتا رہتا ہے۔ پھر ارشاد فرمایا کہ اشعث یاد رکھ، میں تیرا مستقبل دیکھ رہا ہوں، تیری اولاد میری اولاد کی قاتل ہو گی۔ آپ کو معلوم ہے جس حسینؑ کے سفیر کا حال میں نے پرسوں رات کی مجلس میں عرض کیا تھا، اس کا قاتل کون تھا؟ محمد ابن اشعث اسی اشعث کا بیٹا اور دوسرا بیٹا تھا اسحاق ابن اشعث جو اپنے بھائی محمد کے ساتھ لڑنے کے لیے آیا تھا اور اس ملعون کی ملعونہ بیٹی جعدہ بنت اشعث تھی جس نے امام حسنؑ کو زہر دیا۔

علیؑ ابن ابی طالب نے یہ بات کہی چودہ سو برس پہلے۔ آج بیسویں صدی ہے، آپ روشنی کی دنیا میں ہیں، لیکن ابھی آٹھ سال پہلے ہندوستان میں ہو رہا تھا الیکشن۔ جنتا اور کانگریس کا بہت زور تھا تو جنتا پارٹی یہ

چاہتی تھی کہ کانگریس سے سیٹیں لے لی جائیں۔ آندھرا پردیش میں بھی بہت زور تھا۔ اتفاق کی بات یہ کہ کانگریس کی منسٹری کے دوران وہاں پر ایک بہت بڑا DAM بنایا گیا تھا ایک دریا پر جس کے ذریعہ بجلی پیدا کی جارہی تھی۔ بہت سے گاؤں میں بجلی پہنچا دی گئی تھی۔ دیکھیے آج کے زمانہ میں بھی کتنی تاریکی ہے صاحب، ہندوستان کے اُس حصہ میں اتنی تاریکی تھی جہالت اور جاہلیت کی کہ جنتا پارٹی والوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ بھائیو! تم کانگریس کو ووٹ دے کر کیا کروگے، انھوں نے تو ہمارا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ یہ گیہوں ہم کو دیتے ہیں مگر اس میں سے ست نکال لیتے ہیں، چاول ہمیں دیتے ہیں جان نکال لیتے ہیں، یہاں تک کہ حد ہو گئی پانی تک کو نہ چھوڑا، اس میں سے بھی بجلی نکال لیتے ہیں صاحب! یہ مشہور واقعہ ہے کہ کانگریس والے سر پیٹتے رہ گئے اور الیکشن ہار گئے۔

اب ملاحظہ فرمائیے کہ جب آپ کے زمانہ میں جہالت کا یہ عالم ہے تو اس وقت کا کیا عالم ہوگا؟ تو اس کا مطلب یہ کہ پیغمبرؐ نے جو ارشاد فرمایا تھا کہ میں علم کا شہر ہوں علیؑ اس کا دروازہ ہیں، یہ کوئی شاعری نہیں تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ دنیا کے جتنے علوم ہیں، ہر انسان جو علم حاصل کرنا چاہتا ہے وہ علیؑ سے حاصل کر سکتا ہے۔

بس برادرانِ عزیز! علیؑ کا اندازہ کرنا ہے تو اس سے بھی کر سکتے ہیں کہ جنگ صفین ہو رہی ہے امیرِ شام سے۔ ہونے والی یہ جنگ اسی ایریا میں ہوئی تھی۔ واقعۂ کربلا جہاں ہوا میدان صفین کی طرف جانے

کے لیے کربلا کے میدان سے گزرنا ہوتا ہے تو جب علیؑ ابن ابی طالب علیہ السلام اس میدان سے گزرنے لگے تو تین مرتبہ آپ نے کہا اے ابو عبداللہؑ! صبر کرو، اے ابو عبداللہ صبر کرو، گویا کسی سے یہ کہہ رہے ہیں کہ صبر کرو۔ یہ ابو عبداللہ کنیت امام حسین علیہ السلام کی ہے۔ امام حسینؑ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ بیٹا صبر کرو تو پھر لوگوں نے پوچھا تو کہا میرا حسینؑ اسی سرزمین کے اوپر، یہی فرات کا کنارہ ہو گا، جب میرا بچہ حسینؑ کربلا کے جنگل میں بھوکا اور پیاسا شہید کیا جائے گا۔

بس عزاداران حسین! اس لشکر میں حضرت عباسؑ ابن علیؑ بھی تھے اور خود حضرت امام حسینؑ بھی تھے، مگر عباسؑ کی عمر بارہ ۱۲ برس کی تھی۔ امام حسینؑ نے کسی سے کہا کہ پانی لے آؤ۔ ایک شخص اٹھا مگر یہ شہزادہ عباسؑ ابن علیؑ کھڑا ہوا اور اس کو بٹھا دیا اور کہا، میں پانی لاؤں گا۔ پانی لینے گئے، دیکھیے عباسؑ کی محبت، وفا اور عقیدت حسین سے۔ بچہ گیا پانی لانے کے لیے تو پانی یوں لایا کہ پانی کا برتن سر پر رکھ کر چلا اور احترام کا یہ عالم چال میں لڑکھڑاہٹ ہوئی اور سر پر رکھا ہوا پانی نیچے گرنے لگا اور عباسؑ کے کپڑے پانی سے تر ہو گئے۔ علیؑ دیکھ رہے تھے، آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ لوگوں نے کہا یا علیؑ! یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے، بچہ اپنے بھائی سے کتنی محبت کرتا ہے، کس طرح عزت و احترام کے ساتھ اپنے بھائی کے لیے پانی لیے جا رہا ہے تو علیؑ نے فرمایا، جو میں دیکھ رہا ہوں تم نہیں دیکھ رہے ہو۔ تمہاری نظر کے سامنے عباسؑ کے سر کے اوپر

پانی رکھا ہوا ہے وہ عباسؑ کے جسم کو تر کر رہا ہے اور میں وہ منظر دیکھ رہا ہوں کہ ایک روز اسی عباسؑ کے سر پر گرز پڑے گا اور خون کی دھاریں عباسؑ کے جسم کو تر کر دیں گی۔

بس برادران عزیز! آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ علیؑ ابن ابی طالب سب جانتے تھے اور رسولؐ بھی سب جانتے تھے۔ اور صرف یہی نہیں حسینؑ ابن علیؑ بھی خوب جانتے تھے، وہ کہاں جا رہے ہیں اور کیوں جا رہے ہیں۔ آ گئے حسینؑ کربلا کے میدان میں اور زینبؑ نے سرزمین کربلا پر قدم رکھا۔ روایت بتاتی ہے جیسے ہی شاہزادی نے زمینِ کربلا پر قدم رکھا کہ گرد اڑی اور شاہزادی زینبؑ کے سر پر چھا گئی۔ شاہزادی نے فضہ سے کہا کہ جاؤ جا کر جلدی سے بھیا کو بلا لاؤ۔ حسینؑ آئے، کہا بھیا اس زمین پر نہ ٹھیریے۔ کہا کیوں؟ کہا کہ مجھے اچھا نہیں لگتا ہے کہ گرد اڑی اور میرے سر کے اوپر چھا گئی۔ میرے ساتھ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، میرے ساتھ رسولؐ کی امانتیں ہیں، پتہ نہیں اس زمین پر کون سی آفت آنے والی ہے۔ حسینؑ نے کہا، زینبؑ یہاں سے کیسے جا سکتا ہوں، تمھیں نہیں معلوم کہ یہ زمین جب سے پیدا ہوئی ہے میرے لیے ہے اور میں اس زمین کے لیے پیدا ہوا ہوں۔ میں کہتا ہوں شہزادی زینبؑ گھبرائیے نہیں، شاید زمین کربلا یہ اشارہ کر رہی کہ اگر بھائی کی شہادت کے بعد آپ کے سر سے چادر چھن جائے گی تو خاک بلند ہو کر آپ کے سر پر سایہ کرے گی۔

بہر حال خیمے لگا دیے گئے، سارے واقعات آپ کے پیش نظر

ہیں۔ اس کے بعد لشکرِ پسر سعد کی آمد شروع ہو گئی، ہزار آدمی آ گئے کبھی دو ہزار آدمی آ گئے یہاں تک کہ کربلا کا میدان لشکرِ یزید کے سپاہیوں کی کثرت سے چھلکنے لگا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں محرم کی نویں تاریخ وہ تاریخ تھی کہ جب حسینؑ اور ان کے اصحاب چاروں طرف سے دشمنوں میں گھر گئے۔ صاحبانِ فکر ہیں میرے سامنے، عرض کرنا چاہتا ہوں امامؑ کا ارشاد ہے کہ چاروں طرف سے گھر گئے تھے، راستے بند ہو گئے تھے۔ اچھا جب راستے بند ہو گئے تھے تو پھر شب عاشورہ امامؑ نے اپنے ساتھیوں سے یہ بات کیوں کہی کہ تم سے کوئی بات چھپانا نہیں چاہتا۔ کل میری شہادت کا دن ہے، اپنی جان بچالو، مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ، کیوں اپنی جان دینے پر تلے ہوئے ہو۔

ملاحظہ کیا آپ نے، اگر راستے بند تھے تو پھر امامؑ کیسے کہہ رہے تھے چلے جاؤ۔ اگر کہہ رہے تھے تو اصحاب کو کہنا چاہیے تھا کہ راستے بند ہیں فرزندِ رسولؐ! ہم کیسے جائیں؟ تو اصحاب کا یہ نہ کہنا کہ کیسے جائیں، امامؑ کا یہ کہنا کہ میرا ساتھ چھوڑ کر چلے جاؤ، ایک دردناک حقیقت سے پردہ اٹھانا تھا اور وہ دردناک حقیقت یہ ہے کہ راستے بند بھی تھے اور راستے کھلے بھی تھے۔ اگر حسینؑ کا ساتھ چھوڑ کر کوئی جانا چاہتا تھا تو اس کے لیے راستے کھلے تھے اور کوئی ساتھ دینے والا آنا چاہتا تو اس کے لیے راستہ بند تھا۔ بہرحال صبح عاشور نمودار ہو گئی اور حسینؑ تیار ہو گئے قربانیاں پیش کرنے کے لیے اور پھر حسینؑ نے لاشے اٹھانا شروع کر دیے۔

عزادارانِ حسینؑ! کوئی انسان ایسا نہ ہوگا کہ جس نے کوئی لاشہ نہ دیکھا ہو۔ سیکڑوں میتیں آپ نے اٹھتے دیکھی ہوں گی، مگر جنازہ کیسے اٹھتا ہے، لاش ایک ہوتی ہے اور کاندھا دینے والے کتنے ہوتے ہیں؟ سَو دو سَو یا اس سے بھی زائد۔ دنیا کا دستور یہی ہے مگر کربلا میں یہ دستور بدل گیا تھا، جہاں اٹھانے والا ایک تھا اور لاشیں اکہتر تھیں۔ کبھی حُرؓ کی لاش اٹھا رہا ہے کبھی حبیبؓ کے سرہانے کھڑا ہوا تھا کبھی زہیرؓ کا لاشہ اٹھا رہا ہے۔ عزادارو! ذرا غور کرو، ساری مصیبتیں نظر انداز کر دو، فقط ایک مصیبت میرے مولا کی کہ لاشوں پر لاشیں، ایک لاش لاکر رکھی دوسری لاش لینے جا رہا ہے، دوسری لاش لا کے رکھی تیسری لاش لینے جا رہے ہیں۔

بس عزادارانِ حسینؑ! آج محرم کی تیسری تاریخ ہے، اسی کی مناسبت سے ایک صحابی کا حال آپ کے سامنے عرض کر دوں۔ روایت ہے آپ کو اندازہ ہوگا کہ حسینؑ کے ساتھی بوڑھے تھے تو کیسے تھے اور بچے تھے تو کیسے تھے؟ کربلا میں گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی۔ حسینؑ کا ایک بوڑھا سپاہی مسلم بن عوسجہ اسدی، ان کی عمر اتنی زیادہ ہو چکی تھی کہ لوگ کہتے تھے کہ یہ جنگ کیسے کریں گے؟ ہاتھ کانپ رہے ہیں، پاؤں لڑکھڑا رہے ہیں، پپوٹے لٹک کر آنکھوں کے اوپر آ گئے ہیں یہاں تک کہ روایت بتاتی ہے ان سے گھوڑے پر بیٹھا نہیں جا رہا تھا تو لوگوں نے مدد کر کے گھوڑے پر بٹھایا اور جب گھوڑے پر بیٹھ گئے تو پپوٹوں کو رومال سے

اپنی پیشانی پر کس لیا کہ آنکھیں کھل جائیں اور کچھ دکھائی دے سکے مگر اس کے بعد جب قبضۂ شمشیر پر ہاتھ ڈالا تو یہ معلوم ہوا کہ ضعیفی رخصت ہو گئی اور جوانی آ گئی۔ بڑی شجاعت سے لڑے اور کتنوں کو قتل کیا جب زخموں سے چور ہو کر گھوڑے سے زمین پر تشریف لائے تو حسینؑ تنہا نہیں ہیں، حسینؑ کے ساتھ ان کے بچپن کے ساتھی حبیب ابن مظاہر بھی ہیں۔ حبیب مسلم سے کہتے ہیں کہ مسلم! اگر مجھ کو معلوم ہوتا کہ کچھ دن تمھارے بعد اس دنیا میں رہنا ہے تو تم سے کہتا کچھ وصیت کرتے جاؤ اور میں اس وصیت پر عمل کروں۔ لیکن مسلم، وصیت کی فرمائش کیا کروں۔ جس راہ پر تم جا رہے ہو، اسی راہ پر میں آ رہا ہوں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ آواز مسلم کے کان میں اس وقت پہنچی کہ جب سانس اکھڑ چکی تھی، آواز بند ہو رہی تھی، زبان سے کہہ نہ سکتے تھے۔ مگر جیسے ہی یہ آواز حبیبؓ کی مسلمؑ کے کانوں تک پہنچی ویسے ہی تھرتھرائی ہوئی انگلی اٹھا کے حسینؑ کی طرف اشارہ کیا۔ گویا کہنا چاہتے تھے کہ حبیب! اس عالم میں مسلم کی ایک وصیت ہے کہ مرتے مر جانا مگر فاطمہؑ کے لال کا دامن تمھارے ہاتھوں سے نہ چھوٹنے پائے۔ اس بیکس کا بچانے والا اس دنیا میں تمھارے سوا کوئی نہیں ہے۔ بوڑھے سپاہی کی لاش اٹھائی، لا کر گنج شہیداں میں رکھ دی۔

حسینؑ مسلم کی لاش سے اٹھنے نہ پائے تھے کہ ایک مرتبہ خیمہ کا پردہ اٹھا۔ ایک بارہ برس کا بچہ دوڑتا ہوا میدانِ کربلا کی طرف چلا

حالت یہ کہ اس کی تلوار زمین پر لائین بناتی جا رہی تھی۔ حسینؑ نے کہا دیکھو کس کا بچہ ہے؟ کہاں جا رہا ہے؟ اصحاب حسینی بڑھے اور جا کر بچہ کو روکا اور حسینؑ کے پاس لائے۔ بارہ برس کا بچہ حسینؑ کے پاس آیا۔ کہا بیٹا کہاں جا رہے ہو؟ کہا میدان کربلا کی طرف۔ کہا میدانِ کربلا کیوں جا رہے ہو؟ کہا جان دینے۔ کہا جان دینے کیوں جا رہے ہو؟ کہا مسلم کی لاش دیکھ کے، آپ یہ نہ سوچیں کہ آپ کا کوئی بچانے والا نہیں ہے۔ خیمہ میں جب تک ہم چھوٹے بچے موجود ہیں ہم اپنی جان پر کھیل جائیں گے، آپ پر آنچ نہ آنے دیں گے۔ آگے بڑھے اور بچہ کو سینہ سے لگایا، میرے بیٹے، میرے لال، میرے لختِ دل! تجھے مرنے کے لیے نہیں بھیج سکتا۔ کہا کیوں مولا؟ کہا مجھ سے کوئی خطا ہو گئی، کوئی قصور ہو گیا؟ کوئی خطا، کوئی قصور نہیں بلکہ ابھی تو نابالغ ہے، اسلام کے اعتبار سے ابھی جنگ کے قابل نہیں ہوا ہے۔

دیکھیے بچہ نے کیا جواب دیا ہے۔ کہا ہاں، میں بھی جانتا ہوں کہ میں نابالغ ہوں مگر کل شب عاشورہ جب آپ نے خطبہ دیا تھا اور میرے ہم عمر اور ہم سن قاسمؑ نے کہا کہ چچا! کیا میرا نام ہے شہیدوں میں تو آپ نے قاسم کو شہادت کا مژدہ کیوں دیا تھا؟ تو مولا، اگر قاسم شہید ہو سکتے ہیں تو مجھے قاسم کا غلام سمجھ کر اپنے اوپر فدا ہو جانے دیں۔ امامؑ نے فرمایا نہیں بیٹا! تیرا مسئلہ قاسم سے مختلف ہے اس لیے کہ قاسمؑ کو میں بحیثیت ولی اجازت دوں گا، تیرے لیے ضروری تھا کہ تیرا باپ اجازت

آزادیٔ فکر۔ جب آپ کی فکر آزاد تھی تو آپ کس قدر ذہین سمجھے جاتے تھے۔ میں ہندوستان کی مثال آپ کے سامنے دینا چاہتا ہوں۔ ہندوستان سے میرا مطلب پرانا ہندوستان، جس میں پاکستان بھی ہندوستان تھا، تقسیم نہیں ہوئی تھی۔ میں مغل دور کی بات آپ سے کر رہا ہوں تو مغل دور میں اکبر کے زمانے میں آپ کتنے تھے ہندوستان میں، ہزاروں میں ہوں گے، لاکھوں میں نہیں۔ لیکن اکبر نے پورے ہندوستان سے ذہانت کے اعتبار سے علم کے اعتبار سے فن کے اعتبار سے صرف نو آدمی چنے تو وہ نو رتن کہلائے تھے۔ وہ نو تھے یہ تو آپ کو معلوم ہو گا لیکن شاید یہ آپ کو نہ معلوم ہو گا کہ جن کو پورے ہندوستان سے چنا گیا تھا ان نو رتنوں میں پانچ رتن شیعہ تھے۔ پانچ رتن شیعہ تھے پانچ، اس کا مطلب یہ ہے چھوٹی سی قوم کی نمائندگی تھی پانچ میں اور پورے ملک کا REPRESENTATION کر رہے تھے چار۔ یہ آپ کی عزت تھی یہ کہاں سے آئی تھی۔ یہ آزادیٔ فکر اور ذہانت سے آئی تھی۔

اس لیے جب کبھی آپ کے ذہن میں سوال پیدا ہو، شک پیدا ہو تو خدا کا شکر کیجیے کہ دماغ کام کر رہا ہے۔ اسے وسوسہ شیطانی نہ سمجھیے، فضلِ ربانی سمجھیے۔ اسے دبائیے نہیں اس کی پرورش کیجیے اور جب تیار ہو جائے تو کسی صاحب نظر عالم کے سامنے پیش کر دیجیے۔ شک کو دبائیے گا تو نفاق بن جائے گا۔ کسی عالم اہل بیتؑ کے سامنے پیش کیجیے گا تو وہ اس شک کی بیہڑ زمین میں ہل چلا کر ایمان کا درخت بار آور کر دے گا۔

دے یا کم سے کم تیری ماں تجھے اجازت دے دے۔ بچہ نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ مولا! یہ مسئلہ آپ نے حل کر دیا۔ جہاں تک باپ کا سوال ہے تو باپ کی لاش تو آپ کے قدموں میں پڑی ہوئی ہے اور جہاں تک ماں کا سوال تو فرزند رسولؐ! میرے جسم پر لباس میری ماں ہی نے پہنایا ہے۔ میری کمر میں یہ تلوار میری ماں نے باندھی ہے اور ماں ہی نے یہ کہا ہے کہ جا کر اپنی جان آپ پر نثار کر دوں۔ بچہ ابھی یہ کہہ ہی رہا تھا کہ خیمہ کے در سے ایک بیوہ کی آواز آئی، فاطمہؑ کے لال! ایک بیوہ کا ہدیہ قبول کر لیجیے اور اپنے اوپر میرے بچہ کو نثار ہو جانے دیجیے۔

پانچویں مجلس

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝
وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ
مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝ (سورہ آل عمران آیت ۸۵)

برادرانِ ایمانی! آج محرم کی پانچویں شب ہے اور میں نے آپ کے سامنے اسی آیت کو پیش کیا ہے جسے برابر آپ سماعت فرما رہے ہیں جس میں ہمارا پیدا کرنے والا بالکل صاف صاف الفاظ میں ارشاد فرما رہا ہے کہ کسی انسان نے اگر اسلام کو چھوڑ کر کسی دوسرے مذہب یا کسی دوسرے طریقۂ زندگی کو اختیار کیا تو وہ مذہب اور وہ طریقۂ زندگی ہم اس سے قبول نہیں کریں گے۔ ایسا انسان جب آخرت کی دائمی و ابدی اور حقیقی زندگی میں داخل ہوگا تو اسے خود اس بات کا پتہ چل جائے گا کہ اس نے اسلام کو چھوڑ کر خود اپنا نقصان کیا ہے۔

تمہید میں آپ کی خدمت میں قرآن مجید کی الہامی شان کے بارے میں کچھ باتیں عرض کر رہا ہوں مگر وارثِ قرآن کا دامن تھام کر۔ کل میں

یہ عرض کر رہا تھا آپ کے سامنے کہ علیؑ بن ابی طالب نے حضرت ابن عباس سے ارشاد فرمایا کہ جو کچھ قرآن میں کہا گیا ہے وہ سورہ حمد میں ہے اور جو کچھ سورہ حمد کی ان سات آیتوں میں کہا گیا ہے وہ سمٹ کر آگیا ہے ایک آیہ بسم اللہ میں اور جو کچھ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں ہے وہ سمٹ کر آگیا ہے "ب" میں اور جو کچھ "ب" میں ہے وہ سمٹ کر آگیا ہے اس نقطہ میں جو "ب" کے نیچے دیا جاتا ہے۔

پھر وہی بات میں آپ کے سامنے عرض کروں گا جو کل کہی تھی کہ جس طرح علی ابن ابی طالبؑ نے صرف یہ نہیں فرمایا کہ سَلُوْنِی سَلُوْنِی قَبلَ اَنْ تفقدونی بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ مجھ سے صرف زمین کے مسائل نہ پوچھو، مجھ سے کائنات اور آفاق کے مسائل پوچھو کیونکہ میں آسمان کی راہوں کو زمین کے راستوں سے بہتر جانتا ہوں۔ لیکن عام طور پر وہی آدھا ٹکڑا پیش کیا جا رہا تھا سلونی سلونی قبل ان تفقدونی اسی طرح سے برادران عزیز، علیؑ ابن ابی طالب نے یہاں پر بھی بات کو ختم نہیں کیا ہے کہ پورا قرآن سمٹ کر آگیا ہے اس نقطہ میں جو "ب" کے نیچے دیا جاتا ہے وَاَنَا النُّقْطَةُ تَحْتَ الْبَآءِ۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہو گئی ہے بلکہ بات آگے بڑھی ہے اور وہ بات میں آپ کے سامنے ابھی پیش کروں گا۔ مگر وہ بات آپ کے سمجھ میں اس وقت تک نہیں آسکتی ہے جب تک اس کائنات کی خلقت کے بارے میں MOST MODERN - THEORY - جس THEORY کو BIGBANG THEORY کہا جاتا ہے، پیش

نہ کردوں۔ ظاہر ہے یہ THEORY اس قدر مشہور ہے کہ میں کم از کم امریکی بچوں سے یہ توقع رکھوں گا ہی کہ وہ اس تھیوری سے کسی نہ کسی حد تک واقفیت رکھتے ہوں گے لیکن بہرحال مختصر طور پر میں آپ کے سامنے پیش کیے دے رہا ہوں۔

برادران عزیز! یہ UNIVERSE کائنات جس کی سرحدوں کا ہم آج بھی تصور نہیں کر سکتے اس UNIVERSE کی صورت میں ہر BODY اس کا ہر جسم اس کا ہر حصہ ایک دوسرے سے مستقل طور پر دور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ جب سے ہم OBSERVE کر رہے ہیں، مشاہدہ کر رہے ہیں تب سے ہم یہ دیکھ رہے ہیں۔ تو یہ دور ہونے کی PROCESS دور ہونے کا عمل بتا رہا ہے کہ بہت پہلے یہ ایک مرکز پر جمع رہے ہوں گے۔

مثال دوں آپ کے سامنے تو بات ختم ہو جائے۔ آپ ایک BALOON لے لیں، غبارہ لے لیں، اس پر آپ بالکل قریب قریب ایک دوسرے سے ملے ہوئے کچھ POINTS لگا دیں، پھر اسے پھلا دیں تو جتنا جتنا BALOON غبارہ پھولتا چلا جائے گا اس کے POINTS اس کے نقطے ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے جائیں گے۔ تو اسی طرح سے کائنات کا ہر POINT اور ہر نقطہ ایک دوسرے سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ دور ہونا بتاتا ہے کہ کبھی یہ سب سمٹے ہوئے تھے، کبھی ایک ہی مرکز پر تھے۔ توجہ فرما رہے ہیں آپ اور اسی لیے یہ BIGBANG THEORY ہم کو بتاتی ہے کہ یہ کائنات پہلے سمٹی ہوئی ایک

بہت بڑے ذرے SUPER ATOM کی شکل میں تھی۔

بہر حال یہ بات طے ہے، اس وقت خواہ یہ کائنات کتنی ہی پھیل چکی ہو مگر کھربوں سال پہلے جب بننا شروع ہوئی ہے تو ایک SUPER ATOM یعنی ابتدا میں یہ کائنات صرف ایک نقطہ میں تھی۔ اسی نقطہ میں ایک دھماکہ ہوا، اس وقت سے یہ بے تحاشہ رفتار سے پھیلتی چلی جا رہی ہے۔ اس نظریہ کا نام BIGBANG THEORY ہے۔ یہ BIGBANG THEORY ۱۹۴۸ء میں ہمارے سامنے آئی ہے اور اب سے چودہ سو برس پہلے علیؑ ابن ابی طالب نے ابن عباس سے جو فرمایا تھا، اب میں آپ کے سامنے پوری بات پیش کرتا ہوں کہ علیؑ ابن ابی طالب نے فرمایا کہ جو قرآن میں ہے وہ سمٹ کر سورہ فاتحہ میں ہے، جو سورہ فاتحہ میں ہے وہ سمٹ کر بسم اللہ میں ہے اور جو بسم اللہ میں ہے وہ سمٹ کر بائے بسم اللہ میں ہے اور جو بائے بسم اللہ میں ہے وہ نقطہ میں ہے جو (ب) کے نیچے دیا جاتا ہے۔ تو قرآن کی ابتدا اللہ نے فرمائی ہے ایک نقطہ سے پھر اس کو پھیلا کر قرآن بنا دیا۔ اسی طرح اس کائنات کی ابتدا بھی اللہ نے ایک نقطہ سے کی ہے جسے پھیلا کر یہ عظیم کائنات خلق کر دی۔ آپ نقطہ لیں یا SUPER ATOM مجھے الفاظ کے چکر سے مطلب نہیں، ارشاد فرماتے ہیں وَمِنْ ھٰذِہِ النُّقْطَةِ خُلِقَتِ السَّمٰوٰاتُ وَالْاَرْضُ۔ (صلوٰۃ)

یہ ہے پوری حدیث۔ وہ نظریہ جس تک ہزاروں برس کے بعد دنیائے سائنس ٹھوکریں کھاتی ہوئی پہنچی ہے، اس بات کو علیؑ ابن

ابی طالب آج سے چودہ سو برس پہلے بالکل واضح الفاظ میں دنیا کے سامنے پیش کر چکے تھے۔ یہ دنیا کے سامنے علیؑ ابن ابی طالب کیوں پیش کر رہے تھے تاکہ زبان رسولؐ سے نکلے ہوئے جملوں کی لاج رہ جائے کہ میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں۔ (صلوٰۃ)

توجہ فرمائی آپ نے۔ اب میں آپ کے سامنے پھر وہی بات دوہرانا چاہتا ہوں کہ مجھے تو اتنا سا معلوم ہے ASTRONOMY کے بارے میں تو مجھے ایسی ایسی باتیں مل رہی ہیں اور جو لوگ واقعی اس فیلڈ میں تحقیق SPECIALIZATION کیے ہوئے ہیں، اگر وہ عقیدت و اخلاص سے کلامِ علیؑ کا مطالعہ کریں تو وہ کیا کیا جواہر پارے نہ نکال لیں گے؟ یہ سب اس لیے آپ کے سامنے کہہ رہا ہوں کہ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں ہوا میں ساری باتیں کہہ رہا ہوں۔ ابھی اور بھی انشاءاللہ آپ کے سامنے عرض کروں گا جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ علمِ علی کس منزل پر ہے۔

دیکھیے میں دوسرے مذاہب پر زیادہ گہری نظر نہیں رکھتا لہٰذا میں ان کی طرف سے کوئی ترجمانی نہیں کر سکتا۔ لیکن اسلام کی طرف سے اور اسلام بھی وہ اسلام جو قرآن اور اہل بیتؑ سے ہم کو ملا، اس کی طرف سے کچھ عرض کرنے کا بہر حال مجھے حق حاصل ہے۔ اس لیے میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ یہ غلط فہمیاں دماغ سے نکال دیجیے کہ سائنس حاصل کر کے آپ بہک جائیں گے۔ اگر آپ بہک بھی گئے تو کوئی سمجھانے کے لیے بھی ہوگا۔ دیکھیے عالم اگر خدانخواستہ بہک جائے تو اس کو سنبھال

لینا بہت آسان ہے جہالت کے اندھوں کو سنبھالنا بہت مشکل ہے تو اس لیے جتنا ہو سکے بہکیے کیوں کہ کوئی آپ کو سنبھالنے کے لیے بھی تیار ہے۔ آپ کو مطمئن کیا جائے گا، آپ کو بتایا جائے گا سائنس کوئی ہوّا نہیں ہے جس سے آپ ڈرے جا رہے ہیں۔

دیکھیے میں کسی کی خاطر شکنی نہیں چاہتا ہوں۔ میں تو ایک اصول کی بات آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی وحی جو نازل ہوئی ہے اس میں تعلیم کا طریقہ سکھایا جا رہا ہے عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ؕ اس پہلی وحی میں تلوار کا ذکر نہیں قلم کا ذکر ہے۔ لیکن مسلمان نے قلم کے بجائے تلوار پکڑی تو کیا فتح کر لیا انھوں نے؟ زیادہ سے زیادہ اسپین تک پہنچ گئے اور اگر قلم لے کر چلے ہوتے تو شاید دنیا سے بہت پہلے وہ چاند کو فتح کر لیتے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں نے قرآن تو پڑھا مگر قرآنی SPIRIT کو نہیں سمجھا۔ یہ پہلی وحی ہے جس میں قلم کی تعریف کی جا رہی ہے کہ ہم نے قلم کے ذریعہ سب کچھ سکھایا۔ مطلب یہ کہ اگر علم چاہتے ہو تو قلم اپنے ہاتھ میں رکھو مگر یہی قلم آج دوسروں کے ہاتھ میں چلا گیا۔ جن کے ہاتھ میں قلم چلا گیا انھیں کے ہاتھ میں شمشیر بھی چلی گئی، انھیں کے ہاتھ میں طاقت بھی چلی گئی انھیں کے ہاتھ میں قوت بھی چلی گئی۔

ٹھیک ہے، یہ کارنامہ ہے کہ ایران فتح ہو گیا، شام فتح ہو گیا اور مصر فتح ہو گیا۔ بیشک یہ کارنامہ ہے مگر کبھی اس کو اس طرح سے بھی سوچیے کہ جو قرآن کہتا ہوا آیا تھا کہ ہم نے تمھارے لیے چاند، سورج بنائے ہیں کہ اس پر

قبضہ کرلو۔ ہم نے تمھارے لیے ستارے اور کہکشاں بنائی ہیں کہ اس پر قبضہ کرلو۔ جو مسلمانوں سے کہہ رہا تھا کہ ساری کائنات پر قبضہ کرلیں وہ چند ملکوں پر قبضہ کرسکے۔ یہ نتیجہ ہوا غلط لائن اختیار کرنے کا۔ پڑھوں آپ کے سامنے آیت بہت تفصیلی ہے اس لیے پہلے اس کا ترجمہ ہو جائے۔ ارشاد ہوتا ہے قرآن مجید میں مسلمانوں سے خطاب کر کے وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهَارَ ۝ (سورہ ابراہیم آیت ۳۲) ارشاد الٰہی ہو رہا ہے، ہم نے تمھارے لیے جہازوں اور کشتیوں کو مسخّر کر دیا کہ جو ہمارے حکم سے سمندروں کا سینہ چیرتی، بڑھتی چلی جارہی ہیں۔ مسخّر کر دیا کے کیا معنی ہیں! پہلے یہاں پر یہ طے کرلیں۔ تسخیر کے معنی کیا ہیں؟ یہ کہ آپ کشتیوں اور جہازوں پر سوار ہو گئے اور وہ آپ کو اپنی مرضی سے لے کر چلیں، یہ نہیں ہے۔ تسخیر کے معنی یہ ہیں کہ آپ کشتی پر سوار ہیں اور کشتی آپ کے اشارہ پر چلے گی۔ جدھر آپ چاہیں گے ادھر کشتی جائے گی۔ تسخیر کے معنی یہ ہیں کہ اس کشتی پر پورا آپ کا کنٹرول ہے۔ تو تسخیر کے معنی کیا ہیں؟ قابو پانا، کنٹرول میں آجانا، بات طے ہوگئی۔

اسی تسخیر کا سلسلہ چل رہا ہے۔ ارشاد الٰہی ہوتا ہے کہ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ ۚ سب سے پہلے ہم نے کشتیوں کو تمھارے اختیار میں دے دیا، وہ سمندر کا سینہ چیرتی ہوئی تمھارے اشاروں پر بڑھتی چلی جارہی ہیں۔ یہ ماضی کی داستان ہوگئی اس کے بعد کی بات، ارشاد ہو رہا ہے وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهَارَ ہم نے تمھاری مٹھی میں دے دیا دریاؤں کو

جدھر چاہو ان کے رخ موڑ لو، تمہاری صلاحیت پر ہے، جس طرح سے چاہو ان سے فائدہ اٹھا لو DAM بنا لو، نہریں نکال لو، بجلی بنا لو، تمہاری صلاحیت پر ہے۔ ایک ہی آیت چل رہی ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ﴿ اور سورج و چاند کو تمہارے قابو میں دے دیا تو دن، رات کو بھی تمہارے قابو میں دے دیا ہے، اب تمہاری صلاحیت کے اوپر ہے جب چاہنا دن لے آنا، جب چاہنا رات لے آنا۔ یہ انسان کو اس کی صلاحیتیں بتائی جا رہی ہیں اور اس کے بعد یہ ارشاد ہوتا ہے وَآتَاكُمْ مِنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ ۚ وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا ۗ اے انسان! تو ہم سے کیا مانگنا چاہتا ہے؟ جو صبح محشر تک تو مانگ سکتا تھا ہم سے وہ ہم سب تجھے دے چکے۔ تو بڑے بڑے کمپیوٹر سے بھی ہماری نعمتوں کا شمار نہیں کر سکتا کہ ہم نے تجھے کتنا دے دیا ہے۔

کائنات ہم نے بنائی ہے، قابو اس کائنات پر تیرا ہے۔ ہم نے تجھے اس کائنات کے لیے نہیں بنایا ہے، اس کائنات کو تیرے لیے بنایا ہے۔ ہم نے سورج اور چاند کو تیرا غلام بنایا تھا، اب ہم اسے کیا کریں تو اپنی صلاحیتوں کو نہ سمجھ سکا۔ اور اس سورج کو اور اس چاند کو تو نے خدا بنا لیا۔ یہ تیری بدنصیبی ہے کہ تو نے اپنے غلاموں کو خدا بنا لیا۔ ایک منزل پر ارشاد ہوتا ہے ... وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ ۗ چاند، سورج ہی نہیں بلکہ جتنے ستارے اور سیارے وہ سب ہم نے انسان کی مٹھی میں

دے دیے۔ یہ ہے انسان کی طاقت قرآن کی نظر میں۔

توجہ فرمائی آپ نے! مسلمانوں نے تلوار کے بجائے اگر قلم کو سنبھالا ہوتا تو آج رنگ دوسرا ہوتا۔ تلوار سے قبضہ محدود ہوتا ہے، عارضی ہوتا ہے قلم سے قبضہ دائمی ہوتا ہے، جاودانی ہوتا ہے۔ مگر جناب اسے کیا کرے کوئی کہ قرآن تو کہہ رہا ہے ہم نے تمھارے قبضہ میں دے دیا چاند کو بھی، سورج کو بھی اور یہاں یہی نہیں طے ہو پاتا ہے کہ روزہ کب کھولا جائے یہی بحث ہو رہی ہے کہ جب تک چاند کو نہ دیکھ لیں عید کیسے منائیں؟ ذرا سوچ لیجیے کہ ہم کو قرآن کہاں لے کے جا رہا ہے اور ہم نے اپنے کو کہاں پھنسا کے رکھا ہے۔ آج کے انسان کو چاند کی POSITION ملی میٹر اور سینٹی میٹر کے لحاظ سے معلوم ہے۔

آپ کہیں گے کہ جناب وہ تو حدیث میں آیا ہے کہ افطار کرو چاند کو دیکھ کر اور روزہ رکھو چاند کو دیکھ کر۔ یعنی شعبان کی آخری تاریخ کو اگر چاند دکھائی دے جائے تو روزہ رکھو اور رمضان کی آخری تاریخ کو چاند دکھائی دے جائے تو افطار کرلو۔ بات کو زمانہ سے کاٹ کر سمجھیں گے تو ہمیشہ ٹھوکریں کھائیں گے۔ اصل بات ہے چاند ہونے کا یقین ہو جانا، اس زمانہ میں تم کو یقین دیکھ کر آتا تھا۔ آج ASTRONOMY اس قدر آگے بڑھ گئی ہے کہ بغیر دیکھے یقین ہو جاتا ہے۔ آپ نہیں مانتے بلکہ آپ صرف الفاظ کی پابندی کریں گے۔

اب میں دیکھتا ہوں کہ آپ حج کے لیے کیسے جاتے ہیں؟ یہ تو حدیث

تمہید کی منزل میں اتنا اور عرض کردوں کہ آپ حضرات نے میرا شکریہ ادا کیا، درحقیقت شکریہ کے مستحق تو آپ حضرات ہیں کہ وطن سے دور امریکا کی سرزمین پر آپ سیدہ کے لال کو یاد کر رہے ہیں۔ یہ سرزمین گویا قیامت کا میدان ہے جہاں نفسی نفسی کا عالم ہے بیٹا باپ سے دور باپ بیٹے سے دور۔ ماں کو بیٹی کی خبر نہیں بیٹی کو ماں کا پتہ نہیں۔ بھائی کو بھائی کا دھیان نہیں۔ یہ مادی دنیا ہے یہاں انسانی اقدار ناپید ہیں۔ مگر اس ملک میں اس سوسائٹی میں جہاں کوئی کسی کو یاد نہیں آتا، کوئی کسی کو نہیں پوچھتا، آپ اپنے اعزار کو بھولے ہوئے کربلا کے مسافر کو یاد کر رہے ہیں۔

آپ نے یہاں لاس اینجلیس میں یہ شاندار حسینیہ بنایا ہے حسینؑ کی عزاداری کے لیے۔ اس کو بنائے رکھیے، اس کو بچائے رکھیے، یہ آپ کو بچالے گا، آپ کے بچوں کو بچالے گا، آئندہ نسلوں کو بچالے گا۔ آپ بڑی محنت سے مکان بناتے ہیں، اس کو مضبوط کرتے ہیں اس کی حفاظت کرتے ہیں اور پھر جب بارش ہوتی ہے، طوفان آتا ہے، تو یہی مکان آپ کو بچاتا ہے، آپ کے بچوں کی حفاظت کرتا ہے، آپ کے گھر کی عورتوں کو محفوظ رکھتا ہے۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ عزاداری کا یہی قلعہ جس کو آپ یہاں بنا رہے ہیں، مضبوط کر رہے ہیں۔ یہی قلعہ آپ کے بچوں کو آپ کے بیٹوں کو آپ کی عورتوں کو یہاں کی شیطانی آندھیوں سے بچائے گا، یہاں کے طوفان کا منھ موڑ دے گا۔

اس عزاداری کی قدر کیجیے۔ یہ ایک ایسا INSTITUTION ہے جو کسی

ہے، کمزور بھی ہو سکتی ہے۔ اب قرآن کی آیت پڑھیے، دیکھیے وہاں حج کا حکم ہوتا ہے وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْکَ رِجَالًا وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ ۝ (سورہ حج آیت ۲۷) ابراہیمؑ سے ارشاد ہوتا ہے کہ اے ابراہیمؑ! تم لوگوں کو حج کی دعوت دے دو کہ چلو حج کے لیے تو ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ لوگ آتے رہیں گے حج کے لیے، کیسے آئیں گے؟ پیدل آئیں گے یا پھر دُبلے پتلے اونٹوں پر بیٹھے دور دراز مقامات سے آئیں گے۔ تو قرآن نے بتایا کہ حج کے لیے آئیے تو پیدل یا اونٹوں پر بیٹھ کر آئیے، جیٹ JET پر بیٹھ کر آپ نہیں جا سکتے۔

اب یہ زمانے زمانے کا فرق ہے کہ اس زمانہ کے انسان اونٹ پر بیٹھ کر جاتے تھے حج کرنے اور آج کے سعودی گدھے امریکا کے دورے پر جاتے ہیں تو اونٹ کو ہوائی جہاز پر ساتھ لے کر، یہ ہے معراج اونٹ کی۔ اسلام آپ کو کہاں لے جانا چاہتا ہے۔ اسلام عقل کا مذہب ہے۔ اسلام دانش کا مذہب ہے۔

اچھا تو آپ کے نزدیک میکنیکل پروف جو ہے، کافی نہیں ہے۔ اگر کافی نہیں ہے تو مجھے کسی سے جھگڑا تو کرنا ہی نہیں ہے۔ اچھا یہ بتائیے جو ابھی قبلہ کا تعین کر رہے تھے، یہ کیسے تعین کیا قبلہ کا؟ یہ قبلہ کا تعین جو آپ نے کمپاس کے ذریعہ سے کیا تو کیا کمپاس قبلہ و کعبہ ہے؟ کس نے آپ کو بتایا؟ کیوں آپ نماز پڑھ رہے ہیں۔ یہ مشین بتا رہی ہے۔

اور جناب دنیا میں کون سا کونا ہے، جہاں گھڑی کی سوئیاں دیکھ کر

ترک سحر نہیں ہوتا اور گھڑی کی سوئیاں دیکھ کر افطار نہیں ہوتا۔ کہاں قرآن میں لکھا ہے کہ تم گھڑی دیکھ کر افطار کرو، وہاں تو لکھا ہے رات ختم ہو، صبح صادق طلوع ہو تو ترکِ سحر کرنا۔ یہ اوقات ترک سحر وافطار کہاں سے لیے جاتے ہیں؟ سرکاری رصدگاہ OBSERVATORY سے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ گُڑ کھائیں گلگلوں سے پرہیز کریں۔ روزہ کی ابتدا کب ہو، انتہا کب؟ اس کے لیے رصدگاہ معتبر اور روزوں کی ابتدا کب ہو اور انتہا کب؟ اس کے لیے OBSERVATORY، رصدگاہ غیر معتبر۔

عزیزو! میں جو گفتگو کر رہا ہوں، حدودِ شریعت کے اندر کر رہا ہوں۔ آپ کسی مرجعِ وقت کا عملیہ دیکھیں، وہاں رویت کے ثبوت کے لیے اور شرطوں کے ساتھ یہ بھی تحریر ملے گا کہ جس طریقہ سے بھی کسی انسان کو یقین ہو جائے کہ رویت ہو گئی وہ اس کے لیے کافی ہے۔ دیکھیے آ گئی نا وہی بات کہ دیکھنا معیار نہیں ہے، یقین ہو جانا معیار ہے۔ حضور آپ کو معلوم نہ ہو مگر اس وقت علمِ ہیئت جدید اتنی ترقی کر چکا ہے کہ ہزاروں سال کے بعد تک کے چاند کے منازل بتائے جا سکتے ہیں۔ مگر یہاں صورت حال یہ ہے کہ عید کا دن بھی یا تو لڑتے گزر جاتا ہے یا روتے گزر جاتا ہے۔ جگ ہنسائی ہوتی ہے الگ۔

تو میں عرض کر رہا تھا آپ کے سامنے کہ یہ سب اس وجہ سے ہے کہ ہم نے سائنس کو دشمن بنا لیا اسی سے یہ ساری مصیبتیں آ رہی ہیں۔ ڈرتے ہیں لوگ، سائنس کو نہ پڑھو، گمراہ ہو جاؤ گے اور سائنس کی تعلیم تک

پر پابندی ہے۔ دیکھو بھئی اردو پڑھ لو اور عربی پڑھنا اس کے آگے کوئی دوسری زبان نہ پڑھنا، سب کفر کی زبانیں ہیں۔ انگریزی نہ پڑھنا حرام ہے، فرنچ نہ پڑھنا گمراہ ہو جاؤ گے، ہندی کے قریب نہ جانا ورنہ ہندو ہو جاؤ گے، سنسکرت نہ پڑھنا ورنہ چُٹیا نکل آئے گی۔ اچھا بھائی کچھ نہ پڑھیے معصومینؑ کی سیرت تو پڑھیے۔

ایک شخص امام جعفر صادق علیہ السلام کے پاس آتا ہے کہ فرمایئے امام برحق کی کم سے کم پہچان کیا ہوتی ہے؟ سنیے گا۔ فرمایا، امام برحق کی کم سے کم پہچان یہ ہے کہ اس سے جس زبان میں سوال کیا جائے اس زبان میں جواب دے گا یعنی عربی میں سوال تو عربی میں جواب، فارسی میں سوال تو فارسی میں جواب، اردو میں سوال تو اردو میں جواب، ہندی میں سوال تو ہندی میں جواب، سنسکرت میں سوال تو سنسکرت میں جواب، انگریزی میں سوال تو انگریزی میں جواب، فرنچ میں سوال تو فرنچ میں جواب، لیٹن میں سوال تو لیٹن میں جواب۔ تو اگر یہ دوسری زبانیں نہیں جانتے ہیں تو کیسے جواب دیں گے۔ اچھا اب مجھے اتنا تو معلوم ہو گیا کہ ہر زبان جانتے تھے۔ اب مجھے اتنا اور بتا دیں کہ انھوں نے یہ زبانیں کس یونیورسٹی میں سیکھیں۔ کون سا کالج تھا، کون سا اسکول تھا؟ تو آپ کہہ دیں گے توبہ کیجیے توبہ۔ یہ زبانیں ان کو خدا نے سکھائی ہیں۔ اچھا آپ توبہ کر لیجیے، اس لیے کہ آپ کی منطق کے مطابق اللہ بھی کفر کی باتیں سکھا سکتا ہے امامِ برحق کو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ جسے کفر کہہ رہے ہیں وہ ایسی مقدس شے

ہے کہ اللہ سکھاتا ہے اور امامؑ سیکھتا ہے۔

اب آپ پلٹ کر آجائیے سائنس کی طرف تو ابھی ASTRONOMY سے متعلق علیؑ ابن ابی طالبؑ کا ارشاد آپ کے سامنے پیش کیا۔ آپ یقین کرلیں کہ ساری سائنس علیؑ کو آتی تھی، سارے علوم ائمہ طاہرینؑ کو آتے تھے۔ ہشام بن عبدالملک بنی امیہ کا بڑا زبردست بادشاہ بڑا زبردست DICTATOR یہ ہشام آیا' درباری علماء کا ہجوم لگ گیا، مگر وہ جو علم کا مرکز تھا، امام محمد باقرؑ تشریف نہیں لائے۔ ہشام نے کہا ٹھیک ہے اگر وہ ملنے کے لیے نہیں آئے تو میں خود ان کی خدمت میں جاؤں گا۔ لوگوں نے کہا آپ کہاں جائیے گا وہ تو بس مسجد نبوی میں درس دیا کرتے ہیں۔ اچھا پہلے اتنا بتا دیجیے کہ مسجد میں سوائے عبادت کے کوئی دوسرا کام ہو سکتا ہے؟ خدا نہ کرے آپ پتے پھینٹتے ہوں لیکن اپنے گھروں میں پھینٹ رہے ہوں گے تو میں شاید آنکھ بچا کر نکل جاؤں گا مگر مسجد میں پھینٹ رہے ہوں گے تو آپ کا ہاتھ پکڑ لوں گا۔ گھر تک غنیمت ہے لیکن یہ اللہ کا گھر ہے، یہ عبادت کا گھر ہے۔ مسجد میں سوائے عبادت کے کوئی کام نہیں ہو سکتا۔

اب آیا ہے ہشام ابن عبدالملک مسجد نبوی میں۔ ہزاروں شاگرد امامؑ کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ کھمبے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ امامؑ نے لفٹ بھی نہیں دی۔ اب یہ سن رہا ہے کہ یہ کیا پڑھا رہے ہیں۔ بہت دیر تک کھڑا سنتا رہا، مگر اس کے پلّے کچھ نہیں پڑا تو کہا کہ یہ آپ

کیا پڑھا رہے ہیں مسلمانوں کو؟ امام نے فرمایا ASTRONOMY اور جغرافیہ۔ کہا میں تو سمجھ رہا تھا کہ آپ یہاں مسجد میں کھڑے قرآن اور حدیث پڑھا رہے ہوں گے، آپ یہاں ASTRONOMY اور جغرافیہ پڑھا رہے ہیں، کہا ہاں، میں وہی پڑھا رہا ہوں کہ جس کا پڑھانے کا قرآن اور رسولؐ نے حکم دیا ہے۔

اب بتائیے مسجد میں ایک امام معصومؑ سوائے کارِ عبادت کے کوئی دوسرا کام کر سکتا ہے؟ اس کا مطلب یہ کہ جس کا پڑھنا ہم اپنی جہالت کے سبب سے حرام سمجھ رہے ہیں وہ دراصل عبادت ہے۔

بس ایک بات آپ کے سامنے عرض کر دوں اور پھر آگے بڑھ جاؤں اور وہ یہ کہ آپ قرآن پڑھیں، حدیث پڑھیں، آپ تفسیر کا علم حاصل کریں مگر چلے جائیں جہنم میں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ CHEMISTRY پڑھیں PHYSICS پڑھیں اور یہ فزکس اور یہ کیمسٹری آپ کو جنت تک پہنچا دیں۔ دراصل اسلام میں اس کا انحصار نیت پر ہے۔ اگر آپ قرآن پڑھ رہے ہیں، حدیث پڑھ رہے ہیں، تفسیر اور تاریخ سے آگاہی حاصل کر رہے ہیں صرف اس لیے کہ لوگوں کا مذہبی استحصال کریں، ان کے ذریعہ دنیا حاصل کریں تو یہ قرآن اور حدیث جہنم میں ڈھکیل دے گی اور اگر آپ سائنس کو حاصل کر رہے ہیں اس لیے کہ سائنس کے ذریعہ سے آپ اسلام کا جدید انداز میں تعارف کرائیں، رموزِ کائنات سے پردہ ہٹا کر خدا کی عظمت کا احساس دلائیں اور سائنس

کو انسانی خدمت میں صرف کریں، دو بھری کے بجائے زندگی کے مشکلات حل کریں تو خدا شاہد ہے یہی سائنس آپ کو جنت میں پہنچا دے گی۔

علیؑ قسیم جنّت و نار ہیں، ساقیٔ کوثر ہیں مگر دنیا کے سب سے بڑے سائنس داں بھی ہیں۔ بس ایک بات سن لیجیے اس سلسلہ میں، کیونکہ وقت ختم ہو رہا ہے۔ علیؑ ابن ابی طالب مسجد کوفہ میں منبر پہ ہیں۔ زمانہ وہ ہے جو آپ کے سامنے عرض کر چکا ہوں کہ علی ابن ابی طالب کہتے ہیں کہ اگر کہو تو میں تمھارے گھروں میں آبشاروں سے روشنی پہنچا دوں اور خرد ماغ کہتا ہے کہ ہمارے بال گن دیجیے۔ زمانہ وہ ہے اور علیؑ ابن ابی طالب خطبہ دے رہے ہیں اور علم کا سمندر موجیں مار رہا ہے کہ اتنے میں ایک بقراطِ دہر اٹھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یا علیؑ کہاں تک ہم سنیں کہ آپ کے پاس اتنا علم ہے، اتنا علم ہے۔ اچھا ذرا اتنا تو بتائیے کہ سورج جو ہمارے سر پہ چمک رہا ہے اس کا زمین سے فاصلہ کیا ہے؟ یہ ہے علیؑ کی مصیبت، بتاؤں میں آپ کو کہ اوّل تو جو وہاں سے کھڑے ہوئے ان کی فہم و فراست آپ جانتے ہیں، علیؑ سمجھائیں تو کیسے سمجھائیں؟

ایک حقیقت اور آپ کے سامنے بیان کر دوں۔ بہت سے لوگوں کو یہ معلوم ہی نہیں ہو گا کہ اُس زمانہ میں عربی زبان میں اَلفؒ کے آگے گنتی کا وجود ہی نہیں تھا۔ اَلف ہزار کو کہتے ہیں۔ چنانچہ آج بھی آپ دیکھیں تو عربی زبان میں اَلف کے آگے گنتی ہی نہیں ملے گی۔ انھوں نے انگریزی سے MILLION لیا ہے لیکن عربی DICTIONARY میں اَلف

کے آگے گنتی نہیں ملے گی۔ الف کے معنی ہزار، ہزار کے آگے گنتی ہی نہیں۔
اب زمین سے سورج کا فاصلہ ہے نو کروڑ تیس لاکھ میل تو علیؑ وہاں گنانے بیٹھتے نو کروڑ تیس لاکھ میل تو صبح سے بیٹھتے تو شام ہو جاتی۔ ہزار ہزار ہزار تسبیح بڑھتے۔ تو اب کیسے سمجھائیں؟ دماغ ان کا چڑیا کے مغز کے برابر۔ گنتی اتنی مختصر کہ ہزار کے آگے نمبر ہی نہیں۔ وہاں کیسے بتائیں کروڑوں کا فاصلہ؟ آپ کو سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ بچے بھی جانتے ہیں کہ زمین سے سورج کا فاصلہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ کم سے کم ..... ۹۰۴ میل اور زیادہ سے زیادہ ..... ۹۴۴ میل۔ اسی RANGE میں سورج کا فاصلہ زمین سے گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔

اب انھوں نے سوال کیا کہ حضور! یہ بتائیے کہ سورج سے زمین کا فاصلہ کتنا ہے؟ بس ہماری جانیں فدا ہو جائیں مولائے کائنات پر۔ صورت دیکھی، صلاحیت کا اندازہ کیا، سوچا ایسا انداز ہو کہ یہ تو گھبرا کر بیٹھ جائے مگر ہاں میرا کہا ہوا ارشاد آئندہ نسلوں تک پہنچے تو آئندہ آنے والے سمجھیں کہ میں نے کیا کہا تھا۔ مسکرائے اور مسکرا کے کہا ہاں، تو چاہتا ہے کہ سورج سے زمین کا کتنا فاصلہ ہے؟ بس اتنا سمجھ لے کہ عرب کا ایک تیز رفتار گھوڑا اپنی پوری SPEED سے سورج کی طرف اڑنا شروع کر دے اور ایک ہی رفتار سے اڑتا رہے تو سورج تک پہنچنے میں اس کو پانچ سو برس لگ جائیں گے۔

ایک منٹ کا کام ہے CALCULATOR اٹھا لیجیے، گھر پر جا کر

عرب کے گھوڑوں کی رفتار میں آپ کو بتائے دیتا ہوں۔ کسی بھی کتاب میں آپ دیکھ لیجیے کہ عربی گھوڑوں کی اوسط رفتار تقریباً ۲۲ میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ آپ جا کر جوڑ لیجیے پانچ سو قمری برس کا حساب تو آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ بالکل وہی فاصلہ نکلتا ہے جو آج کی ASTRONOMY بتاتی ہے (صلوٰۃ)

بھائی صاحب! علیؑ ابن ابی طالب کے پاس کون سی OBSERVATORY تھی کون سا RADIO TELESCOPE تھا، کون سے آلات تھے کہ جو علیؑ ابن ابی طالب نے بالکل صحیح فاصلہ اور وہ بھی اتنے خوبصورت انداز میں کہ ایک جواب میں تین علوم پر روشنی پڑ رہی ہے۔ ذرا آپ غور کریں کہ علیؑ کو یہ بھی معلوم کہ گھوڑے کی اوسط SPEED کیا ہے؟ ساتھ ہی ARITHMETIC کے بھی ماہر تھے۔ یعنی ایک جواب سے معلوم ہوتا ہے ZOOLOGY پر بھی نظر ہے، ARITHMETIC پر بھی نظر ہے ASTRONOMY پر بھی نظر ہے۔ (صلوٰۃ) تو علیؑ نے کیسے بتایا چودہ سو برس پہلے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کیسے بتا دیا ہوگا مگر یہی کہنا پڑے گا کہ جس نے سورج اور زمین کو بنایا تھا اسی نے ان کو بتایا کہ کتنا فاصلہ ہے۔ پھر بات وہیں پر آگئی آپ جسے کفر سمجھ رہے ہیں وہ اتنی مقدس سائنس ہے کہ اللہ پڑھا رہا ہے اور یہ اسے پڑھ رہے ہیں۔ تو دماغ میں آپ کے جو غلط فہمیاں ہیں وہ بیکار ہیں۔

اسلام علم کا مذہب ہے، اسلام فکر کا مذہب ہے۔ پڑھ لیجیے قرآن مجید کو، نماز کا وقت معین، روزے کا زمانہ معین، حج کا زمانہ معین، عبادتوں کے PERIOD اوقات قرآن نے معین کیے ہیں مگر فکر

کرنے کا وقت معین نہیں لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ، لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ، لَعَلَّکُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ یہ قرآن اس لیے ہے کہ تمھاری فکر میں اضافہ کرے، تمھارے شعور میں اضافہ ہو، تمھارا علم آگے بڑھے، تمھاری عقل آگے بڑھے کوئی وقت معین نہیں۔ اور حضورؐ نے ارشاد فرمایا فِکْرُ سَاعَۃٍ خَیْرٌ مِنْ عِبَادَۃِ سَبْعِیْنَ سَنَۃٍ تھوڑی دیر کی فکر صحیح ستر برس کی عبادت سے بہتر ہے۔ یہ ہے اسلام جو فکر کا مذہب تھا اب ہو گیا باطل کی اندھی تقلید کا مذہب۔ اس لیے کہ فکر کی عادت ہم نے چھوڑ دی تو عقل ہم سے رخصت ہو گئی، علم ہم سے جا رہا ہے۔ میں پھر عرض کرنا چاہتا ہوں آپ کے سامنے کہ اگر مسلمانوں کو ڈوبتی ہوئی کشتی سنبھالنا ہے تو صرف اور صرف علم اور تعلیم کے ذریعہ سنبھالا جا سکتا ہے۔

برادرانِ عزیز! آپ خدا کا شکر ادا کریں کہ آپ نے ایسوں کا دامن تھاما ہے کہ جن کے پاس دولت دنیا نہ سہی مگر دولت علم موجود تھی۔ علی بن ابی طالب ارشاد فرماتے ہیں ؎

رَضِیْنَا قِسْمَۃَ الْجَبَّارِ فِیْنَا
لَنَا عِلْمٌ وَلِلْاَعْدَاءِ مَالٗ

ہم اللہ کی اس تقسیم پر راضی اور خوش ہیں کہ اس نے ہمارے مقدر میں علم لکھ دیا ہے رہا دوسروں کے مقدر میں دولت لکھ دی۔ دولتِ دنیا چند دنوں میں ختم ہو جائے گی اور علم کا خزانہ وہ جو کبھی ختم نہیں ہوتا تو آپ خدا کا شکر ادا کریں کہ آپ ان کے دامن کو تھامے ہوئے ہیں جن

کے پاس علم تھا اور اہل بیتؑ کے دشمن جن کے پاس دولت تھی اور اسی جہل اور علم کی ٹکر کربلا کے میدان میں ہوئی۔

ایک طرف علم کی روشنی تھی دوسری طرف جہالت کی تاریکی اور بظاہر ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ جہالت کی کالی آندھی کہیں علم کے چراغ کو خاموش نہ کر دے۔ دنیا نے دیکھا کہ علم کے چراغوں کی صفت ہوتی ہے کہ جب چراغ خاموش ہو جاتے ہیں تو روشنی میں کچھ اور اضافہ ہوتا ہے اور یہ خصوصیت صرف علم کے چراغ میں ہے۔ حسینؑ کربلا کے میدان میں اپنے لشکر کو مختصر سے مختصر تر کرتے جا رہے تھے اس لیے کہ لشکر کی لشکر سے جنگ نہیں تھی، کردار کی کردار سے جنگ تھی۔ مجھے اپنے ساتھ چند لوگ لے کے جانا ہیں، مگر وہ جو خلاصۂ کائنات ہوں۔ میں کسی پر کوئی زبردستی نہیں کرتا۔ مگر قرآن مجید کو لیجیے، صحابہ میں بہت سے مقدس بھی تھے پرہیزگار بھی تھے نیک بھی تھے مجاہد بھی تھے سب۔ مگر سب ایک سے تو تھے نہیں۔ قرآن مجید کی آواز ہے وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْ اُخْرٰىكُمْ ایسے بھی تھے بھاگے چلے جا رہے تھے، رسولؐ بلا رہے تھے کہ پلٹ آو، وہ پلٹ کے آنے پر تیار نہیں۔

یہ رسولؐ کے اصحاب اور ان کے مقابلہ میں حسینؑ کے اصحاب، ان کو رسولؐ بلا رہے ہیں چلے آو، وہ آنے پر تیار نہیں۔ یہ بار بار کہہ رہے ہیں چلے جاؤ، میرا ساتھ چھوڑ دو تو میں چراغ بھی بجھائے دیتا ہوں، اب چلے جاؤ، اب چلے جاؤ۔ مگر قسم خدا کی، خیمہ کا چراغ خاموش ہوا تو

کے پاس نہیں۔ یہ ایک ایسا ادارہ ہے جس سے آپ کے سوا سب محروم ہیں۔ یہ اسکول بھی ہے کالج بھی ہے یونیورسٹی بھی ہے۔ اسکولوں میں صرف بچے ہوتے ہیں، کالجوں میں نوجوان ہوتے ہیں اور یونیورسٹی کے اعلیٰ کلاسز میں عمر رسیدہ اسکالر۔ مگر یہ کیسی تعلیم گاہ ہے کہ اسی ایک تعلیم گاہ میں مرد بھی ہیں عورتیں بھی، بوڑھے بھی ہیں نوجوان بھی بچے بھی ہر موضوع ہر سبجکٹ یہاں پڑھایا جاتا ہے۔ پھر کیسی حیرت کی بات ہے کہ عورتیں ہوں یا مرد، بچے ہوں یا بوڑھے یا جوان، سب ہی سارے کام چھوڑ کر آتے ہیں، زحمتوں کو گوارہ کر کے گھنٹوں بیٹھتے ہیں اور بہت کچھ دامن میں لے کر چلے جاتے ہیں۔ یہ کیسی سرکار تھی حسینؑ کی جو کربلا میں لٹ گئی، بالکل لٹ گئی، جلا دی گئی، پھونک دی گئی ہے مگر اسی لٹی ہوئی سرکار کا، جلی ہوئی سرکار کا، پھنکی ہوئی سرکار کا فیض آج تک جاری ہے۔ یہاں دین بھی ملتا ہے دنیا بھی، دماغ کو بھی غذا ملتی ہے روح کو بھی۔ مرادیں بھی پوری ہوتی ہیں دعائیں بھی قبول ہوتی ہیں۔

آج اس عزاخانہ کی پہلی مجلس ہے۔ آپ اپنے ملک سے، شہر سے ہزاروں میل کے فاصلہ پر یہ شمع فروزاں کیے ہوئے ہیں، یہ چراغ جلائے ہوئے ہیں۔ برادران عزیز! امریکا کی سرزمین پر یہ حسینی مشن صادقِ آلِ محمدؐ کی پیشین گوئی کی صداقت کا ثبوت ہے۔

ہمارے چھٹے امام سفر میں ہیں۔ گزر ہوا ایک بستی کے قریب سے، پوچھا یہ کون سی بستی ہے؟ ایک واقف کار نے کہا کہ فرزند رسولؐ! یہاں سے آگے

وفا کے چراغ جل اٹھے اور ایک ایک صحابی کی آواز آنے لگی، فرزند رسولؐ! کب تک ہمارا امتحان لیجیے گا۔ ہم بار بار کہہ چکے، ہم آپ کا ساتھ چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ جان جاتی ہے چلی جائے، جسم کے ٹکڑے ہوتے ہیں تو ہوجائیں، فرزندِ رسولؐ! ایک ہی مرتبہ مرنا ہے۔ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ہم آپ کی محبت کی قسم کھاکر کہتے ہیں، ایک مرتبہ مرنا کیسا، اگر ستّر ستّر بار ہم کو مارا جائے اور اللہ ہم کو زندہ کردے تو ہم آپ ہی کا نام لیتے رہیں گے۔ یہ تھے حسینؑ کے صحابی، یہ تھے حسینؑ کے سپاہی، یہ حسینؑ کے انصار یہ تھے حسینؑ کے مددگار۔ ایسے سپاہی کسی کو نہیں ملے اور یہ حسینؑ نے خود فرمایا کہ جیسے اصحاب مجھے ملے ایسے اصحاب کسی کو نہیں ملے۔

اس مجلس میں بیٹھے ہیں پیارے پیارے بچے ہنستے رہتے ہیں، پھول سے چہرے ہیں۔ مگر جب ان ہنستے چہروں پر نظر پڑے تو ان کربلا والے پھول سے چہروں والے اداس بچوں پر بھی نظر ڈال لیجیے گا کہ جن کو تین دن سے پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں ملا ہے اور اُنھیں بچوں میں دو بچے وہ ہیں جن میں ایک کا نام عونؑ اور دوسرے کا محمدؐ ہے۔ یہ دونوں زینبؑ کے لاڈلے۔ عزادارانِ حسینؑ شبِ عاشور اور حسینؑ اس خیمہ میں داخل ہوئے جہاں زینبؑ کبریٰ کا قیام تھا۔ حسینؑ آئے تو کیا دیکھا، بہن اپنے دونوں بچوں کو سینے سے لگائے ہوئے کچھ باتیں کر رہی ہیں۔ حسینؑ کو دیکھا تو زینبؑ کی زبان چپ ہوگئی۔ حسینؑ نے پوچھا بہن! کیا کہہ رہی تھیں بچوں سے؟ کہا بھائی کچھ نہیں، بات ختم ہوگئی۔

صبح عاشور نمودار ہوئی۔ حسینؑ کا دفتر قربانی کھل گیا۔ ایک کے بعد دوسرا مجاہد دوسرے کے بعد تیسرا مجاہد میدان میں آتا رہا، جامِ شہادت پیتا رہا یہاں تک کہ جب انصار ختم ہو گئے تو اصحاب کی باری آئی، جب اصحاب ختم ہو گئے تو بنی ہاشم کی باری آئی۔ کبھی اولادِ جعفر آگے بڑھی کبھی اولادِ عقیل آگے بڑھی۔ آخر حسینؑ کے بہادر بھانجوں عونؑ و محمدؑ نے آکر ماموں کی خدمت میں عرض کیا، ماموں جان ہم کو مرنے کی اجازت دیجیے۔

عزادارو! ذرا انصاف سے بتائیے گا کہ تاریخ میں کسی ماموں پر یہ وقت آیا ہے؟ اُس کے پیارے پیارے، بھولے بھولے بھانجے! آکر اس سے مرنے کی اجازت مانگیں۔ مگر ہائے حسینؑ کی بیکسی۔ حسینؑ نے کبھی زمین کو دیکھا کبھی آسمان کو دیکھا۔ کہا جاؤ بچو! پہلے جاکر اپنی ماں سے رخصت ہو لو۔ آئے دونوں شہزادے، اب میں نے روایت میں دیکھا ہے اس لیے عرض کر رہا ہوں۔ آئے اور آنے کے بعد سلام کیا ماں کو۔ میں کہتا ہوں ضرور کیا ہوگا سلام ماں کو۔ ذرا انصاف سے بتائیے گا، ہمارے آپ کے بچے جب سلام کرتے ہیں تو کیا جواب دیتے ہیں ہم کہ جیتے رہو۔ کیا زینبؑ کے منھ سے نکلا ہوگا کہ جیتے رہو؟ اس لیے کہ یہ بچے مرنے کی اجازت لینے کے لیے آئے ہیں تو بچے مرنے کی اجازت کے لیے آئے ہوں، ان کو ماں کس زبان سے جینے کی دعائیں دے۔

بہرحال ماں سے رخصت ہوئے شہزادے، میدان جنگ میں آئے۔ آگے بڑھ کر حملہ کیا اور بہت شجاعت کے ساتھ جنگ کی، بہت سوں

کو قتل کیا۔ تین دن کی بھوک پیاس میں علیؑ کی شجاعت لوگوں کو یاد دلادی۔ اس کے بعد زخمی ہوئے، گھوڑے سے گرے، دنیا سے رخصت ہوئے۔ حسینؑ نے دونوں بچوں کی لاشیں اٹھائیں، خیمہ میں لائے، ماں کے سامنے لاشیں رکھنے کے بعد کہا کہ زینبؑ تم کو یاد ہوگا، کل جب میں خیمہ میں آیا تھا تو تم اپنے بچوں سے کچھ باتیں کر رہی تھیں، جب میں نے پوچھا کہ کیا باتیں کر رہی ہو تو تم نے نہیں بتایا تھا لیکن بہن، مجھے معلوم ہو گیا کہ تم نے بچوں سے کیا باتیں کی تھیں۔ زینبؑ نے گھبرا کر کہا بھیا! آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ کہا زینبؑ، مجھے اس لیے پتہ چل گیا کہ جب تمھارے دونوں بچے کربلا کے میدان میں آئے اور لشکرِ یزیدی کے سامنے کھڑے ہوئے تو عرب کے دستور کے مطابق سپاہیوں نے پوچھا کہ تم کس کے بیٹے ہو، تمھارا حسب کیا ہے، تمھارا نسب کیا ہے؟ دونوں بچوں نے لشکرِ یزیدی کے سپاہیوں سے کہا کہ سن لو، حسینؑ کی ایک کنیز کے فرزند ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ تم اپنے بچوں کو یہی بتا رہی تھیں کہ کربلا کے میدان میں جب تم سے حسب نسب پوچھا جائے تو یہ نہ کہنا کہ ہم علیؑ کے نواسے ہیں، یہ نہ کہنا کہ ہم حسینؑ کے بھانجے ہیں بلکہ یہ کہنا کہ حسینؑ کی کنیز کے فرزند ہیں۔ مگر زینبؑ جب تمھارے شہزادوں نے حملہ کیا تو لشکرِ یزید کے لوگ خود پکارنے لگے، تم زبان سے نہ کہو مگر تمھارا اندازِ شجاعت یہ بتا رہا ہے کہ علیؑ کے وارث حسینؑ کے بھانجے ہو۔

بس عزادارانِ حسینؑ! چند منٹ میں آپ کی زحمتیں ختم کر دینا

چاہتا ہوں۔ وقت کے کچھ لمحے باقی رہ گئے ہیں، میں چاہتا ہوں یہ لمحے بھی اس مظلوم پر گریہ وزاری میں صرف ہوجائیں کہ جس مظلوم پر رونے کے لیے آپ دور دور سے تشریف لاکر یہاں بیٹھے ہیں۔ انھیں شاہزادوں کا حال مجھے عرض کرنا ہے، لیکن میں اب بات کو ذرا آگے بڑھائے دیتا ہوں اب کربلا کو چھوڑ دیجیے، اب آجائیے شام میں۔ شاہزادیوں کو قید ہوئے ایک سال کا عرصہ ہوگیا۔ سیاسی حالات ایسے ہوئے کہ یزیدؔ مجبور ہوگیا اہل بیتؑ حسینؑ کو رہا کرنے کے لیے زین العابدینؑ کو بلایا۔ آج یزیدؔ تعظیم کے لیے کھڑا ہوتا ہے، اپنے برابر جگہ دیتا ہے اور کہتا ہے زین العابدین! خدا لعنت کرے ابن مرجانہ پر کہ اس نے تمھارے بابا کو بے خطا قتل کر دیا۔

اللہ اکبر! حسینؑ کی عصمت اور مظلومیت اس منزل پر ہے جہاں یزید کو بھی کہنا پڑ رہا ہے کہ حسینؑ کو بے خطا قتل کر دیا۔ اس کے بعد کہا سید سجاد! اب ہم تمھیں قید سے آزاد کرتے ہیں۔ بتاؤ بتاؤ یہاں رہوگے یا مدینہ جاؤ گے؟ اللہ رے زینب کبریٰؑ کی عظمت و جلالت کہ امامت یہ کہہ رہی ہے، میں کچھ نہیں کہہ سکتا جو پھوپھی حکم دیں گی اس پر عمل ہوگا۔ آئے قید خانہ میں اور کہا میں نہیں کہہ سکتا، کس زبان سے کہا کہ اے پھوپھی! اب ہم قید سے رہا کیے جا رہے ہیں، یزید نے کہا ہے کہ آپ کربلا جائیے گا یا مدینہ تشریف لے جائیے گا؟ شاہزادی نے جواب دیا، کیسا مدینہ اور کیسی کربلا۔ ابھی تو میں اپنے مظلوم بھائی کو رونے کے لیے ترس رہی ہوں۔

یزید سے کہو کہ اپنے قصر کا ایک حصہ خالی کر دے جہاں میں بھائی کی صف ماتم بچھاؤں۔

یہ ہے زینبؑ کی فتح عظیم۔ کل جس قصر کو سجایا گیا تھا، جہاں قتلِ حسینؑ کی مبارکبادیں دی جا رہی تھیں، وہیں آج سیاہ پردے لگے ہیں۔ شام کی محب اہل بیتؑ عورتیں جوق در جوق آ رہی ہیں، حسینؑ کی صفِ عزا بچھی ہے۔ گویا بعد شہادت یہ پہلی مجلس ہے، خود قصرِ یزید میں منعقد ہو رہی ہے۔ تین دن تک صفِ عزا بچھی رہی، پھر کربلا جانے کی تیاری ہوئی۔

کارواں تیار ہے، اونٹوں پر سیاہ محملیں، فوج کا رسالہ حفاظت کے لیے موجود ہے۔ عزت واحترام کے ساتھ روانگی ہونے والی ہے۔ زینبؑ نے سید سجاد سے کہا بیٹا! یزید سے کہو کہ ہم جا رہے ہیں، چاہتے ہیں کہ چلتے وقت اپنے وارثوں سے رخصت ہولیں۔ بیٹا! کسی صورت سرہائے شہدا منگوا دو۔

لیجیے سر آنا شروع ہو گئے۔ علی اکبرؑ کا سر آیا ام لیلیٰ نے آگے بڑھ کر گود میں لے لیا، قاسمؑ کا سر آیا ام فروہ نے سینہ سے لگا لیا، قمر بنی ہاشم کا سر آیا ام کلثوم نے گود میں لے لیا۔ مگر اب دو سر ایک ساتھ آئے۔ یہ آپ نے پہچانا، یہ کس کے سر ہیں؟ یہ حسینؑ کے بھانجوں کے سر ہیں، زینبؑ کے لاڈلوں عونؑ و محمدؑ کے سر ہیں، مگر ہر سر کا استقبال کرنے کوئی آگے بڑھا مگر یہ سر آئے تو آگے بڑھ کے کوئی استقبال کرنے والا نہیں۔ کسی نے پوچھا، کیا ان بچوں کا کوئی وارث موجود نہیں ہے؟

بتانے والوں نے بتایا کہ ارے ان بچوں کی ماں موجود ہے۔ مگر وہ بچوں کا غم بھولے ہوئے اپنے بھائی کے سر کا انتظار کر رہی ہے۔ حسینؑ کا سر آیا تو زینبؑ نے بڑھ کر استقبال کیا، گود میں لے لیا بھائی میں مدینہ جا رہی ہوں، بتائیے کہ صغریٰ کو یہ صورت کیسے دکھاؤں گی؟

چھٹی مجلس

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ط بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝
وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ
مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝ (سورہ آل عمران آیت ۸۵)

برادران عزیز! آج محرم کی چھٹی تاریخ ہے اور اسی آیت کو میں نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے جسے برابر آپ سماعت فرما رہے ہیں اور جس میں کائنات کے پروردگار نے بالکل واضح انداز میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اسلام کے علاوہ اگر کوئی بھی انسان کوئی دوسرا دین، کوئی دوسرا مذہب اختیار کرے گا تو وہ دین اور وہ مذہب ہم اُس سے قبول نہیں کریں گے اور ایسا انسان جب آخرت کی دائمی اور واقعی زندگی میں داخل ہو گا تو اسے خود اس بات کا پتہ چل جائے گا کہ اس نے اسلام کو چھوڑ کر اپنا شمار اس گروہ میں کروایا ہے جو نقصان اٹھانے والوں میں تھا۔

تمہید میں برابر قرآن مجید کے بارے میں آپ کی خدمت میں گزارش پیش کر رہا ہوں۔ ایک اعتراض قرآن مجید پر کیا جاتا ہے اور جس سے

اکثر مسلمان بھی پریشان ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ اعتراض واقعیت سے کچھ قریب دکھائی دیتا ہے۔ اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اصول میں نے آپ کے سامنے عرض کیا کہ اگر قرآن مجید اللہ کا کلام ہے تو اس میں شانِ اُلوہیت جھلکے گی اور اگر انسان کا کلام ہے تو اس میں انسان کی کمزوریاں جھلکیں گی۔ وہ کہتے ہیں کہ اسی اصول کی بنا پر آپ قرآن مجید کو ملاحظہ کریں کہ انسان کی دو کمزوریاں ہوتی ہیں۔ پہلی کمزوری یہ ہے کہ انسان کی LIMITED — KNOWLEDGE — محدود علم ہے۔ دوسری کمزوری یہ ہے کہ انسان بات کرتا ہے اور بھول جاتا ہے اور ان ہی دونوں کمزوریوں کے سبب اس کے کلام میں تکرار پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی ایک ہی بات کو بار بار کہتا چلا جاتا ہے۔ یہ انسان کے کلام میں کمزوری ہے تو قرآن میں یہ بات نہیں ہونا چاہیے۔ حالانکہ ہم قرآن مجید کو دیکھتے ہیں تو اس میں ہم کو دکھائی دیتا ہے کہ قرآن مجید میں ایک ایک بات کو دس دس مرتبہ، پندرہ پندرہ مرتبہ، بیس بیس مرتبہ، پچیس پچیس مرتبہ مختلف انداز سے الفاظ بدل بدل کے کہا گیا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ کہ تو یہ صورت بھولے سے ہو رہی ہے یا اللہ کے پاس کچھ کہنے کے لیے نہیں رہ گیا تھا۔ تو اگر بھولے سے کلام میں تکرار آئی تب بھی وہ خدا نہیں ہے اور اگر کہنے کے لیے کچھ اور نہیں تھا تب بھی وہ خدا نہیں ہے۔

یہ اعتراض ہے جس سے اکثر مسلمان پریشان ہو جایا کرتے ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں ایک بات اجمالی اور ایک ذرا تفصیلی آپ کی

خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ قرآن جب اُترا تھا تو اس نے کہا تھا اِن کُنتُم فِی رَیبٍ مِّمَّا نَزَّلنَا عَلٰی عَبدِنَا فَاتُوا بِسُورَۃٍ مِّن مِّثلِہٖ ۔۔۔ (سورہ بقرہ آیت ۲۳) اگر تم کو اس کے کلام ربّانی ہونے میں شک ہے تو پورے قرآن کا نہیں، کسی ایک چھوٹے سے سورہ کا جواب پیش کر دو۔ سورۂ کوثر کی تین آیتیں ہیں، تم انھیں کا جواب پیش کر دو۔ سورۂ ماعون کا جواب پیش کر دو۔ سورۂ نصر کا جواب پیش کر دو۔ سورہ عصر کا جواب پیش کر دو۔ یہ سارے ایک سانس میں ختم ہو جاتے ہیں، کسی سورہ کا جواب پیش کر دو اور یہ HISTORICAL FACT ہے، تاریخی حقیقت ہے کہ اعتراض کرنے والوں نے اعتراضات کیے مگر قرآن کا جواب کوئی نہ پیش کر سکا۔ تو میں یہ کہتا ہوں کہ جسے آپ اپنی کم علمی کی بنا پر عیب سمجھ رہے ہیں یہی چیز اعجاز در اعجاز ہے۔ قرآن مجید نے گویا کہ انسان کو شکست فاش دی کہ ہم تم سے یہ کہہ رہے ہیں کہ قرآن کے کسی PORTION کا جواب پیش کر دو، کسی حصہ کا جواب پیش کر دو مگر نہ تم جواب پیش کر سکے نہ قیامت تک جواب پیش کر سکو گے۔ مگر یہ نہ سمجھنا کہ تم جواب نہیں پیش کر سکتے، ہو تو ہم بھی جواب نہیں پیش کر سکتے ہیں۔ ہم ایک ہی بات کو سَو طرح سے کہیں گے، انداز بدلیں گے شانِ اعجاز نہ بدلے گی۔ (صلوٰۃ)

اب ذرا ملاحظہ فرمائیے، کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ آپ کسی ادیب کو کوئی واقعہ بتا کر کسی نظم یا مضمون کی فرمائش کریں مگر شرط ہو

کہ یہ نظم یا نثر بے مثال ہو تو ممکن ہے وہ شاہکار نظم یا نثر کا نمونہ تیار کر دے۔ لیکن اسی واقعہ کو دوسری بار اسی معیار سے پیش کرنا بہت مشکل ہوگا اور تیسری بار تو ناممکن ہو جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک THEME ایک موضوع کو جو بس ایک شاہکار پیش کر سکے وہ ہے بندہ۔ اور جو ایک ہی موضوع کو سو طرح بیان کرے اور شانِ اعجاز نیں فرق نہ آئے وہ ہے خدا۔ اس لیے کہ انسان کی صلاحیت ہے محدود اور خدا کی طاقت ہے لامحدود۔

اب ذرا تفصیلی بات آپ کی خدمت میں عرض کر دوں چند منٹ میں۔ اس قسم کے اعتراضات وہ ہیں جس کی طرف قرآن پہلے ہی اشارہ کر چکا ہے کہ یہ ہوگا۔ وہ کہہ چکا ہے کہ بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ ۝ (سورہ یونس آیت ۳۹) ہم کو معلوم ہے کہ لوگ قرآن کو جھٹلائیں گے مگر اس تکذیب میں قرآن کا کوئی قصور نہ ہوگا۔ وہ علم قرآن کا احاطہ نہ کر سکیں گے۔ وہ ہماری مصلحتوں کو سمجھ نہ سکیں گے، جہالت اُن کی ہوگی اور اعتراض قرآن پر کریں گے، وہی صورتِ حال ہے کہ جس کا اس وقت سامنا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایک ہی بات کو خدا نے قرآن میں بار بار کیوں بیان کیا ہے؟ بیشک قرآن مجید میں مختلف پیغمبروں کا بار بار ذکر ملے گا، پندرہ پندرہ مرتبہ، بیس بیس مرتبہ آپ کو ملے گا۔ واقعات بھی آپ کو وہی ملیں گے

بڑھ چلیے، میں اس بستی سے واقف ہوں، بڑی گندی بستی ہے یہ۔ آپ کے دشمنوں سے بھری ہوئی، اس پوری آبادی میں ایک بھی آپ کا شیعہ نہیں، ایک بھی محبِ اہل بیتؑ نہیں۔ آپ نے فرمایا آگے نہیں بڑھیں گے، روکو یہیں میری سواری۔ سواری رُکی، زمین پر اترے، مصلیٰ بچھا دیا، نماز پڑھی، دست دعا بلند ہوئے "بار الہا، اس بستی کے لوگوں کو یہیں آباد رکھ، ان کو متفرق ہونے سے بچائے رکھ، ان کو پراگندہ نہ ہونے دے معبود!"

اب وہ بیچارہ چپ کہ دشمنوں کے لیے اور یہ دعا۔ مگر امام کا رعب تھا کہ وہ منھ سے کچھ کہہ نہ سکا۔ قافلہ روانہ ہوا۔ دوسرے روز ایک اور بستی دکھائی دی، امامؑ نے دریافت کیا، یہ کون سی بستی ہے؟ اس شخص نے خوش ہو کر جواب دیا، مولیٰ! یہ بستی آپ کے چاہنے والوں کی ہے۔ یہاں سب کے سب آپ کے فدائی ہیں، آپ کے شیعہ ہیں۔ امامؑ نے فرمایا، یہاں بھی روکو سواری۔ سواری رُکی، زمین پر تشریف لائے، نماز پڑھی اور یہاں بھی دست دعا بلند مگر عجیب و غریب دعا۔ "پالنے والے ان کو تتر بتر کر دے، ان کو پراگندہ کر دے، ان کو اِدھر اُدھر کر دے۔"

اب اس غریب سے برداشت نہ ہوا۔ کہا مولیٰ! میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے، میرا دماغ پھٹا جا رہا ہے۔ یہ کیسا ہے آپ کا برتاؤ، دشمنوں کے لیے دعا، دوستوں کے لیے بد دعا! وہ آباد رہیں یہ اُجڑ جائیں۔ وہ بسے رہیں یہ بکھر جائیں۔ وہ وطن میں رہیں یہ بے وطن ہو جائیں۔ امام مسکرائے اور فرمایا کہ ہماری مصلحت کی گہرائی تک تو پہنچ نہ سکا۔ ارے وہ غلاظت

خالی اسلوب بدلا ہوا ہو گا STYLE بدلا ہوا ہو گا۔ اگر آپ قرآن کا INDEX اٹھا کر دیکھ لیں، حضرت نوحؑ کا واقعہ کتنی جگہ ملے گا آپ کو؟ ایک، دو، تین جگہ۔ حضرت یوسفؑ کا واقعہ ایک جگہ۔ حضرت لوطؑ، حضرت ایوبؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت الیاسؑ وادریسؑ، غرض چھبیس ۲۶ پیغمبروں میں سے بائیس ۲۲ پیغمبروں کے تذکرے آپ کو صرف چند جگہوں پر ملیں گے، صرف چار پیغمبروں کا ذکر آپ کو قرآن میں بار بار ملے گا۔ ایک حضرت آدمؑ، ایک حضرت ابراہیمؑ، ایک حضرت موسیٰؑ، ایک حضرت عیسیٰؑ۔ تو اگر قرآن کو دل چسپی کے لیے واقعات کو بار بار پیش کرنا تھے تو میرے خیال سے آج کل کے زمانے کے اعتبار سے حضرت یوسفؑ کی داستان سب سے زاید مناسب ہوتی۔ امریکہ والے بھی خوش ہوتے، اس لیے کہ یہاں تو یہی ایک THEME ہے، یہی ایک TOPIC ہے گفتگو کے لیے۔ وہاں زلیخا لپکی تھی یہاں نہ معلوم کتنی زلیخائیں لپکتی رہتی ہیں۔ مگر جناب یوسفؑ کا تذکرہ پورے قرآن میں صرف ایک جگہ ہے۔ تو اگر اللہ کے پاس علم کی کمی تھی یا معاذ اللہ وہ بھول جاتا تھا تو داستانِ یوسفؑ کو بھی بار بار بیان کرتا یا حضرت یعقوبؑ کا قصہ بار بار بیان کرتا۔ جب سارے پیغمبروں کو چھوڑ کے صرف چار پیغمبروں کے ذکر میں REPITITION ہے، تکرار ہے تو ہم کو غور کرنا پڑے گا کہ REPITITION بر بنائے جہالت و فراموشی نہیں ہے بلکہ کوئی مصلحت ہوگی۔

بس تو میں سمجھتا ہوں کہ اس راز سے پردہ ساٹھ ستر برس پہلے

بھی نہ اٹھ سکتا تھا، مگر اب اٹھ سکتا ہے۔ اسی لیے میں بار بار آپ کے سامنے عرض کرتا ہوں، خدا شاہد ہے کہ جتنا سائنس کے انکشافات آگے بڑھتے جائیں گی، دنیا کے مذاہب کے رنگ پھیکے پڑتے جائیں گے اور اسلام کے نور میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ ملاحظہ فرمائیے برادران عزیز! ایک نئی سائنس DEVELOP ہوئی ہے جس کا نام ہے PSYCOLOGY نفسیات یہ بہت ہی کام کی چیز ہے اور اس سائنس سے بھی اسلامیات کی دنیا میں بہت فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ بہت سے مسائل میں یہ سائنس ہماری زبردست رہنمائی کرتی ہے۔ مثلاً ہم کو بتاتی ہے کہ فرض کیجیے آپ کے ایسے چاہنے والوں کے بجائے اتفاق سے مجھے مخالفوں کا، دشمنوں کا مجمع مل گیا، مثلاً اسلام دشمن مجمع۔ وہ میری بات ہی سننے پر تیار نہیں۔ میں نے مثلاً حضورؐ کا نام لیا سیرت رسولؐ سے آگاہ کرنے کے لیے انھوں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ میں نے علیؑ کا نام لیا وہ بلی کی جے جے کرنے لگے۔ مگر میں تُلا ہوا ہوں کہ اسلام کا پیغام سنا کے رہوں گا اور وہ تُلے ہوئے ہیں کہ نہیں سنیں گے۔ ایسے موقع پر آپ مدد لیجیے HUMAN PSYCOLOGY سے انسانی نفسیات سے۔ یہ آپ کو بتائے گی کہ جس وقت کسی مخالف مجمع کا سامنا ہو جائے اور اس کو بات سنانا ہو تو اس کی بہترین ترکیب یہ ہے کہ اپنی بات شروع کرنے سے پہلے یہ دیکھو کہ اس مجمع کا ہیرو کون ہے؟ اس کی پسندیدہ شخصیت کون ہے؟ اپنی بات کرنے سے پہلے اس کے ہیرو کا ذکر چھیڑ دو۔ وہ جب یہ دیکھیں گے کہ غیر کی زبان سے ہمارے

ہیرو کا ذکر ہو رہا ہے تو فوراً ان کے کان لگ جائیں گے بات سننے کے لیے اور جب وہ متوجہ ہو جائیں تو اسی درمیان اُس کے ساتھ اپنی بات بھی کہہ گزرو۔

ہندوستان میں آپ تشریف لائیے۔ بیچارے شیعہ شعراء آتے ہیں اور اچھے سے اچھا کلام پیش کرتے ہیں ان کو اتنی دادِ سخن نہیں ملتی ہے اور اگر ہندو کھڑا ہو جاتا ہے اہل بیتؑ کی مدح کرنے کے لیے تو معمولی اشعار پر بھی چھتیں اڑ جاتی ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ جانتے ہیں کہ شیعہ مدح نہیں کرے گا تو کہاں جائے گا؟ مگر یہ جو آئے ہیں صاحب کھدر دھاری ان سے اس بات کی توقع نہیں کہ یہ مدح رسولؐ کریں گے یا مدح اہلِ بیتؑ کریں گے۔ لہٰذا پورا مجمع پوری توجہ کے ساتھ سننے پر تیار ہو جاتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی چال ہے جو مخالف مجمع پر قابو حاصل کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ ملاحظہ کیا آپ نے، یہ ترکیب آج ہمارے سامنے آئی ہے۔ اب آئیے ہم دیکھیں کہ قرآن مجید جس ماحول میں اتر رہا تھا وہ ماحول کیسا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ ماحول ایسا تھا کہ جب رسول قرآن کی آیتیں پیش کرتے تھے تو خود قرآن نے کہا ہے کہ لوگ انگلیاں کانوں میں دے لیتے تھے، ٹھونس لیتے تھے کہ آواز کان کے اندر نہ جانے پائے۔ ایسا دشمن ماحول تھا اور حضورؐ کو اسی ماحول میں بات سنانا ہے۔ سمجھ گئے آپ، یہ تھا ماحول۔

اب آئیے یہ دیکھیں کہ پیغمبرؐ کے مخاطب کون سے گروہ تھے؟ آپ

دیکھیں تاریخ اٹھا کے وہ عیسائی تھے یا یہود یا بت پرست۔ عیسائیوں کے ہیرو کون؟ حضرت عیسیٰ۔ یہودیوں کے ہیرو کون؟ حضرت موسیٰ۔ عرب خواہ کرسچین ہوں، چاہے یہود ہوں یا بت پرست، حضرت ابراہیمؑ کو قومی ہیرو سمجھتے تھے، اس لیے کہ نسل انھیں سے چلی تھی اور اسی لیے حضرت ابراہیمؑ کا بھی ایک بت کعبہ میں نصب کر دیا گیا تھا۔ تو اس کا مطلب یہ کہ جس دشمن ماحول میں پیغمبر قرآن کی آیتیں سنا رہے تھے وہاں تین ہیرو تھے۔ ابراہیمؑ، عیسیٰؑ اور موسیٰؑ۔ پیغمبرؐ جب بہ اذنِ الٰہی آیاتِ الٰہی سنانا چاہتے تھے تو ملاحظہ فرماتے تھے کہ مجمع دشمن کا ہے جو بات سننے کے لیے تیار نہیں۔ اس لیے قرآن نے یہ اسلوب اختیار کیا کہ جب یہودیوں کو آیتیں سنانا شروع کیں تو پہلے موسیٰؑ کا ذکر شروع کر دیا کہ یہ سننے کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ جب کرسچین کو مخاطب کیا تو پہلے عیسیٰؑ کی باتیں شروع کر دیں کہ یہ مخاطب ہو جائیں۔ جب عربوں کو خطاب کیا تو پہلے ابراہیمؑ کا ذکر شروع کر دیا کہ یہ مخاطب ہو جائیں اور جب کان لگا لیں تو اسی ذیل میں اپنی بات سنا ڈالوں۔ (صلوٰۃ) اب اگر قرآن مجید آیا ہوتا فقط عربوں کے لیے تو بس ان ہی تینوں پیغمبروں کے ذکر پر اکتفا ہوتی، مگر قرآن آیا ہے "آدمیوں" کے لیے، اس لیے بار بار حضرت آدمؑ کا ذکر کیا کہ جو اپنے کو نسبت دیتا ہو حضرت آدمؑ سے وہ قرآن کی گفتگو سننے کے لیے مجبور ہو جائے۔ (صلوٰۃ)

بس برادرانِ عزیز! اس پاک اور بے عیب کتاب میں یہ ارشاد ہے کہ اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین اختیار نہ کرنا ورنہ تمھارا شمار

اس گروہ میں ہو گا کہ جو نقصان اٹھانے والوں میں تھا۔

اور اس سلسلہ میں جو موضوع تقریر ہے وہ آپ حضرات کے پیشِ نظر ہے جیساکہ میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ علیؑ ابن ابی طالبؑ نے ارشاد فرمایا کہ اَلنَّاسُ اَعْدَاءُ مَا جَهِلُوْا انسان دشمن ہوتا ہے اُس شئے کا جس سے وہ ناواقف ہوتا ہے۔ مسلمان علماء بدقسمتی سے چوں کہ سائنس سے واقف نہیں تھے، سب نہیں اکثریت ان کی، اس لیے انھوں نے اپنی جگہ پر یہ خیال کیا کہ اسلام اور سائنس میں دشمنی ہے۔ لیکن جب میں نے دیکھا اور کسی حد تک سائنس کو پڑھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ سائنس اور اسلام میں کوئی دشمنی نہیں ہے بلکہ آج کل کے زمانہ میں خود سائنس کی مدد سے بھی اسلام کی حقانیت ثابت کی جا سکتی ہے بشرطیکہ خود مسلمان ان علوم میں مہارت پیدا کر لیں۔ اور اسی ذیل میں میں نے آپ کی خدمت میں یہ بات عرض کی کہ اگر سائنس حرام ہوتی یا سائنس اسلام کی دشمن ہوتی تو جو اسلام کے وارث تھے وہ سائنس کے دشمن ہوتے مگر آپ کو معلوم ہے کہ ان کے نزدیک سائنس کی تعلیم اتنی بڑی عبادت تھی کہ وہ مسجد رسولؐ میں بیٹھ کر سائنسی موضوعات کی تعلیم دیتے تھے۔

اسی ذیل میں میں نے آپ کی خدمت میں یہ بھی عرض کیا کہ پیغمبرؐ نے علیؑ ابن ابی طالب کے لیے ارشاد فرمایا اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَ عَلِيٌّ بَابُهَا میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اُس کا دروازہ ہیں۔ میں آپ کی خدمت میں عرض کر چکا ہوں کہ "شہر" کا لفظ استعمال ہی رسولؐ نے اس لیے کیا کہ

ان سے فقط کوئی ایک علم نہیں ملنے والا تھا بلکہ ہر علم پر علی ابن ابی طالب ایک طرح سے قدرت رکھتے تھے اور اسی ذیل میں میں نے ASTRONOMY سے متعلق چند باتیں عرض کی تھیں، اب آج بھی ایک آدھ بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔ جو خاص بات علیؑ ابن ابی طالبؑ کے جوابات میں نظر آتی ہے وہ معاذاللہ غالبؔ اور علیؑ کا کوئی مقابلہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ غالبؔ بھی ایک غلام علیؑ تھے بس یہی ایک نسبت ہے اس کے علاوہ تو کوئی اور نسبت نہیں ہے۔ جیسا کہ خود غالبؔ نے کہا ہے ؎

غالبؔ ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغول حق ہوں بندگیٔ بوترابؑ میں

تو غالبؔ کو اگر ناز تھا تو اپنی بندگی پر ناز تھا کہ میں بوترابؑ کی بندگی کا شکار ہوں اور زمرے میں ہوں تو بس یہی ایک نسبت تھی۔ لیکن بطور مثال آپ کے سامنے کہنا چاہتا ہوں۔ اردو زبان کے بہت اچھے اچھے شعرا گزرے ہیں۔ میرؔ کا کوئی جواب نہیں، انیسؔ کا کوئی جواب نہیں، ذوقؔ کا کوئی جواب نہیں، اقبالؔ کا کوئی جواب نہیں۔ یہ سب اساتذہ تھے لیکن نقادانِ ادب نے غالبؔ کے شعر کی خصوصیت جو بتائی ہے وہ یہ کہ غالبؔ کے اشعار پہلو دار ہوتے ہیں۔ پہلو دار یعنی ایک شعر کے مختلف پہلو تو جو صفت غالبؔ کے کلام میں پائی جاتی ہے وہی صفت بدرجہ اولیٰ بڑے STAGE کے اوپر اور انداز کے اوپر اور SCALE کے اوپر کلامِ علیؑ سے ملتی ہے کہ جواب ایک ہوتا تھا مگر مختلف سائنس اور علوم کے

اوپر روشنی پڑتی تھی یعنی وہ یہ بھی جانتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں جیسا کہ کل میں نے آپ کے سامنے عرض کیا کہ ایک جواب ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ MATHEMATICS علیؑ جانتے تھے ZOOLOGY علیؑ جانتے تھے اور ASTRONOMY بھی علیؑ جانتے تھے۔ ایک دوسرا جواب آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ پہلے ایک مرتبہ صلواۃ پڑھیں آپ حضرات۔ علیؑ ابن ابی طالب خطبہ دے رہے ہیں اور پھر ایک صاحب اٹھے، انھوں نے علیؑ بن ابی طالبؑ سے سوال کیا۔ اس واقعہ کا REFERANCE دیتے ہوئے کہ اُس دن آپ نے بتایا تھا کہ سورج کا فاصلہ زمین سے کتنا ہے؟ آج میں آپ سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ سورج کی ٹکیا جو ہمارے سر کے اوپر چمک رہی ہے یہ ٹکیا آپ دیکھیے، ملاحظہ کیجیے یہ ان کی KNOWLEDGE ہے اور یہ ان کا علم ہے اور یہ ان کی صلاحیت ہے۔ تو انھوں نے ارشاد فرمایا کہ یہ سورج کی ٹکیہ ہمارے سر کے اوپر چمک رہی ہے، یہ کتنی بڑی ہے؟ بتائیے اب ان کو کیسے بتائیں؟

اچھا اب جواب میں سوچنے کی ضرورت ہی نہیں COMPUTER بھی اتنی تیزی سے جواب نہ دے گا، دیکھیے یہ انسان کا بنایا ہوا COMPUTER بہت تیزی سے جواب دیتا ہے لیکن کمپیوٹر اور علیؑ میں تھوڑا سا فرق ہے۔ کمپیوٹر بہت تیز جواب دیتا ہے لیکن جب سوال پورا ہو جاتا ہے تب جواب دیتا ہے۔ کمپیوٹر یہ نہیں کرتا کہ سوال بھی بتائے اور جواب بھی بتا دے۔ مگر بس علیؑ ابن ابی طالب کی خصوصیت ہے، کسی نے زبان

ہلائی آپ نے کہا، اچھا تو یہ سوال کرنا چاہتا ہے۔ تیرا یہ سوال ہے اور اس کا یہ جواب ہے۔ تو اتمام حجت کرنا تھا خدا کو اپنے بندوں کے اوپر ذہانتِ علیؑ سے تو انھوں نے سوال کیا یہ سورج جو ہمارے اوپر چمک رہا ہے اس کا CIRCUMFRENCE کیا ہے؟ اب بتائیے جہاں کی زبان میں ہزار کے اوپر لفظ ہی نہیں وہاں لاکھوں کی بات کیسے سمجھائی جائے؟ سورج کا CIRCUMFRENCE ہے تقریباً ۲۷ لاکھ میل۔ تو پھر وہی دیکھیے جواب دیا ہے ایسا کہ کچھ ان کی سمجھ میں نہ آئے بعد والے سمجھ لیں، ان کی سمجھ میں نہ آئے، یہ وہیں گڑمڑا کے بیٹھ جائیں۔ مگر ہاں جب بعد والے اس کا تجزیہ کریں تو ان کی سمجھ میں آئے۔

توجہ فرمائیے گا۔ آپ نے ارشاد فرمایا حساب لگانا ہے تو اس طرح حساب لگالو۔ نوسو (۹۰۰) فرسخ کو ۹۰۰ سے ضرب دو، حاصل ضرب جو ہوگا وہ سورج کا CIRCUMFRENCE ہوگا اور یہ ان کے بس ہی کا نہ تھا۔ یہ تو ٹھنڈے ہو کے بیٹھ گئے۔ اب میں آپ سے کہتا ہوں، آپ حساب کرلیں۔ فرماتے ہیں کہ ۹۰۰ فرسخ کو ۹۰۰ سے ضرب کرلو جو حاصل ضرب ہوگا وہی سورج کا CIRCUMFRENCE ہوگا۔ تھوڑا سا آپ سمجھ لیں ورنہ آپ CONFUSED ہو جائیں گے۔

۹۰۰ × فرسخ ۹۰۰۔ ایک فرسخ ہوتا ہے تین ۳ عربی میل کا، انگلش میل جو ہمارے یہاں مروّج ہے یہ ہوتا ہے ۱۷۶۰ گز کا مگر عربی میل

ہوتا ہے ۲۰۰۰ گز کا۔ تو اب آپ سمجھ گئے ایک فرسخ تین میل کے برابر، ایک میل ۲۰۰۰ گز کے برابر، انگریزی میل ۱۷۶۰ گز کے برابر۔ اب ۹۰۰ فرسخ کو آپ ۹۰۰ سے ضرب کیجیے تو کتنا ہوگا، ۸۱۰۰۰۰ اس کا مطلب یہ کہ علیؑ نے فرمایا سورج کا رقبہ ہے ۸۱۰۰۰۰ فرسخ۔ ایک فرسخ ہے عربی تین میل کے برابر۔ لہٰذا پھر آپ اس کو مزید ۳ سے MULTIPLY کیجیے، آیا ۲۴ لاکھ ۳۰ ہزار سورج کا CIRCUMFRENCE ہے۔ سورج حسابِ علیؑ ابن ابی طالب کے مطابق ۲۴۳۰۰۰۰ عربی میل ہے ابھی میں نے عرض کیا آپ کے سامنے کہ عربی میل ۲۴۰ گز انگریزی میل سے زیادہ ہوتا ہے۔ یہ آپ ADD کر دیں تو یعنی وہی نکل آئے گا جو آج کی ASTRONOMY بتاتی ہے۔ (صلوٰۃ)

میں کیوں یہ باتیں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں کہ کچھ حضرات جو کچھ تھوڑا سا پڑھ لیتے ہیں وہ FULL KNOWLEDGE جو ہوتی ہے وہ بہت اچھی چیز ہوتی ہے اور HALF-KNOWLEDGE بہت خطرناک ہوتی ہے۔ تو ہمارے یہاں جن کو پوری KNOWLEDGE نہیں ہے اور کمیِ علم کے سبب سے خود اپنی جگہ اسلام کے بارے میں چند باتیں سوچ لیتے ہیں کہ اسلام تو پرانا مذہب ہے، دقیانوسی مذہب ہے اور اس زمانہ کے ساتھ نہیں چل سکتا ہے تو ان کے سامنے میں یہ گوہرہائے آبدار اسلام کے نکال کر پیش کر رہا ہوں۔ جس وقت کہ MARCO POLO دنیا کا سفر کر کے اپنے وطن آیا ہے اور اس نے آکر چین اور جاپان کے

قصے سنائے ہیں اور وہاں کی دولت اور وہاں کے خزانوں اور وہاں کے ہیرے جواہرات کا حال بیان کیا ہے تو لوگوں نے مذاق میں اس کو خطاب دے دیا تھا MR. MILLION یعنی لکھ پتی۔ یہ مذاق میں اس کا NICK NAME قرار دیا۔ وہ بیچارا کیا کرے، کیسے دکھائے چین و جاپان کیسے لے جائے ان کو اس زمانے میں۔ اب، وہ کہہ رہا ہے کہ وہاں... وہ لوگ اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ ان کو یقین ہی نہیں آرہا ہے۔ تب اس نے ایک روز دعوت کی، جو شرفاء و رؤسا تھے ان کو بلایا کھانے کے لیے۔ تاریخ کا واقعہ ہے، آپ لوگ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ سب آکر بیٹھ گئے تو مارکو پولو نے جو جاکٹ پہنے ہوئے تھا اس کو کھٹ سے یہاں سے یہاں تک کاٹا تو ڈھیروں ہیرے اور جواہرات تڑتڑ تڑتڑ میز پر گرنے لگے۔ تب لوگوں کو یقین آیا کہ واقعی جن ملکوں کو ہم غریب سمجھتے ہیں وہاں یہ جواہرات پائے جاتے ہیں۔ وہاں بھی یہ دولت پائی جاتی ہے۔

میں بھی اسلام کے ایک بعید ترین خزانے سے یہ گہر آبدار آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں کہ آپ کو ان جواہرات کا اندازہ ہو سکے کہ جو اسلام کے خزانے میں موجود ہے۔ اور اس کے بعد اس کے وطن والے یقین کرنے کے لیے مجبور ہو گئے کہ جہاں سے آرہا ہے واقعی بہت دولت مند ہے تو آپ کو کیوں یقین نہ ہونا چاہیے۔ میں بھی تو آپ کے سامنے یہ جواہرات پیش کر رہا ہوں جو اسلام کے خزانے

ہے، گندگی ہے، نجاست ہے، اگر وہاں سے باہر ہوئی تو جہاں جہاں پہنچے گی نجس کرتی جائے گی۔ اس لیے میں نے دعا کی یہ غلاظت، یہ نجاست پھیلے نہیں، اسی گڑھے میں بند رہے۔

یہ ہمارے چاہنے والے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ جہاں جہاں جائیں گے ہماری محبت کی شمعیں فروزاں کرتے جائیں گے۔ یہ پھیلیں گے تو ہمارا ذکر پھیلے گا، ہمارا نام پھیلے گا، ہمارا مشن پھیلے گا۔

دیکھیے امامؑ کی بات پوری ہوئی کہ نہیں۔ چند برس قبل کوئی سوچ نہ سکتا تھا کہ اس نئی دنیا میں کوئی حسینؑ کا نام بھی لے گا۔ مگر سارا امریکا میرا چھانا پڑا ہے۔ کون سا گوشہ وہ ہے اس سرزمین کا جہاں کسی نہ کسی عنوان سے ذکرِ حسینؑ نہ ہو رہا ہو۔ کہیں باقاعدہ امام باڑے اور عزاخانہ ہیں، یہ نہیں تو گھر میں اور ہر گھر میں ایک چھوٹا سا عزاخانہ۔ ہندوستان، پاکستان، ایران اور عرب ممالک کے نہ معلوم کتنے خطیب اور عالم مختلف زبانوں میں ذکرِ اہلِ بیتؑ میں مشغول۔ جہاں عالم نہ پہنچ سکا، خطیب نہ پہنچ سکا وہاں ویڈیو ٹیپ لگا دیا گیا۔ مجلسیں بھی ہو رہی ہیں، ماتم بھی ہو رہے ہیں۔ وہ دربار جو کربلا میں لٹا تھا آج امریکا کیا، دنیا کے ہر گوشہ و کنار میں وہ دربار سجا ہوا ہے، عزادار بیٹھے ہیں، سیدہؑ کو ان کے لال کا پرسہ دیا جا رہا ہے۔

اسے مثال دے کر سمجھاؤں۔ ایک تالاب کے بیچ میں ایک چھوٹا سا پتھر پھینک دیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہاں ایک چھوٹا سا دائرہ بنا، ایک ننھا سا سرکل بنا۔ پھر وہ دائرہ، وہ سرکل پھیلنا شروع ہوا اور دھیرے

سے نکال کر لایا ہوں تو اب آپ کو اندازہ ہو گا کہ رسولؐ نے اپنے حبس
بھائی کے لیے فرمایا تھا کہ اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَ عَلِیٌّ بَابُھَا۔ یہ رسولؐ
نے محبت علیؑ میں نہیں فرمایا تھا بلکہ انکشافِ حقیقت کرنا تھا، دنیا کو
بتانا تھا کہ مجھے اس بات کا موقع ہی نہ مل سکا کہ میرا علم دنیا میں ظاہر
ہو۔ مجھے تو جنگوں ہی سے چھٹی نہ ملی، مجھے تو سازشوں ہی سے سابقہ رہا،
تو میرا علم اگر تمھیں حاصل کرنا ہے تو میرا علم علی کے پاس ہے۔ علیؑ کے
پاس آنا اور علیؑ کے علم کا تم اندازہ کر کے یہ اندازہ کرنا کہ علیؑ کے پاس
جب اتنا علم ہے تو میرے پاس کتنا علم ہو گا؟ ایک ہی نور کے دو ٹکڑے
تھے برابر کے حصہ میں۔ خود ارشاد فرمایا کہ اَنَا وَ عَلِیٌّ مِنْ نُوْرٍ وَّاحِدٍ
میں اور علیؑ ایک نور کے دو حصہ ہیں۔ ایک مرتبہ صلوٰۃ بھیج دیں۔

اچھا تو اب آپ کیا سمجھتے ہیں کہ علیؑ خالی ASTRONOMY جانتے تھے،
تو دوسرا واقعہ سن لیجیے، دوسری سائنس آ جاتی ہے اس میں۔ علیؑ ابن
ابی طالبؑ کوفہ میں ہیں تختِ حکومت پر۔ دو خارجی دشمن علیؑ، دشمنوں کو
ہمیشہ اس بات کی فکر رہتی تھی کہ معاذ اللہ علیؑ کسی طرح ذلیل نہیں
ہوئے۔ اب دونوں نے بیٹھ کر کانا پھوسی شروع کی آپس میں کہ بھائی
کوئی ترکیب ایسی کی جائے کہ علیؑ کھسیانے ہو جائیں، علیؑ سے جواب
نہ بن پڑے۔ تو اب یہ کیسے ہو سکتا ہے، اس لیے کہ ہم اب سوال ہی
نہیں کر سکتے کہ وہاں تو علیؑ سوال بھی بتا دیتے ہیں۔ آخر ان دونوں نے
آپس میں طے کیا کہ علیؑ کی دو عادتیں ہیں، ان ہی کے درمیان پھانس لو۔ کہا

کہ کیا دو عادتیں ہیں۔ کہا کہ ایک عادت تو یہ ہے کہ علیؑ کبھی جواب کے لیے مہلت نہیں مانگتے کہ ٹھیک میں تم کو ایک گھنٹہ کے بعد بتادوں گا یا دو گھنٹہ کے بعد بتاؤں گا یا کل، پرسوں بتاؤں گا۔ تو ایک عادت یہ ہے ان کی کہ سوال ختم نہیں ہوتا اور جواب دے دیتے ہیں۔ اور دوسری عادت سنیے گا۔ دوسری عادت، برداشت کیجیے گا یہ دشمن کی گواہی ہے۔ پہلی عادت یہ کہ وہ مہلت نہیں مانگتے، سوال کیا اور جواب دیا اور دوسری عادت یہ کہ نماز اول ہی وقت پڑھتے ہیں، چاہے کچھ ہو جائے۔ آپ آخر وقت پر تو نہیں پڑھتے نماز، دیکھیے یہ سیرت ہے علیؑ کی جس کی دشمن شہادت دے رہا ہے کہ چاہے کچھ ہو جائے لیکن نماز علیؑ اوّل ہی وقت پڑھتے ہیں، بس اسی کے بیچ پھانس لو۔ کہا کہ وہ جواب تو ہر بات کا دے دیں گے لیکن عین اس وقت پر جب علیؑ نماز کی تیاری کر رہے ہوں اور نماز کا وقت آیا جاتا ہو تو چل کر علیؑ سے ایسا سوال کرو جواب تو وہ دے دیں گے لیکن جواب اتنا LENGTHY ہو اُس کا کہ فضیلت کا وقت نکل جائے۔

اچھا میں کہتا ہوں بھائی اگر فضیلت کا وقت نکل بھی جائے تو یہ کون سا بڑا کارنامہ آپ نے انجام دے دیا۔ مگر جب آدمی پر حسد اور جہالت کے پردے بہت زیادہ پڑ جاتے ہیں تو وہ اندھا ہو جاتا ہے تو کہا بھائی ہم یہ سوال کریں گے، جواب تو علیؑ دیں گے مگر ظاہر ہے کہ یہ جواب گھنٹہ بھر سے کم کا نہیں ہوگا تو نماز کی فضیلت کا وقت ہی نکل جائے گا۔ آئیے دیکھا علیؑ وضو کر رہے ہیں نماز پڑھنے کے لیے۔ آکر سامنے

کھڑے ہو گئے، کہا یا علیؑ! آپ سے کچھ سوال کرنا ہے۔ اب بتائیے یہ سوال کا وقت ہے کہ آدمی وضو کر رہا ہے نماز پڑھنے کے لیے اور آپ سوال کر رہے ہیں۔ یہ نہیں کہا کہ پہلے نماز پڑھ لیں بعد میں سوال کر لینا۔ کہا کیا سوال ہے تمھارا؟ کہا کہ ہمارا یہ سوال ہے یا علیؑ! یہ بتائیے کہ دنیا میں جو لاکھوں جانور پائے جاتے ہیں وہ دو طرح کے ہوتے ہیں، ان میں سے کون سے جانور ہیں جو انڈے دیتے ہیں اور کون سے جانور ہیں جو بچے دیتے ہیں؟ گنوائیے، ایک نماز کیا ساری نماز کا وقت نکل جائے گا، کون جانور انڈے دیتے ہیں کون جانور بچے دیتے ہیں۔ معلوم نہیں ہے، فرض کیجیے آپ EXPERT بھی ہیں ZOOLOGY کے، گنوائیے۔ بس دیکھیے جو علیؑ کو پھانسنے آیا وہ خود پھنس کے چلا جائے گا۔ بس یوں ہی وضو کر رہے ہیں بس وضو کرتے کرتے جواب دیا، دیکھو میں تم کو فارمولا بتائے دیتا ہوں FORMULA یہ ہے کہ جن جانوروں کے کان تم کو باہر دکھائی دیں تم سمجھ لو کہ وہ بچے دیتے ہیں اور جن جانوروں کے کان تم کو اندر دکھائی دیں تم سمجھ لو کہ وہ انڈے دیتے ہیں۔ تم سال بھر دیکھتے رہو کہ یہ فارمولا ٹوٹتا ہے کہ نہیں۔ اگر ٹوٹ جائے تو آکر بتانا۔ منھ لٹکا کر چلے آئے وہاں سے۔

اب ظاہر ہے دیکھا ہو گا کہ کتنی علیؑ کی معلومات ہے۔ ڈھونڈا ہو گا کہ کوئی جانور ایسا مل جائے کہ جس کے کان باہر ہوں اور انڈا دیتا ہو تو شاید اپنے ہی کان ٹٹول کر دیکھتے ہوں گے شاید یہی ایک جانور ہے؟ باقی تو کوئی جانور ملے گا نہیں کہ کان باہر ہوں اور وہ انڈے بھی دیتا ہو۔

تھک کر ہار کر بیٹھ گئے۔ مگر بے غیرتی کی عمر دراز کہ گئے تھے ان کو پریشان کرنے اور انھوں نے خود ہم کو ہی پریشان کر کے رکھ دیا۔ اب ڈھونڈتے پھر رہے ہیں جانوروں کو پھر بھی ہار نہیں مانی۔ پھر اسی وقت پہنچے، وضو کے وقت۔ کہا یا علیؑ! میں نے بہت ڈھونڈا مگر یا علیؑ جو بات آپ نے کہی تھی بالکل صحیح نکلی۔ کہا اب یہ بتایئے، کہا اب کیا سوال لے کے آئے ہو؟ کہا یہ بتایئے کہ کون سے جانور وہ ہیں جو اپنے بچوں کو دودھ پلاتے ہیں اور کون سے جانور ہیں جو اپنے بچوں کو دانا بھراتے ہیں۔ کہا اس کا بھی فامولا سن لو، جو غذا چبا کر کھاتا ہے وہ بچوں کو دودھ پلاتا ہے اور جو دانا ایسے ہی نگل لیتا ہے وہ اپنے بچوں کو بھرا دیتا ہے۔ جاؤ دیکھو اگر فارمولا ٹوٹے تمھارے علم کے مطابق تو مجھے آکر بتانا۔

اسلام جن ہاتھوں کے سپرد کیا گیا تھا، جن ہاتھوں میں دیا گیا تھا وہ ہاتھ تھے اور وہ ذہن تھے اور وہ سینے تھے کہ جہاں علم کے سمندر موجیں مارتے تھے اور یہ اس لیے کہ اسلام علم کا مذہب ہے، اسلام جہالت کا مذہب نہیں ہے اور نہ جاہلوں کا مذہب ہے۔

بس برادرانِ عزیز! اب مجھے پھر ایک ضروری بات عرض کرنا ہے، اس لیے کل مجھ سے اور جو آپ مجھ سے فرمائش کرتے رہیے گا، وعدہ کیا ہے کہ میں پوری کرتا رہوں گا۔ اچھا اب یہ علم ہے علیؑ کے پاس، تو کیا علیؑ رخصت ہو گئے تو علم رخصت ہو گیا؟ ہرگز نہیں۔ علیؑ ختم ہوئے تو حسنؑ علیؑ بنے، حسنؑ اُٹھے تو حسینؑ علیؑ بنے، حسینؑ اٹھے تو زین العابدینؑ

علیؑ بنے، زین العابدینؑ اٹھے تو محمد باقرؑ، محمد باقرؑ اٹھے تو جعفر صادقؑ، جعفر صادقؑ اٹھے تو موسیٰ کاظمؑ، موسیٰ کاظمؑ اٹھے تو علی رضاؑ، علی رضاؑ اٹھے تو محمد تقیؑ، محمد تقیؑ اٹھے تو علی نقیؑ، علی نقیؑ اُٹھے تو حسن عسکریؑ اور حسن عسکریؑ اُٹھے تو وہ جو کہ ہمارا آپ کا امامؑ ہے۔ (صلواۃ) اور سب کا مرتبہ ایک، سب کا علم ایک، سب کی طہارت ایک۔ اس لیے کہ جو مرکز طہارت تھا، اس نے کہہ دیا کہ اَوَّلُنَا مُحَمَّدٌ وَ اَوْسَطُنَا مُحَمَّدٌ وَ آخِرُنَا مُحَمَّدٌ وَ کُلُّنَا مُحَمَّدٌ ہمارا اوّل بھی محمدؐ، ہمارا اوسط بھی محمدؐ اور ہمارا آخر بھی محمدؐ، ہم سب کے سب محمدؐ ہی محمدؐ ہیں۔ (صلواۃ)

اچھا تو اب وہ ہیں جو غیبت کے پردے میں ہم کو دیکھ رہے ہیں، وہ ہم کو دیکھ رہے مگر ہم ان کو نہیں دیکھ سکتے تو کیا کیا جائے، اسلام تو ایک رواں دواں مذہب ہے جو قیامت تک چلتا رہے گا اور ہر روز ایک سے ایک نئے مسائل کا سامنا ہے تو کیا کیا جائے؟

میں کسی پر کوئی تنقید نہیں کرتا، کسی کو CRITICISE نہیں، آپ میرا اندازِ بیان جانتے ہیں۔ سب میرے بھائی ہیں لیکن بہر حال آپ جانتے ہیں کہ اسلام میں دو بڑے فرقے ہیں، ایک شیعہ اور ایک سُنّی۔ میں فقہی بات آپ سے بیان کر رہا ہوں، کوئی مناظرہ نہیں پڑھ رہا ہوں۔ تو ان کا خیال یہ کہ امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل یہ چار امام ہیں۔ دیکھیے ہمارے یہاں امام اور ان کے یہاں امام میں تھوڑا سا فرق ہے۔ ہمارے یہاں امام کہا جاتا ہے بطور اصطلاح، بطور

TECHNICAL TERM تو اس سے صرف بارہ[۱۲] مراد ہوتے ہیں۔ اُن کے یہاں امام گویا کہ جو مجتہد ہوتا ہے، صاحب فتویٰ اس کو ان کے یہاں امام کہتے ہیں. اُن کے صاحب فتویٰ بس چار گزرے ہیں۔ ایک امام ابو حنیفہ ایک امام مالک ایک امام احمد بن حنبل اور ایک امام شافعی اور ان کے اوپر اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا۔ یعنی اب کسی انسان کو شرعی مسائل میں RESEARCH کرنے کا حق حاصل نہیں۔ FINALLY CLOSED ۔ اب اگر تم کو پیروی کرنا ہے انھیں چاروں میں سے کسی کی پیروی کر لو، چاہے جس کی پیروی کر لو نجات تم کو مل جائے گی۔

اب کیا کیا جائے، روز روز نئے مسائل آرہے ہیں، چیزیں وہ آرہی ہیں جس کا اس زمانہ میں وجود ہی نہ تھا۔ تو جب اس زمانہ میں وجود ہی نہیں تھا تو وہ ان چیزوں کے بارے میں بیچارے فتویٰ کیا دیتے۔ اب کیا کیا جائے؟ اسی لیے اب ہمارے برادران اہل سنت کے بھی مختلف گوشوں سے یہ صدائیں بلند ہونے لگی ہیں کہ ہم نے اجتہاد کا دروازہ بند کرکے غلطی کی تھی، اجتہاد کا دروازہ کھلنا چاہیے تو ان جملوں سے COMPARISON آپ کے سامنے کرنا تھا، اس لیے آپ کے سامنے عرض کیا یہ ہمارے یہاں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ ہر وہ شخص کہ جس کو عربی آتی ہے، جو قرآن پر عبور رکھتا ہے، جو حدیث پر نظر رکھتا ہے اور تفسیر سے آگاہ ہے، جو تاویل سے آگاہ ہے، جو ناسخ سے آگاہ ہے، جو منسوخ سے آگاہ ہے، جو عربی زبان کی باریکیوں

سے آگاہ ہے، جو حدیث کی مختلف اقسام سے آگاہ ہے، اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ قرآن، حدیث، ائمہ طاہرینؑ کے اقوال، عقل اور اجماع یہ چار چیزیں ہیں کتاب، سنت، عقل اور اجماع ان کی روشنی میں نئے مسائل کے سلسلہ میں اجتہاد کرتا رہے RESEARCH کرتا رہے اور ریسرچ کے نتیجہ پر جب پہنچ جائے تو اس کو پھر تقلید کی اجازت نہیں ہے۔

بس یہی آج تقلید کا مسئلہ آپ کے سامنے پیش کر دوں۔ دیکھیے اسلام کہتا ہے کہ انسان کی تین قسمیں، CATAGORIES ہیں۔ ایک انسان وہ ہے جو خود مجتہد ہے۔ مجتہد وہ کہ جو اصولِ شرعی کی روشنی میں مسائل کو سمجھ سکتا ہے، اس کے اوپر تقلید حرام ہے۔ وہ خود ریسرچ کرے اور اپنے نتیجہ تک پہنچے۔ اگر بعض مسائل میں وہ نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتا ہے تو اس میں وہ تقلید کرے۔ اگر ہر مسئلہ میں وہ نتیجہ تک پہنچ سکتا ہے تو وہ خود مجتہد ہے، اسے کسی سے بھی کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ایک وہ انسان ہے جو اتنا زبردست عالم ہے کہ ہر مسئلہ شرعی کو بغیر کسی کی رائے لیے ہوئے اپنی جگہ پر استنباط کر کے نتیجہ نکال سکتا ہے۔ یہ ہوتا ہے اَعلمِ وقت اور سب سے بڑا مجتہد۔ اور ایک ہیں ہم اور آپ جن کو کچھ نہیں آتا، عربی بھی نہیں آتی، حدیث بھی نہیں آتی، قرآن بھی نہیں آتا، اصولِ شریعت سے واقفیت بھی نہیں ہے۔ تو اب ہم کو امامؑ نے حکم دیا، امامؑ نے فرمایا، دیکھو! تمہارا فریضہ ہے کہ تم اس کی تقلید کرو جو جانتا ہے۔

تقلید کے مسئلے کی نزاکت یہاں پر سمجھ لیجیے۔ دیکھیے بھائی تقلید کا مسئلہ یہ ہے کہ اگر آپ کے اعمال سب کے سب درست بھی ہیں بالفرض، اولاً تو ہوں گے ہی نہیں سب کے سب درست۔ لیکن اگر ہیں بھی نماز آپ بالکل صحیح پڑھ رہے ہیں، روزہ آپ بالکل صحیح رکھ رہے ہیں، حج آپ بالکل صحیح کر رہے ہیں، زکوٰۃ آپ صحیح طریقے سے ادا کر رہے ہیں مگر آپ کسی کے مقلد نہیں ہیں تو اعمال آپ کے صحیح ہیں مگر VALID مطالبہ قانون کے مطابق نہیں ہیں، اعمال آپ کے صحیح ہیں مگر قابل قبول نہیں ہیں۔ سمجھ گئے بات! یعنی نماز بہت اہم، اس سے کوئی مسلمان انکار نہیں کر سکتا، اس سے انکار کرنے والا اسلام سے خارج۔ روزہ بہت اہم ہے، حج بہت اہم، زکوٰۃ بہت اہم، خمس بہت اہم ہے۔ یہ سب چیزیں بہت اہم ہیں۔ مگر جو اہمیت تقلید کو حاصل ہے وہ کسی کو نہیں ہے۔ اس کی مثال دے دوں میں آپ کے سامنے۔

آپ لکھنؤ میں تشریف لائے۔ میں ایک مثال کے طور پر کہہ رہا ہوں میں ایک بہت غریب آدمی ہوں مگر جو ہو سکتا ہے وہ بہتر سے بہتر آپ کی دعوت کا انتظام کیا میں نے۔ ایک میز سجادی، میز پر جناب کباب بھی رکھے ہوئے ہیں، نرگسی کوفتے بھی رکھے ہوئے ہیں، بریانی بھی ہے، پلاؤ بھی رکھا ہوا ہے، شیرمالیں بھی ہیں، قورمہ بھی رکھا ہوا ہے، دس طرح کی چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ وقت آئے گا تو انشاء اللہ رہیں گی کبھی نہیں۔ خالی مثال کے طور پر کہہ رہا ہوں یہ سب چیزیں رکھی ہوئی ہیں اور آپ

تشریف فرما ہیں اور ارادہ کر رہے ہیں کہ کھانا آپ نوش فرمائیں۔ اتفاق سے میرا ایک بچہ ادھر سے گزرا اور اس نے کہنی ماری اور ایک پلیٹ سالن کی نیچے گر گئی۔ ٹھیک ہے، ایک چیز کم ہو گئی لیکن اور چیزیں تو ہیں، آپ کھالیں گے۔ ایک بچہ اور گزرا اور اس نے کسی دوسری چیز پر دھکا مار دیا، لیجیے وہ بھی پلیٹ گر گئی۔ ٹھیک ہے ایک سالن کا اور نقصان ہو گیا، ایک پلیٹ بھی ٹوٹ گئی لیکن بھوکے تو آپ نہیں رہ جائیں گے۔ لیکن خدا نخواستہ کوئی ایسا شریف بچہ آیا کہ وہ میز کے نیچے گھس گیا اور اس نے میز ہی پوری اُلٹ دی تو اب آپ کیا کھائیے گا۔ جتنی چیزیں تھیں سب گئیں، جتنے سالن تھے وہ بھی گئے، جتنی دالیں تھیں وہ بھی گئیں، شیر مالیں بھی گئیں، چاول بھی گئے، چٹنیاں بھی گئیں، سب کی سب ختم۔ تو اسلام کی جتنی عبادتیں ہیں سب پلیٹوں میں سجی ہیں آپ کو جنت تک پہنچانے کے لیے۔ مگر جس میز پر یہ ساری پلیٹیں سجی ہوئی ہیں اس کا نام ہے تقلید۔ اگر میز الٹ گئی تو پوری دعوت گئی، کچھ نہیں رہ جائے گا۔ تقلید آپ کے لیے حد سے زیادہ ضروری ہے۔ تقلید پیری مریدی کا نام نہیں ہے۔

ایک بات جیسا کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ تقلید سے پہلے دو رکعت نماز پڑھنا پڑتی ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ دو رکعت نہیں صاحب! آپ دو سو رکعت نماز پڑھ ڈالیے، اللہ آپ کو ثواب دے گا۔ لیکن تقلید میں ایسی کوئی شرط نہیں ہے۔ غسل کی بھی شرط نہیں ہے، وضو کی بھی شرط نہیں ہے، کوئی فیس بھی اس کی نہیں ہے یہاں تک کہ آپ کو اُٹھیں

اطلاع دینے کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ ہم آپ کے مقلِّد ہیں۔ اس وقت دو مقلَّد ہیں یعنی دو مجتہد ہیں جن کی تقلید کی جاسکتی ہے۔ ایک آیۃ اللہ خوئی نجف میں، ایک آیۃ اللہ خمینی ایران میں۔ آپ چاہے اُن کی تقلید کریں چاہے اِن کی مگر آپ کو تقلید کرنا ضروری ہے۔

تقلید کے معنی یہ کہ آپ ان کا عملیہ اٹھا لیجیے اور اٹھانے کے بعد نماز کے متعلق، روزے کے متعلق، حج کے متعلق، زکوٰۃ کے متعلق، تجارت کے متعلق، زراعت کے متعلق، قصر کے متعلق، جماعت کے متعلق، سروس کے متعلق، بینکنگ کے متعلق، بزنس کے متعلق جو ان کے احکام ہیں اُس کی آپ پابندی کریں، یہ ہی ہے تقلید۔ تقلید صرف اصولِ دین میں نہیں۔ اُصولِ دین یعنی اُن کے کہنے سے آپ اللہ کو نہ مانیں۔ اسلام کی بلندی کو آپ ذرا دیکھیں، ان کے کہنے سے بھی آپ خدا کو خدا نہ مانیں۔ اگر ان کے کہنے سے آپ نے خدا کو خدا مانا تو خدا کہے گا کہ مجھے قبول نہیں۔ ان کے کہنے سے آپ قرآن کو الہامی کتاب نہ مانیں۔ ان کے کہنے سے آپ رسولؐ کی رسالت اور علیؑ کی امامت کے قائل نہ ہوں۔ وہ تو خود آپ کو سمجھنا ہے لیکن باقی جتنی عملی PRACTICAL چیزیں ہیں ان سب میں اگر آپ تقلید نہیں کریں گے تو بھائی آپ کے اعمال کا قبول ہونا مشکل ہو جائے گا۔

بس اب تقلید کا فائدہ کیا ہے، میں نے عرض کر دیا آپ کے سامنے کہ تقلید خالی روزے نماز میں نہیں ہے پوری عملی زندگی سے متعلق ہے۔ تقلید چاہے وہ بزنس ہو چاہے وہ BANKING بینکنگ ہو چاہے وہ

دھیرے اس نے پورے تالاب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

کربلا میں لعینوں نے بہت روکنا چاہا، نیزوں کی نوکوں سے روکنا چاہا، تازیانوں سے روکنا چاہا، مگر حسینؑ کی دکھیاری بہن زینبؑ کی آنکھ سے بھائی کے غم میں آنسو کا قطرہ ٹپک کر رہا۔ کربلا میں یہ آنسو ٹپکا، آگے بڑھ کر کوفہ پہنچا، وہاں سے آگے بڑھا شام تک آیا وہاں سے پلٹا مدینہ کو رُلا دیا پھر وہاں سے پھیلا تو دھیرے دھیرے پوری دنیا کو اپنے دائرہ میں لے لیا۔

یاد رکھیے دشمن جتنی کوشش کریں یہ غم ختم نہ ہوگا۔ یہ غم ایک قادر مطلق کا وعدہ ہے ایک دکھیاری ماں سے۔ اللہ اس غم کا محافظ ہے اور جس غم کا محافظ وہ ہو جائے اس غم کے دشمن بھی اس غم میں شریک ہو جاتے ہیں۔ یہ مشیت کا صبر ہے۔ دیکھیے نا! ہم حسینؑ کا غم مناتے ہیں اور اُنھیں اسی غم کا غم کھائے جاتا ہے۔ ہماری شب بیداریاں حسینؑ کے غم میں اور ان کی راتوں کی جاگ اس فکر و اندوہ میں کہ ہائے اس غم کو کیسے مٹائیں جتنا مٹانا چاہتے ہیں اسی قدر یہ بڑھتا جاتا ہے۔

بہر حال آج اس عزاخانہ کی پہلی مجلس ہے۔ ارشاد خداوند عالم ہے کہ کوئی بھی دور ہو، کوئی بھی زمانہ ہو، کیسا ہی ماحول کیوں نہ ہو، اسلام کو ہاتھ سے نہ جانے دینا ورنہ ہمیں بتانے کی ضرورت نہ رہے گی آخرت کی منزل آتے آتے تمھیں خود معلوم ہو جائے گا کہ اسلام کو چھوڑ کر تم نے کسی اور کا نہیں، اپنا ہی نقصان کیا تھا۔

آج کی اس مجلس میں سب سے پہلے کچھ باتیں قرآن کے متعلق۔ ہمارا

POLITICS ہو چکا ہے INTERNATIONAL POLITICS ۔ اس لیے کہ اسلام میں سیاست، جس طرح کہ اسلام اور سائنس میں کوئی دشمنی نہیں ہے بلکہ سائنس اسلام کا جزو ہے۔ اسی طرح سے اسلام و سیاست میں بھی کوئی دوری نہیں ہے۔ سیاست بھی اسلام کا جزو ہے مگر وہ سیاست نہیں جو آج بہت سے ملکوں میں پھیلی ہوئی ہے، وہ سیاست کہ جو انسانیت کی روح ہو۔ آج کی سیاست ابن الوقتی کا نام ہے، آج کی سیاست غلط و عدوں کا نام ہے، آج کی سیاست دھوکا دہی کا نام ہے۔ اسلام سیاست کو عبادت بنا دیتا ہے، اتنا پاکیزہ بنا دیتا ہے، سیاست اسلام کا جزو ہے۔

اب میں آپ کے سامنے ایرانی انقلاب پر کوئی بات نہیں کہنا چاہتا۔ ممکن ہے یہ جو اتنے سارے دوست یہاں پر تشریف فرما ہیں ان میں کوئی ایران کے انقلاب کا موافق ہو کوئی مخالف ہو تو میں کسی کی خاطر شکنی نہیں کرنا چاہتا۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ جو حضرات مخالف ہیں، ان کی مخالفت بھی بجا ہے اس لیے کہ جس CHANNEL سے ان کو FEED ہو رہا ہے اگر مجھ کو بھی FEED ہوتا تو میں بھی مخالف ہوتا تو میں ان پر کوئی الزام نہیں لگاتا، میں ان کی شان میں کوئی گستاخی نہیں کرنا چاہتا کیونکہ ظاہر ہے کہ آزادیٔ رائے کا زمانہ ہے۔ ہر شخص اپنی مرضی کا مالک ہے، مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں لیکن دیکھیے واقعات کے سلسلے میں مجبوری کی بات ہے۔ میں اگر نظریہ کسی کو PRESS کروں تو ٹھیک ہے، وہ شکوہ شکایت کی بات ہو جائے۔ میں تو تقلید کے سلسلے میں ایک واقعہ ہے

جو بیان کر رہا ہوں۔ میں تو خالی آپ کو تقلید کا زور دکھا رہا ہوں کہ تقلید اگر پوری قوم کرنے لگے کسی ایک کی تو اس کا اثر کیا ہوتا ہے۔

۱۱ر فروری ۱۹۷۹ء کو ایران میں شاہ کی حکومت ہے اور تہران کی ملٹری کے گورنر جنرل نے ۱۰ بجے یہ اعلان کر دیا کہ آج ۴ بجے کے بعد کوئی ایک آدمی بھی اگر تہران کی سڑک پر دکھائی دے گا تو اسے گولی سے اڑا دیا جائے گا اور گولی سے اڑا دینے والا وہ جو ہزاروں کو گولی سے اڑا چکا ہے، یہ نہیں کہ خالی خولی کہہ رہا ہے۔ اس نے یہ اعلان کیا اور آیۃ اللہ خمینی نے ایرانیوں کو اعلم کی حیثیت سے یہ فتویٰ دیا کہ آج کے دن ۴ بجے تہران کے ہر انسان کو چاہے وہ مرد ہو چاہے وہ عورت ہو چاہے بوڑھا ہو چاہے جوان ہو، سڑک پر آجانا واجب ہے۔ دیکھا یہ فرق، اس نے کہا ایک بھی آدمی دکھائی نہ دے، دکھائی دے گا تو گولی سے اڑا دیا جائے گا۔ اور ان کا فتویٰ یہ کہ ایران کا ہر شہری آج سڑک کے اوپر آجائے۔ ایرانی تقلید کے زور سے واقفیت رکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ نائبِ امامؑ کا حکم امامؑ کا حکم ہے اور امامؑ نے کہا ہے اَلرَّآدُّ عَلَیۡهِمۡ کَالرَّآدِّ عَلَیۡنَا جس نے ان کی بات ٹالی اس نے ہماری بات ٹال دی۔

نتیجہ کیا ہوا کہ ۴ بجے، ٹھیک ۴ بجے تہران کی سڑکوں کے اوپر تہران کی چالیس لاکھ آبادی نکل آئی۔ عورتیں بھی، مرد بھی، بوڑھے بھی، جوان بھی، سب کے سب آکر بیٹھ گئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۱ر فروری ۱۹۷۹ء کو ایران میں شاہ کی حکومت تھی اور ۱۲ر فروری ۱۹۷۹ء کو ایران میں

انقلاب آچکا تھا۔

توجہ فرمائی آپ نے۔ یہ ہے تقلید کا زور۔ میں ایران پر کوئی تقریر آپ کے سامنے نہیں کر رہا ہوں مگر میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اگر چالیس لاکھ آدمی ایک مجتہدِ وقت کے فتوے پر عمل کر کے انقلاب لا سکتے ہیں تو اگر دس کروڑ شیعہ ہم آواز ہو جائیں تو کیا ہم ایک SUPER POWER نہیں بن سکتے، ہم بھی SUPER POWER بن سکتے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ آپ کو اختیار ہے کہ چاہے آیت اللہ خوئی کی تقلید کریں اور چاہے آیۃ اللہ خمینی کی تقلید کریں لیکن جب تک کہ آپ تقلید نہیں کریں گے، آپ کے اعمال قبول نہیں ہوں گے۔ اور یاد رکھیے کہ یہی تقلید وہ ہے کہ جس سے DISCIPLINE پیدا ہوتا ہے۔ ایک امام جو وہ کہہ دے، ہمیں اسی کے آگے سر جھکانا ہے اور اسی کی معراج کمال ہمیں کربلا کے میدان میں ملتی ہے وہ DISCIPLINE اور وہ اتحاد اور وہ جذبۂ سرفروشی جو کربلا کے میدان میں دکھائی دیتا تھا، وہ کیوں تھا؟ وہ صرف ایک امامؑ کی اطاعت کا نتیجہ تھا۔ امامؑ کے چشم و ابرو کے اشارے پر اصحابِ حسینؑ آگے بڑھ رہے تھے، امامؑ کو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

بس برادرانِ عزیز! اب بس چند جملے مصائب کے اور آپ کی زحمتیں ختم کرنا چاہتا ہوں۔ آج کی شب آپ شبیہِ پیغمبرؐ ام لیلیٰ کی جان علی اکبرؑ کا حال سنا کرتے ہیں لیکن بہر حال مجھ سے فرمائش ہے کہ میں علی اکبرؑ کے ساتھ ساتھ قمر بنی ہاشم حضرت ابوالفضل العباسؑ کے

مصائب سے متعلق بھی چند جملے عرض کر دوں۔ وہ تفصیلی مصائب تو انشاءاللہ میں جو مناسب تاریخ ہو گی اس پر عرض کروں گا لیکن چوں کہ مجھ سے فرمائش ہے اس لیے چند جملے عرض کرنا چاہتا ہوں۔ مدینہ میں جس وقت کہ حضرت علیؑ اکبر اور حضرت عباسؑ ساتھ ساتھ نکل جاتے تھے تو تاریخ نے یہ تصریح کی ہے کہ دیکھنے والے اپنے کاروبار کو بھول جایا کرتے تھے ان دونوں چاند کے ٹکڑوں میں اور بہر حال یوں تو ہر شہید کا ہم پر احسان ہے، پوری ملت کے اوپر احسان ہے لیکن بس یہ آپ یاد رکھیے کہ ہر ایک کی شفاعت انشاءاللہ ہم کو حاصل ہو گی مگر عباسؑ کا خصوصی حق ہے شفاعت کا۔

بس ایک اشارہ کر دوں۔ جب حشر کے میدان میں فاطمہ زہرا آئیں گی اپنے سر کے بال کھولے ہوئے اور رسولؐ فرمائیں گے بیٹی بیٹی! یہ فریاد و فغاں کا دن نہیں ہے تو شاہزادی کہیں گی بابا! میں تو عرش اعظم کا پایہ پکڑ کے فریاد کرنے آئی ہوں کہ کیا میں نے اپنے بچوں کو فاقوں پر فاقے کر کے اسی لیے پالا تھا کہ آپ کی امت انھیں تین دن کا بھوکا اور پیاسا ذبح کر دے؟ تو حضورؐ ارشاد فرمائیں گے، بیٹی یہ بتا کہ تو امت کے لیے سامانِ شفاعت کیا لے کے آئی ہے؟ تو اس وقت، روایت بتاتی ہے کہ شاہزادیؑ اپنے بازو پھیلا دیں گی تو رسولؐ دیکھیں گے کہ دامانِ فاطمہؑ میں دو کٹے ہوئے ہاتھ ہیں۔ پوچھیں گے کہ بچی یہ کس کے کٹے ہوئے ہاتھ ہیں؟ شاہزادیؑ جواب دیں گی کہ بابا آپ نے نہیں

پہچانا، یہ میرے بچے عباسؑ کے کٹے ہوئے ہاتھ ہیں جس کو امت کے لیے سامانِ شفاعت بنا کر لائی ہوں۔

بس عزادارانِ حسینؑ! جب سقائے سکینہ ابوالفضل العباسؑ بارگاہِ الٰہی میں شہادت پیش کر چکے تو اب حسینؑ کے یہاں سناٹا ہو گیا۔ اب اور کوئی نہیں، صرف ایک جوان بیٹا جس کا نام علی اکبرؑ اور اب یہ بیٹا بھی آگے بڑھا۔ کہا بابا! بس اب مجھے بھی مرنے کی اجازت دے دیجیے۔ حسینؑ نے سر جھکایا، کہا بیٹا! میں تمھیں کیا اجازت دوں، تم کو تو زینبؑ نے پالا ہے، جاؤ جا کر پھوپھی سے پہلے اجازت لے لو جاؤ اور جا کر اپنی ماں سے اجازت لے لو۔

عزادارانِ حسینؑ! ذرا آپ غور کریں کہ وہ زینبؑ جس نے اپنے بچوں سے بڑھ کے علی اکبرؑ کو پالا تھا، جب وہی شہزادہ آیا ہوگا پھوپھی کے پاس کہ پھوپھی! اب بس مجھے مرنے کی اجازت دے دیجیے تو زینبؑ کے دل پر کیا گزری ہوگی؟ اور یہاں بہت سی بیبیاں بیٹھی ہوئی ہیں، ان میں بہت سی صاحبِ اولاد بھی ہوں گی، ذرا سوچیں کہ اگر کسی کا جوان بیٹا آکر یہ کہے کہ ماں مجھے مرنے کی اجازت دے دیجیے تو ماں کے دل پر کیا گزرے گی؟ بس اب میں نے تفصیل تو نہیں دیکھی۔ میں نے آپ کے سامنے کئی مرتبہ نام لیا ہے حمید ابن مسلم کا، جو دشمن کی فوج کا ایک سپاہی تھا، ذرا سا کچھ نرم تھا اس کا دل۔ تو اس نے خود کوئی عملی اقدام نہیں کیا اور اسی نے بعد میں کربلا کے سارے حالات لکھے ہیں، تو یہ کہتا ہے کہ جب علی اکبرؑ خیمے

کے اندر چلے گئے اور بہت دیر ہو رہی تھی اور علی اکبرؑ خیمے کے اندر سے نہیں نکل رہے تھے تو میری نظر خیمے کے پردے پر جمی ہوئی تھی اور میں یہ دیکھ رہا تھا کہ بار بار خیمے کا پردہ اٹھتا ہے اور گرتا ہے، اٹھتا ہے اور گرتا ہے، جب میں نے غور سے دیکھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے، یہ پردہ کبھی اٹھتا ہے کبھی گرتا ہے تو میں نے دیکھا کہ جب علی اکبرؑ خیمے سے نکلنا چاہتے ہیں تو سیدانیاں گلے سے لپٹ جاتی ہیں، چھوٹے چھوٹے بچے قدموں سے لپٹ جاتے ہیں اور شہزادے کو واپس خیمے میں لے جاتے ہیں۔

عزادارانِ حسینؑ! آپ سمجھتے ہیں کہ علیؑ اکبر کی شجاعت یہ تھی کہ لشکرِ یزیدی کی صفوں کو اُلٹ دیا اور میں سمجھتا ہوں کہ اصل شجاعت یہ تھی کہ سیدانیوں کی صفوں کے بیچ سے نکل آئے۔ ان سیدانیوں کی صفوں سے نکلنا خدا کی قسم اس سے زیادہ مشکل تھا جتنا دشمنوں کی صفوں کو توڑ ڈالنا۔ بہرحال علی اکبرؑ کے لیے یہ مشکل تھا لیکن میں نہیں کہہ سکتا، اب خیمے کے اندر کی بات ہے۔ کس طرح ماں کو سمجھایا؟ کس طرح پھوپھی کو سمجھایا، سکینہ دامن سے لپٹ گئی ہو گی تو اس سے کیا کہا، بہرحال نکل آئے باہر اور امامؑ کو دیکھا۔ امامؑ نے کہا بیٹا رخصت ہو لیے؟ کہا جی ہاں بابا! سب سے رخصت ہو لیا۔ پھوپھی سے بھی اجازت لے لی، ماں سے بھی اجازت لے لی۔ اب حسینؑ کیا کریں، گھوڑے پر سوار ہوئے چلے تو حسینؑ نے فرمایا: اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ عَلٰى هٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ پالنے والے! گواہ رہنا کہ اب وہ بچہ مرنے کو جاتا ہے کہ جو صورت میں،

سیرت میں، رفتار میں، گفتار میں میرے نانا کی تصویر تھا۔ جب میرا دل چاہتا تھا نانا کی زیارت کو تو میں علی اکبرؑ کی صورت دیکھ لیا کرتا تھا۔

بچہ چلا اور تاریخ نے بتایا ہے کہ علی اکبرؑ نے چلنے سے پہلے ایک مرتبہ حسینؑ کو دیکھا اور دیکھنے کے بعد کہا بابا، اے بابا! آپ دھوپ میں کھڑے ہوئے ہیں، بہت تیز دھوپ ہے۔ اور پھر نظر ڈالی بہت دور کے اوپر پسرِ سعدؑ لعین دکھائی دیا جو زریں چھتر کے نیچے تھا۔ بابا! وہ منافق، وہ کافر، وہ دشمن وہ سائے میں کھڑا ہوا ہے بابا! اور آپ دھوپ میں کھڑے ہوئے ہیں۔ بس یہ کہہ کے گھوڑے کو ایڑ دی۔ اس کا مطلب یہ کہ جیسے علی اکبرؑ سے برداشت نہ ہو سکا کہ میرا بابا دھوپ میں ہو اور پسر سعد سائے میں کھڑا ہوا ہو۔ نظر پسر سعد کے اوپر کہ سیدھے وہیں پہنچیں اور اسے قتل کر دیں۔ علی اکبرؑ نے پوری رفتار سے گھوڑا بڑھایا مگر تھوڑی دیر کے بعد یہ محسوس ہوا کہ پیچھے کوئی دوڑتا چلا آرہا ہے۔ پلٹ کر دیکھا تو دیکھا پیچھے حسینؑ کمر تھامے چلے آرہے ہیں۔ اے بیٹا علی اکبرؑ! اے بیٹا علی اکبرؑ! تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ۔ کہا بابا! آپ تو مجھے رخصت کر چکے تھے۔ کہا ہاں بیٹا! میں تمھیں رخصت تو کر چکا تھا لیکن اگر تم باپ ہوتے تو تمھیں معلوم ہوتا کہ باپ کے دل پر کیا گزرتی ہے۔ اے بیٹا! اگر ممکن ہو تو جب تک میرا تمھارا سامنا رہے پلٹ پلٹ کر مجھے دیکھتے جاؤ۔

بس عزادارانِ حسینؑ! آئے علی اکبرؑ اور آنے کے بعد حملہ کیا اور وہ شدید حملہ کیا کہ ایک سو بیس دشمنوں کی لاشیں کربلا کے میدان میں

تڑپنے لگیں مگر اب خود بھی زخمی ہو گئے اور آپ جانتے ہیں کہ پیاسا انسان اگر زخمی ہو جائے تو پیاس اس کی کس حد پہ پہنچ جاتی ہے۔ زرہ کی کڑیوں سے خون اُبل رہا ہے، زخمی ہو چکے ہیں، پلٹ کر آئے حسینؑ کے پاس اور آکر کہا بابا، بابا! تھوڑا سا پانی۔

بس عزادارانِ حسینؑ! میں آپ کو ایک بات یاد دلانا چاہتا ہوں، پھر میں آپ کے سامنے کہہ دوں کہ میں کوئی بات آپ کے سامنے برائے بیت نہیں پڑھتا جب تک تاریخ میں دیکھ نہیں لیتا۔ میں نے دیکھا ہے اس لیے آپ کے سامنے عرض کر رہا ہوں۔ یہ علی اکبرؑ کون ہے؟ روایت بتاتی ہے کہ جب امام حسین صلوٰۃ اللہ و سلامہ علیہ کے یہاں امام زین العابدینؑ پیدا ہوئے تو امام حسینؑ نے ایک سفید کپڑے میں لپیٹ کر لے جا کر مسجدِ نبویؐ کی محراب میں رکھ دیا کہ پالنے والے، میں اس بچے کو تیری نذر کرتا ہوں تیرے دین کے لیے۔ اس کے بعد علیؑ ابن ابی طالب آگے بڑھے اور یہ کہہ کے اس بچے کو اٹھا لیا کہ پالنے والے، میں اس بچے کو تیرے در سے لیتا ہوں اپنے لیے۔ اور اس کے بعد جب علی اکبرؑ پیدا ہوئے تو اس وقت بھی امامؑ نے یہی فرمایا، ایک سفید پارچہ میں لپیٹ کر شاہزادے کو لے جا کر محرابِ مسجد نبوی میں رکھ دیا، مگر اب کی علیؑ آگے نہیں بڑھے بلکہ آپ کی بیٹی زینبؑ آگے بڑھی اور زینبؑ نے بچے کو اٹھا لیا اور کہا پالنے والے، اس بچے کو تیرے در سے میں لے کر جا رہی ہوں، یہ آج سے میرا بچہ ہے۔

بس عزادارانِ حسینؑ! پھر زینبؑ نے علی اکبرؑ کو ایسا پالا کہ عونؑ و محمدؑ کو بھی ایسا نہ پالا تھا۔ اتنا مانوس ہو گئے تھے علی اکبرؑ زینبؑ سے کہ خدا شاہد ہے کہ تاریخ نے یہ تصریح کی ہے کہ بچپنے کے عالم سے لے کر اٹھارہ برس تک جب بھی علی اکبرؑ کو کوئی چیز مانگنا ہوئی کبھی تو باپ سے نہیں مانگی ہمیشہ پھوپھی سے، پھوپھی یہ دے دیجیے یہ دیدیجیے یہاں تک کہ تاریخ نے تصریح کی ہے کہ اکثر امام حسینؑ نے فرمایا کہ بیٹا ٹھیک ہے، زینبؑ تم کو بہت ہی نازونعم سے پال رہی ہیں لیکن بیٹا میں بھی تو باپ ہوں، میرا دل چاہتا ہے کہ کبھی تم مجھ سے بھی کوئی شے مانگ لیا کرو۔ مگر ہر مرتبہ علی اکبر جواب دیتے تھے کہ بابا میں آپ سے کیا کوئی شے مانگوں جب پھوپھی کوئی شے نہ دیں تو میں آپ سے مانگوں۔ دیکھیے یہ مستقل ایک صورتِ حال تھی کہ حسینؑ کہتے تھے کہ بیٹا مجھ سے کوئی شے مانگو اور علی اکبرؑ کہتے تھے کہ بابا میں کیا مانگوں اگر پھوپھی نہ دیں تو میں آپ سے مانگوں تبھی تو حسینؑ کے دل میں ایک تمنا تھی کہ میرا بچہ بھی مجھ سے کوئی شے مانگے اور میں وہ شے اس کو دے دوں۔

آج پہلی مرتبہ علی اکبرؑ پلٹ کر آئے ہیں تو کہہ رہے ہیں کہ بابا! آپ ہمیشہ مجھ سے کہا کرتے تھے کہ کچھ مانگو، آج میں آپ سے کچھ مانگنے کے لیے آگیا ہوں۔ اگر ممکن ہو تو تھوڑا سا پانی مجھ کو پلا دیجیے تاکہ میں دکھا دوں کہ بنی ہاشم کے شیر کیوں کر جنگ کرتے ہیں اور ہائے حسینؑ کی مجبوری کہ بچے نے پہلی مرتبہ سوال کیا اور حسینؑ نے کہا بیٹا پانی کہاں ممکن ہے،

ہاں لاؤ اپنی زبان میرے دہن میں دے دو، شاید تمھیں تسلی مل جائے۔ علی اکبرؑ نے زبان اپنی حسینؑ کے دہن میں دے دی اور گھبرا کر نکال لی، بابا! آپ کی زبان میں تو میری زبان سے بھی زیادہ کانٹے پڑے ہوئے ہیں۔

بس عزادارانِ حسینؑ! زحمت آپ کی ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد امام نے ایک انگوٹھی دی اور کہا لو بیٹا، اس کو اپنے دہن میں رکھ لو، جاؤ اور اب تمھارے نانا تم کو اس طرح سے سیراب کر دیں گے آبِ کوثر سے کہ تم کو کبھی پیاس محسوس نہ ہو گی۔ بس علی اکبرؑ سمجھ گئے کہ اب شہادت کا وقت قریب ہے۔ آئے اور آنے کے بعد پھر حملہ کیا، دشمنوں کو پھر قتل کیا مگر سنانِ ابن انس کا نیزہ سینے کے پار ہو گیا۔

عزادارانِ حسینؑ! یہ بعض خصوصیتیں علی اکبرؑ کی ملتی ہیں۔ بس میں اتنا عرض کر دوں آپ کے سامنے کہ اب تک میں نے آپ کے سامنے مصائب کم پڑھے لیکن اب عزا کی تاریخ کا تقاضہ یہ ہے کہ مصائب میں کمی نہ ہو، یہ تو سب حسینؑ کا صدقہ ہے کہ سب کچھ آپ سن لیتے ہیں لیکن اصل تو حسینؑ پر ماتم ہے جس کے لیے ہم سب یہاں پر جمع ہوئے ہیں۔ کچھ خصوصیتیں علی اکبرؑ کی ایسی ہیں جو کسی اور میں نہیں پائی جاتیں۔ پہلی خصوصیت یہ ہے کہ تاریخ کربلا میں مجھے کوئی حسینؑ کا سپاہی ایسا نہیں ملتا کہ جب وہ زخموں سے چور ہو گیا ہو اور گھوڑے پر سنبھل نہ پا رہا ہو تو وہ گھوڑے سے گر نہ گیا ہو، جس سے سنبھلا نہ گیا وہ زمین پر آ گیا۔ مگر علی اکبرؑ کی غیرت کا عالم یہ تھا کہ روایت بتاتی ہے کہ جب سنان کا نیزہ

عقیدہ کہ توراۃ کلامِ خدا، انجیل کلامِ خدا، زبور کلام خدا۔ اور یہ تینوں کتابیں بائیبل کی شکل میں محفوظ۔ مگر بائیبل اور قرآن مجید میں بنیادی فرق یہ ہے کہ بائیبل کے صحیفے کلامِ خدا تھے اور قرآن کلام خدا ہے۔

میں طلب کروں بائیبل کسی سے تو پہلا سوال کرے گا، آپ کو بائیبل درکار ہے مگر کس زبان میں؟ اردو میں، ہندی میں، انگریزی میں، فرنچ میں، عربی میں، فارسی میں؟

بھائی مجھے اسی زبان میں چاہیے جس میں اتری تھی، مجھے کسی زبان میں نہیں، زبان خدا میں چاہیے۔ جی، وہ تو ممکن نہیں، باقی آپ جس زبان میں کہیں ہم فراہم کرنے کو تیار ہیں۔ دیکھا آپ نے، ان کتابوں کا ترجمہ مل سکتا ہے مگر اصل کتاب مفقود ہے، ناپید ہے۔ یہ شرف صرف قرآن کو حاصل ہے کہ ترجمے بھی موجود اور ORIGINAL بھی۔ ترجمہ انسان کا کلام ہوتا ہے کلامِ خدا نہیں۔ درحقیقت تصنیف کرنا آسان ہے ترجمہ کرنا مشکل اور وہ بھی کلامِ خدا کا ترجمہ۔ کلام خدا لامحدود علم خدا کا آئینہ دار ہوتا ہے، ترجمہ محدود انسانی فکر و علم کی پیداوار۔ بقدر علم و فکر جو جتنا سمجھ سکا اس کو حرفِ آخر سمجھ کر ترجمہ کی شکل دے دی۔ ترجمہ کلام خدا نہیں ہوا کرتا وہ انسانی ذہن کی پیداوار ہوتا ہے۔ قرآن اپنی اصل شکل میں موجود ہے اور وارثِ قرآن صادق آل محمدؑ کا ارشاد ہے کہ قرآن کبھی پرانا نہ ہوگا، یہ زمانہ کے ساتھ ساتھ چلتا رہے گا۔ کیا مطلب! مطلب یہ کہ ہر دور کا انسان اپنے معلومات کے دائرہ کے لحاظ سے، اپنی بصیرت کے لحاظ سے جب قرآن میں غور کرے گا

سینے سے پار ہو گیا اور شہزادہ زین فرس پر لڑکھڑانے لگا اور دیکھا کہ اب میں فرس پر سنبھل نہ سکوں گا تو زمین پر گرے نہیں بلکہ اپنی باہیں گھوڑے کی گردن میں ڈال دی کہ جب تک ہو سکے زمین پر گروں نہیں اور گھوڑا لے کر دشمن کے لشکر کی طرف چلا۔

بس اب علی اکبرؑ بے بس ہو چکے تھے تو روایت کے جملے ہیں کہ قَتَلُوْهُ اِرْبًا اِرْبًا جدھر سے علی اکبرؑ گزرے جس کے پاس جو ہتھیار تھا، اس نے استعمال کیا۔ نیزے، برچھیاں، خنجر، کٹاریں، تلواریں یہاں تک کہ میں نے عرض کیا کہ قَتَلُوْهُ اِرْبًا اِرْبًا علی اکبرؑ کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور اس کے بعد جب گھوڑے سے گرنے لگے تو عزادارانِ حسینؑ، دوسری خصوصیت آپ نے سیکڑوں ہزاروں مجلسیں سنی ہوں گی، حسینؑ کا جو سپاہی بھی گھوڑے سے گرنے لگا اُس نے آواز دی کہ مولا! مجھے بچائیے۔ قاسمؑ کی آواز یہی، عباسؑ کی آواز یہی، عونؑ و محمدؑ کی آواز یہی۔ مگر خصوصیت علی اکبرؑ یہی ہے کہ جب گھوڑے سے گرنے لگے تو فرمایا کہ یَا اَبَتَاهُ عَلَیْكَ مِنِّی السَّلَامُ اے بابا! میرا اسلام قبول کیجیے۔ میں کہتا ہوں میرے شہزادے! جب ہر سپاہی بلا رہا ہے مدد کے لیے تو آپ کیوں نہیں بلا لیتے مدد کے لیے، تو شاید علی اکبرؑ جواب دیں گے کہ کیسے مدد کے لیے بلاؤں۔ ارے قاسمؑ نے پکارا تو چچا سنبھال کر لے گیا، چچا نے پکارا تو میں سنبھال کر لے گیا، اب جس کے پاس کوئی نہیں ہے جو سنبھال کر لے آئے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ بابا، بس اب آنے کی زحمت نہ کیجیے،

دور سے اپنے بچے کا سلام قبول کر لیجیے۔ لیکن حسینؑ کہاں ٹک سکتے تھے، چلے اور عالم یہ ہے کہ قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے جاتے ہیں، گرتے ہیں اور اٹھتے ہیں، فرماتے ہیں یا علیؑ! یا علیؑ! اب پتہ نہیں اپنے بابا کو پکار رہے تھے کہ بابا، آپ تو ہر مومن کی مشکل میں آتے ہیں، کیا اپنے بیٹے کی مدد نہ کیجیے گا، آئیے میرا بازو تھام کر مجھے میرے لال تک پہنچا دیجیے۔ یا ممکن ہے کہ علی اکبرؑ کو آواز دے رہے ہوں کہ بیٹا آواز دو کہ آواز کے سہارے چلا آؤں۔

مختصر یہ کہ پہنچے علی اکبر کے سرہانے تو دیکھا کہ علی اکبرؑ کی آنکھیں بند ہیں اور سینے پر ہاتھ ہے۔ بس بیٹھ گئے علی اکبرؑ کے سرہانے اور علی اکبرؑ کا سر اٹھا کر زانو پر رکھا، فرمایا یا بُنَیَّ عَلَی الدُّنیا بَعدَكَ العُفَا بیٹا! بعد تیرے اس زندگانیٔ دنیا پر خاک ہے۔ علی اکبرؑ نے ایک مرتبہ آنکھیں کھولیں، دیکھیے یہ نفسیاتی باتیں ہیں، دنیا سے جا رہے ہیں مگر چاہتے ہیں کہ بابا کے دل کو تسلیؔ دے دیں۔ کہا بابا، بابا! میرے سرہانے میرے نانا کھڑے ہیں، ہاتھوں میں دو جام لیے ہیں اور کہہ رہے ہیں، بیٹا علی اکبرؑ ایک تیرے لیے ہے اور ایک میرے حسینؑ کے لیے ہے۔ حسینؑ نے سنا اور اس کے بعد کہا کہ بیٹا! یہ تم سینے پر ہاتھ کیوں رکھے ہوئے ہو؟ کہا کہ بابا! سنان نے میرے نیزہ مارا تھا تو نیزہ تو کھینچ لیا مگر نیزے کا پھل میرے کلیجے میں رہ گیا جو کھٹک رہا ہے، بابا بہت تکلیف دے رہا ہے، بابا! اگر ممکن ہو تو اس پھل کو نکال لیجیے،

ممکن ہے کہ مجھے سکون ہو جائے۔

عزادارانِ حسینؑ! تمھیں اسی ذکرِ حسینؑ کی قسم ہے۔ بتانا کسی باپ پر یہ وقت پڑا ہے؟ حسینؑ نے کہا، بیٹا ہاتھ ہٹاؤ، میں نیزے کا پھل کھینچوں گا علی اکبرؑ نے ہاتھ ہٹایا، حسینؑ نے نیزے کے پھل کے اوپر ہاتھ رکھا، اب میں فریاد کروں گا علیؑ ابن ابی طالبؑ سے کہ یا علیؑ! میں آپ ہی سے انصاف چاہتا ہوں کہ بتائیے درِ خیبر کا اکھاڑنا آسان ہے یا علی اکبرؑ کے سینے سے اس برچھی کا نکالنا۔ یا علیؑ کہہ کے حسینؑ نے جھٹکا دیا اور نیزے کا پھل علی اکبرؑ کے کلیجے کے ساتھ لپٹا ہوا سینے کے باہر آگیا اور علی اکبرؑ نے اسی منزل پر تڑپ کر جان دے دی اور حسینؑ نے علی اکبرؑ کی لاش اٹھائی۔

بس عزادارانِ حسین! ایک جملہ اور آپ کی زحمت ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ کبھی لاش اٹھائی کبھی زمین پر رکھی، کبھی اٹھائی کبھی زمین پر رکھی۔ آخر دیکھا کہ یہ لاش خیمے تک نہیں پہنچ سکتی، حسرت سے چاروں طرف دیکھنا شروع کیا کہ سب کی لاش میں نے اٹھائی مگر یہ لاش مجھ سے نہیں اٹھ رہی ہے، کوئی مدد کرنے والا آجائے۔ کون تھا کربلا کے میدان میں جو آکر حسینؑ کی مدد کرتا؟ ہاں دیکھا کہ خیمے کے باہر کچھ بچے نکل آئے ہیں، کہا بچوں آؤ، آؤ آکر اپنے بھائی کی لاش اٹھادو، مجھ سے یہ لاش اب اٹھتی نہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچوں نے لاش علی اکبرؑ کی اٹھائی، لاکر درِ خیمہ پر رکھی، اب تک تو حسینؑ صبر کیے ہوئے تھے لیکن جب لاش خیمے کے در پر پہنچ گئی تو ایک مرتبہ چیخ مار کر روئے۔ بس حسینؑ کی آواز

خیمے کے اندر پہنچی، چاہنے والی بہن زینبؑ تڑپ کر خیمے کے باہر نکلی آ کر اپنے کو علی اکبرؑ کی لاش پر گرا دیا۔ حسینؑ علی اکبرؑ ایسے جوان کا غم بھول گئے کہا زینبؑ تم نے بڑا غضب کر دیا، میری زندگی میں خیمے سے باہر نکل آئیں، یہ کہہ کر زینبؑ کو خیمے کے اندر پہنچا دیا۔ میں کہتا ہوں مولاؑ! آپ زینبؑ کو خیمے کے اندر پہنچا دیجیے، لیکن تھوڑی دیر کے بعد جب خیموں سے دھواں بلند ہو رہا ہوگا اور یہی شاہزادی خیمے کے باہر نکل رہی ہونگی۔

ساتویں مجلس

اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیمِ بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ
وَمَن یَّبتَغِ غَیرَ الاِسلَامِ دِینًا فَلَن یُّقبَلَ مِنہُ وَھُوَ فِی الاٰخِرَۃِ
مِنَ الخٰسِرِینَ ۵ (سورہ آل عمران آیت ۸۵)

برادران عزیز! آج محرم کی ساتویں شب ہے اور آپ نے اب تک یہ ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ میں اسلام کے بارے میں ان حقیقتوں کو پیش کرنے کی کوششیں کر رہا ہوں جن کی اس ماحول میں ضرورت ہے اور کل انشاءاللہ میں پھر اسی موضوع کو آپ کے سامنے آگے بڑھاؤں گا۔ لیکن میرا ایک اور بھی طریقہ ہے کہ ساتویں کی شب میں جو مجلس ہوتی ہے چونکہ مصائب میں تذکرہ ہوتا ہے امام حسنؑ کے فرزند شہید حضرت قاسم ابن حسنؑ کا۔ اس لیے میں فضائل میں امام حسنؑ کا ذکر ہمیشہ کیا کرتا ہوں اس لیے کہ اس موضوع پر بہت کم کہا جاتا ہے اور اکثر MISUNDERSTANDING اور غلط فہمیاں ہمارے درمیان پھیلی ہوئی ہیں جس کا احساس مجھے یہاں آنے کے بعد بھی ہوا اور اپنے پڑھے لکھے دوستوں کو میں نے کچھ شبہات

میں مبتلا پایا۔

بہر حال تمہید میں مَیں قرآن مجید ہی کے بارے میں جیسا کہ برابر مجلس میں آپ کے سامنے عرض کر رہا ہوں کہ اگر ہم گہری نظر سے قرآن کو دیکھیں یعنی صرف پڑھیں ہی نہیں بلکہ غور کریں، سمجھنے کی کوشش کریں۔ اسی لیے قرآن مجید کو زیادہ SPEED میں پڑھنے کو قرآن نے پسند نہیں کیا ہے، بلکہ ارشاد ہوا ہے کہ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا ؕ قرآن کو رُک رُک کر دھیرے دھیرے پڑھو۔ اگر آپ نے پورے قرآن کو ایک رات میں ختم کرلیا، بیشک یہ کارنامہ ہے، بیشک یہ قابلِ تعریف بات ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ چوبیس گھنٹے میں قرآن ختم کر دینے والوں کو بارگاہِ الٰہی سے اتنا اجر نہیں ملے گا کہ جتنا اجر اس شخص کو ملے گا کہ جو ایک آیت کے سمجھنے میں پوری زندگی صرف کر دے۔ اس لیے کہ قرآن رٹنے کی کتاب نہیں ہے قرآن سمجھنے کی کتاب ہے۔ طوطے کی طرح دہرانے کی بات نہیں ہے۔ قرآن میں گہرائیاں ہیں، قرآن میں گیرائیاں ہیں۔ جو وارثِ علومِ قرآن ہیں علیؑ ابن ابی طالب، ان کا ارشاد ہے۔ آپ نہج البلاغہ ملاحظہ فرمائیں جو ان کا ارشاد ہے، نہج البلاغہ میں موجود ہے، یہ جملہ آپ ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ لَا یَفْنٰی عَجَائِبُہٗ وَلَا یَنْقَضِیْ غَرَائِبُہٗ کہ یہ زمانہ ختم ہو جائے گا مگر قرآنِ مجید کے جو عجائبات ہیں اور جو غرائب، رُموز و معارف کے جو سمندر پوشیدہ ہیں وہ کبھی ختم نہ ہوں گے بلکہ ہر زمانے اور ہر صدی کا ہاتھ قرآن کے معنی اور مطالب ایک نئے ورق کو پلٹتا چلا جائے گا تو اس لیے اس میں

غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اچھا جب ہم غور و فکر سے کام لیں گے تو ہمارا آزاد مطالعہ خود بتادے گا کہ نہ قرآن مجید انسان کا کلام ہے نہ قرآنِ مجید انسان کا کلام ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ انسان کتنا ہی ذہین کیوں نہ ہو اس کی معلومات محدود ہوتی ہیں LIMITED ہوتی ہیں اور قرآن کی گہرائیاں لامحدود ہیں۔

آپ اسی ذیل میں بہت سی باتیں ملاحظہ فرما چکے ہیں، آج آپ کے سامنے MEDICAL SCIENCE سے متعلق ایک بات میں آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ یہ یاد رکھیے گا آپ کہ جس وقت قرآن مجید نازل ہوا اور جس ماحول میں قرآنِ مجید نازل ہوا ہے، وہ ماحول آپ کے پیش نظر ہے۔ وہاں موجودہ MEDICAL SCIENCE نہیں پائی جاتی تھی وہاں اس وقت کوئی نہیں جانتا تھا آج پتہ چلا ہے کہ اللہ نے انسان کی SKIN میں، کھال میں اور جلد میں یہ صفت قرار دی ہے کہ اس کھال کو کٹنے اور جلنے کی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ اندر NERVES کو، ہڈیوں کو اور وہ حصے کہ جو کھال سے نہیں بنے ہیں، کٹنے اور جلنے کی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔ یہ حقیقت ہے، اس میں کسی کو بحث کی کوئی گنجائش نہیں اور اگر کسی کو شک ہے تو وہ کسی ڈاکٹر سے جاکر کوئی انجکشن لے لیں تو آپ کو خود اندازہ ہو گا کہ جس وقت وہ NEEDLE آپ کی SKIN کو چبھ رہی ہو گی، اس وقت تو آپ کو تکلیف محسوس ہو گی، لیکن جب وہ گوشت کے اندر چلی جائے گی تو تکلیف کا احساس نہیں ہو گا۔

چونکہ اللہ نے ہماری اس جلد کو، ہماری کھال کو ہمارے جسم کا محافظ قرار دیا ہے اس لیے اس کو بیدار رکھا ہے کیوں کہ محافظ ہی اگر سو جائے تو جو دشمن چاہے گا گھس آئے گا۔ تو چونکہ یہ کھال ہمارے جسم کی محافظ ہے اس لیے اس کو بیدار رکھا ہے۔ اور اس کی حفاظت میں اندر جتنے بھی ہمارے اعضاء و جوارح ہیں وہ سب سو رہے ہیں، ان کو اطمینان ہے کہ کوئی دشمن بھی آئے گا تو یہ کھال فوراً ہم کو خبر دے دے گی کہ کوئی آ رہا ہے۔

توجہ فرمائی آپ نے؟ یہ بالکل طے شدہ ہے کہ صرف ہماری SKIN یعنی کھال کو کٹنے اور جلنے کی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ ہمارے اندرونی جو اعضاء ہیں گوشت اور ہڈیاں وغیرہ، ان کو کٹنے اور جلنے کی تکلیف بالکل محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن یہ حقیقت آج انسان کو معلوم ہوئی ہے، چودہ سو برس پہلے کے انسان کو یہ معلوم نہ تھا۔ اس ماحول میں قرآن مجید نازل ہو رہا ہے۔ اور اب میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ مجھ سے کہیں اس وقت کہ تم جہنم کی آگ کا نقشہ ایسا کھینچو کہ ہر انسان لرز جائے تو میں کیا کہوں گا آپ کے سامنے باوجودیکہ MEDICAL SCIENCE کا یہ فارمولا مجھے معلوم ہے مگر میں آپ کی خدمت میں یہ عرض کروں گا کہ اے برادرانِ ایمانی! اے برادرانِ اسلامی! اس آگ سے بچیے جب آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہوں گے، اور بھڑک رہے ہوں گے اور یہاں کی آگ سے ہزار گنا زیادہ اس میں

شدت ہوگی اور اس آگ کا عالم یہ ہوگا کہ جب خدا نخواستہ کوئی انسان جہنم میں ڈالا جائے گا تو کھال اس کی جل جائے گی، جسم اس کا جل جائے گا، ہڈیاں جل جائیں گی اس کی، گوشت جل جائے گا اس کا۔ یہی تو کہا جا سکتا ہے اس لیے کہ مبالغہ پیش نظر ہے، ڈرانا پیش نظر ہے۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ چودہ سو برس پہلے جب اللہ قرآن پاک کے ذریعہ سے جہنم کی آگ کی شدت کا منظر پیش کرتا ہے تو وہ یہ نہیں کہتا ہے کہ ہڈیاں جل جائیں گی، گوشت جل جائے گا۔ توجہ فرمائیے! میں قرآن کا ٹکڑا پیش کیے دیتا ہوں آپ کے سامنے کُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَیْرَهَا لِیَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ جہنم میں جب جہنمیوں کو ڈالا جائے گا تو جیسے ہی ان کی کھال جلے گی ویسے ہی ہم ان کے جسم پر ایک نئی کھال پیدا کر دیں گے تاکہ ان کو عذاب کا مزا مسلسل ملتا رہے۔ توجہ فرمائی آپ نے! اس کا مطلب یہ کہ گوشت کے جلنے کا انتظار نہیں کیا جائے گا۔ اس لیے کہ گوشت جلے گا تو تکلیف کا احساس نہیں ہوگا، ہڈیاں جلیں گی تو تکلیف کا احساس نہیں ہوگا کیوں کہ صرف کھال کو تکلیف کا احساس ہوتا ہے، اس لیے ارشاد ہوتا ہے کہ ادھر کھال جلے گی اُدھر دوسری کھال پیدا ہو جائے گی تاکہ انسان کو تکلیف کا احساس مسلسل ہوتا رہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چودہ سو برس پہلے جو کتاب آ رہی تھی، اس کو اس حقیقت کا پتہ کیسے چلا کہ کھال کو جلنے کی تکلیف کا احساس

ہوتا ہے ہڈیوں کو نہیں۔ تو یہ انداز قرآن مجید کا ہر FIELD میں ہے۔
میں نے آپ کے سامنے کتنی باتیں پیش کی ہیں، وہ سب اس
بات کی دلیل ہیں کہ قرآن مجید نہ کسی انسان کا کلام ہے اور نہ
یہ کسی انسان کا کلام ہو سکتا ہے اور نہ کسی انسان کے بس
میں ہے کہ وہ قرآن کی جیسی کتاب پیش کر سکے۔ نہ کسی انسان
کے بس میں ہے نہ کسی ACADEMY کے بس میں ہے۔
نہ کسی فرد کے بس میں ہے نہ کسی گروہ کے بس میں ہے۔ کوئی فرد اور
کوئی جماعت قرآن کا جواب پیش نہیں کر سکتی۔ (صلوٰۃ)

بس برادرانِ عزیز! اب اسی قرآن پاک میں یہ ارشاد ہے کہ اسلام
کے علاوہ کوئی دوسرا دین اختیار نہ کرنا۔ لپٹ جاؤ اسلام سے۔ زندہ
رہو تو اسلام کے لیے اور مرو تو مسلمان ہو کے وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ
مُّسْلِمُوْنَ ٥ موت بھی آئے تم کو تو عالمِ اسلام کے لیے۔ تو اگر ہم نے
زندگی گزاری اسلام کی راہ کے اوپر اور مر گئے اسلام کے اوپر تو مرنے
والا مرا نہیں بلکہ اس کو زندگی کا ایک نیا پیکر، ایک نیا عنوان، ایک
نئی تصویر اور زندگی کا ایک نیا رُخ مل گیا۔

آپ جانتے ہیں کہ اس زمانے میں جدید ترین طریقہ، تعلیم یہ ہے
کہ خالی THEORY نہیں سمجھائی جاتی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ PRACTICAL
بھی کرایا جاتا ہے۔ بچوں کو آج اگر تعلیم دی جاتی ہے تو خالی WORDS
نہیں بتائے جاتے، الفاظ نہیں بتائے جاتے بلکہ انھیں MODEL بھی

تو ہر ہر لفظ نئی نئی حقیقتوں کا پتہ دیتا جائے گا۔ بھلا ترجمہ میں یہ بات کہاں سے آسکتی ہے۔ مگر یہ ہوا کیوں کہ صرف قرآن محفوظ رہا باقی کلام محفوظ نہ رہے۔ دراصل یہ بات اللہ نے صرف قرآن کے لیے کہی تھی کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ ہم نے قرآن کو اتارا ہے اور ہم خود اس کی حفاظت کریں گے۔

مگر پھر سوال ہوتا ہے کہ آخر اس نے اپنے اور کلاموں کو چھوڑ کر صرف قرآن ہی کو کیوں بچایا؟ بات واضح ہے۔ بات یہ ہے کہ دیگر کتابوں کی صورت یہ تھی کہ ایک کے بعد دوسری کتاب آنے والی اس لیے بچانے کی فکر نہ ہوئی، تینوں کتابوں میں سب سے آخر میں انجیل آئی مگر اس کے بعد بھی قرآن آنے والا تھا اس لیے اُن میں سے کسی کے بچانے کی فکر نہ ہوئی۔ اس لیے کہ جو اُن سب میں تھا وہ سب قرآن میں تھا لیکن قرآن کے بعد کوئی دوسری کتاب آنے والی نہ تھی۔ کلام خدا کا یہ آخری شاہکار تھا اس لیے اس کو بچایا گیا کہ یہ بھی مٹ گیا تو تعلیمات الٰہی کا ذخیرہ کہاں ملے گا۔

اب مزاج مشیت کو سمجھ لیں کہ جو آخری ہوتا ہے اُس کو بچا لیا جاتا ہے۔ ہمارے رسولؐ آخری رسولؐ ضرور ہیں مگر آخری معصوم ہادی نہیں۔ اگر یہ آخری معصوم ہادی ہوتے نسل اسماعیلؑ میں تو نسل اسحاقؑ کے آخری معصوم ہادی عیسٰیؑ کی طرح ان کو بھی زندہ رکھا جاتا۔ مگر ان کا دنیا سے جانا خود اس بات کی دلیل ہے کہ نبوت کا سلسلہ ختم ہوا ہے عصمت کا نہیں۔ اور اسی لیے جب اس سلسلۂ عصمت کے آخری ہادی کی باری آئی تو اسے بھی عیسٰیؑ کی

دکھا دیا جاتا ہے۔ اگر MANGO کہا جاتا ہے تو MANGO دکھا بھی دیا جاتا ہے اگر PINEAPPLE کہا جاتا ہے تو دکھا بھی دیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ DESCRIPTION سے بات اتنی سمجھ میں نہیں آتی جتنا کہ MODEL دیکھ لینے سے۔ تو بس اللہ نے بھی ہمارے لیے یہ اہتمام کیا تھا کہ اس نے ایک طرف اسلام کے اصولوں کو قرآن مجید میں بتایا تھا اور دوسری طرف اہل بیتؑ کی شکل میں ان اصولوں کے MODEL بنا دیے تھے۔ (صلوٰۃ) یہ رسول کریمؐ اور آپ کے اہلِ بیتؑ جو تھے یہ MODEL تھے اسلام کا۔ (صلوٰۃ)

ذرا غور کریں برادران عزیز! قرآن میں خدا نے سیکڑوں جگہوں پر کہا ہے کہ نماز پڑھو مگر ایک جگہ بھی یہ نہیں بتایا کہ کیسے پڑھو۔ سیکڑوں مقام پر کہا کہ زکوٰۃ دو اور ایک منزل پر بھی نہ کہا کہ زکوٰۃ کے مسائل کیا ہیں. حج کا حکم دیا مگر طریقہ نہ بتایا تو طریقے کا نہ بتانا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ MODEL موجود ہیں۔ ہم کہہ رہے ہیں کہ نماز پڑھو مگر نماز کیسے پڑھو؟ حضورؐ کی طرح۔ ہم کہہ رہے ہیں کہ حج کرو، مگر حج کیسے کرو، حضورؐ اور حضورؐ کی آلؑ کی طرح۔ ہم کہہ رہے ہیں کہ زکوٰۃ دو مگر زکوٰۃ کیسے دی جاتی ہے حضورؐ اور حضورؐ کی آلؑ کی طرح۔ اس لیے کہ ان کو ہم نے تمھارے لیے جب MODEL بنا دیا ہے تو اب جیسے یہ کر رہے ہیں ویسے تم بھی کرو، تو حضورؐ کریم نے ارشاد فرمایا کہ صَلُّوا کَمَا رَاَیتُمُونِی اُصَلِّی جیسے میں نماز پڑھتا ہوں ویسے ہی تم بھی پڑھو۔

اب ظاہر ہے کہ رسولؐ کی تیئس برس کی تبلیغی زندگی تھی اور

تیئس برس کے بعد حضورؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے تو مسائل تو ابھی پورے طریقے سے واضح نہیں کیے جا سکتے تھے؟ اسلام تو وہ دین ہے جو قیامت تک رہنے والا ہے تو اس لیے حضورؐ دنیا سے تشریف لے گئے تو علیؑ آ گئے اسلام کا MODEL بن کے اور علیؑ دنیا سے جانے لگے تو حسنؑ آ گئے اسلام کا MODEL بن کے۔ اور میں آج کی تاریخ میں ہمیشہ امام حسن صلوٰۃ اللہ و سلامہ علیہ کا حال عرض کیا کرتا ہوں۔ (صلوٰۃ)

برادرانِ عزیز! امام حسنؑ اور امام حسینؑ صلوٰۃ اللہ و سلامہ علیہما کے بارے میں حضورؐ کریم کا ارشاد ہے جس سے کوئی مسلمان انکار نہیں کر سکتا ہر مسلمان کو اس حدیث کے سامنے سر جھکانا پڑے گا اَلْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ سَیِّدَا شَبَابِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ۔ "حسنؑ اور حسینؑ جوانانِ جنت کے سردار ہیں"۔ مجھے معلوم ہے کہ جو منزلت قرآن کی ہے وہ حدیث کی نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن کا ہر ہر لفظ اور ہر ہر جملہ اور ہر ہر آیت اور ہر ہر حرف یقینی ہے کہ وہ کلام خدا ہے مگر ہر حدیث کے بارے میں ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ واقعی وہ کلامِ رسولؐ ہے، اس میں گڑبڑ نہیں ہو گئی یا کوئی اختلافی بات نہیں، سب جانتے ہیں۔ لیکن اگر کسی حدیث کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ واقعی یہ رسولؐ نے فرمائی ہے تو اب اس حیثیت سے حدیث اور قرآن میں فرق ضرور ہے کہ وہ معجزہ ہے اور یہ معجزہ نہیں ہے۔ مگر صداقت کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس لیے کہ زبانِ رسولؐ پر وہ بھی آئی اور زبانِ رسولؐ پر یہ بھی آئی تو اب

اگر آپ کو دیکھنا ہے کہ اس حدیث کی صداقت کس منزل کے اوپر ہے تو آپ تاریخ طبری کو ملاحظہ فرمالیں کہ جس وقت امام حسینؑ میدانِ کربلا میں تشریف لائے ہیں اور سامنے ہزاروں کی تعداد میں لشکرِ یزیدی کھڑا ہوا تھا تو اس لشکر یزیدی سے جو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا وہ یہی کہ تم نے کیا میرے اور میرے بھائی کے بارے میں میرے نانا کی یہ حدیث نہیں سنی ہے کہ اَلْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ سَیِّدَا شَبَابِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ "حسنؑ اور حسینؑ جوانانِ اہلِ جنت کے سردار ہیں" تو لشکر یزیدی نے خاموش ہو کر اقرار کیا کہ ہم اس حدیث سے انکار نہیں کر سکتے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس حدیث کی صداقت تو اس منزل پر ہے کہ اگر کوئی یزیدی بھی ہو تو انکار نہیں کر سکتا۔

اب ذرا غور کیجیے گا، ترجمہ میں نے وہی کیا آپ کے سامنے کہ جو عام طور پر کیا جاتا ہے۔ کل جو گفتگو ہو رہی تھی وہ بھی تھی ترجمے سے متعلق، میں نے عرض کیا کہ ہمارے یہاں ترجمے صحیح نہیں کیے جا سکتے۔ چنانچہ یہ ترجمہ بھی الحسن والحسین سید اشباب اھل الجنۃ کا جو ہے صحیح نہیں ہے اور میں آپ کے سامنے قرآن مجید سے شاہد پیش کر دوں گا۔ وہ عام طور پر یہ ترجمہ کیا جاتا ہے کہ حسنؑ و حسینؑ جوانانِ جنت کے سردار ہیں۔ یعنی جب حشر و نشر ہو چکے گا، جنت میں جانے والے جنت میں چلے جائیں گے تو حسنؑ و حسینؑ کو جنت میں جانے والوں کی سرداری مل جائے گی، یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے۔

حدیث میں حضورؐ ارشاد فرما رہے ہیں الحسن والحسین سید ا
شباب اھل الجنّۃِ اور TECHNICAL TERM یہ ہے کہ قرآن وحدیث
کی اصطلاح میں جنت والوں کو اہل الجنۃ نہیں کہا جاتا اَصحاب الجنۃ
کہا جاتا ہے۔ کسی ایک منزل پر قرآن مجید میں آپ مجھے دکھا دیں کہ
جہاں جنت والوں کو اہل الجنۃ کہا گیا ہو یا جہنم والوں کو اہل النّار کہا گیا
ہو۔ سورۂ حشر میں ارشاد ہوتا ہے کہ لَا یَسْتَوِیْ اَصْحٰبُ النَّارِ وَ
اَصْحٰبُ الْجَنّۃِ جنت والوں کو کیا کہا جا رہا ہے' اصحاب الجنۃ۔ جہنّم
والوں کو کیا کہا جا رہا ہے' اصحاب النّار۔ آیۃ الکرسی آپ پڑھتے رہتے
ہیں، اس میں بھی یہی آئے گا آخر میں کہ اُولٰئِکَ اَصْحٰبُ النَّار۔
اب وقت کم ہے میرے پاس ورنہ جتنی کہیے میں آیتیں آپ کے سامنے
پیش کر دوں۔ تو اب یہاں اصحاب الجنۃ ہوتا تو ہم کہتے کہ جنت والے'
تو رسولؐ اصحاب الجنۃ تو نہیں فرما رہے، فرما رہے ہیں اہل الجنۃ'
سید اشباب اھل الجنۃ۔

اب اہل کے معنی کیا ہیں، آئیے وہ بھی اسی منزل پر سمجھ لیں قرآن
کی روشنی میں۔ طوفان نوحؑ میں کشتی موجوں کے درمیان خدا کے
سہارے پر چل رہی ہے۔ بیٹا کشتی پر سوار نہیں ہے۔ باپ نے کہا
بیٹا آجا کشتی پر سوار ہو جا۔ اس نے کہا میں اس پہاڑ پر جا رہا ہوں'
یہ پہاڑ مجھے بچا لے گا۔ حضرت نوحؑ نے فرمایا کہ وہ بلند پہاڑ عذابِ
الٰہی سے تجھے بچا نہیں سکے گا۔ بیٹا چلا آ! اس کشتی پر، اس نے کہا کہ

نہیں۔ اب قرآن کہتا ہے کہ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ
بس ابھی یہی گفتگو ہو رہی تھی کہ ادھر ایک موج اٹھی اور بیٹا ڈوبنے لگا۔
اب حضرت نوحؑ نے تڑپ کر کہا کہ پالنے والے! تو نے یہ وعدہ کیا تھا کہ
تیرا جو اہل ہوگا وہ نہیں ڈوبے گا۔ یہ میرا بیٹا میرے اہل سے ڈوب
رہا ہے۔ کہا یٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ
اے نوحؑ! تمھارا بیٹا تو یہ ہے مگر تمھارا اہل نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ بیٹا
ہے مگر اس کا عمل درست نہیں ہے، اس کا کردار درست نہیں ہے،
یہ بیٹا ہے مگر تمھارے شایان شان نہیں ہے۔

سمجھ گئے بھئی بات آپ اب! اہل کے معنی کیا ہیں؟ شایانِ شان
ہونا۔ یہ اہل تو وہ ہے کہ جو اردو میں استعمال ہوتا ہے۔ اب ایک صاحب
آئے منبر پہ، اور آکر مجلس پڑھنے لگے۔ کبھی مجلس نہیں پڑھی تھی اس
لیے ہاتھ پیر کانپنے لگے، پسینے چھوٹنے لگے، گھبرانے لگے، تو کسی صاحب
نے کہا کہ منبر پر جانے کا شوق تھا مگر منبر پہ جانے کے اہل نہیں تھے۔
ہو گئی نا بات۔ اور کوئی آدمی آیا اور اس نے روانی کے ساتھ تقریر شروع
کر دی تو آپ نے کہا کہ ہاں یہ شخص جو آیا ہے منبر پہ آنے کا اہل ہے۔

تو اس کا مطلب ہے ELIGIBLE اہل کے معنی ہوتے ہیں۔

اب حضورؐ کی حدیث کا مطلب کیا ہوا؟ یعنی حضورؐ حسنؑ و حسینؑ
کی فضیلت نہیں بیان کر رہے ہیں بلکہ اپنا کارِ منصبی انجام دے رہے
ہیں۔ کارِ منصبی ہے یہ بتانا کہ کون جنت کا مستحق ہوگا اور کون میرے

بعد جنت کا مستحق نہیں ہو گا۔ تو یہ نہیں فرما رہے ہیں کہ حسنؑ و حسینؑ جوانانِ جنت کے سردار ہیں بلکہ یہ ارشاد فرما رہے ہیں کہ اگر تم کو یہ دیکھنا ہو کہ جنت میں جانے کا اہل کون ہے تو یہ دیکھنا کہ اس دنیا میں حسنؑ و حسینؑ کو سردار کون مان رہا ہے۔ اہل الجنۃ جو جنت کا اہل ہے، مستحق ہے وہ کون ہے؟ جو حسنؑ اور حسینؑ کو اپنا سردار مانے۔ اور میں اپنے اس استدلال کے اوپر ایک مقدس صحابی کے کردار سے CEMENT کر دوں۔

حضرتِ ابوہریرہ ضعیف، ریشِ مبارک سفید، جھکی ہوئی کمر، امام حسنؑ گزر رہے ہیں یہی امام حسنؑ، تو آپ نے سلام کیا امام حسنؑ کو یہ کہہ کر کہ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا سَيِّدِيْ اے میرے سردار آپ کو میرا سلام۔ جو اور صحابہ کرام تھے، انھوں نے یہ اعتراض کیا کہ آپ ایک بچے کو اتنے SENIOR صحابی ہو کر سلام کر رہے ہیں۔ تو فرمایا کہ کیا تم نے رسولؐ کی حدیث نہیں سنی ہے کہ حسنؑ و حسینؑ جنت والوں کے سردار ہیں۔

توجہ فرمائی آپ نے! تو اس کا مطلب یہ کہ پیغمبرؐ کے صحابی بھی سمجھ رہے تھے کہ وہاں کی سرداری کا سوال نہیں ہے یہیں کی سرداری کے اقرار کا سوال ہے ورنہ دنیا میں سردار کہہ کے کیوں سلام کرتے! اس کا مطلب یہ کہ ہر وہ شخص کہ جو جنت میں جانے کا اپنے کو ENTITLE بنانا چاہتا ہے ELIGIBLE بنانا چاہتا ہے تو رسولؐ یہ فرما رہے ہیں کہ تم کو یہ دیکھنا ہے کہ وہ دنیا میں حسن و حسینؑ کو اپنا سردار مان رہا ہے کہ نہیں؟ بس جو حسنؑ و حسینؑ کو اپنا سردار مان رہا ہو وہ

جنت میں جائے گا اور جو حسنؑ و حسینؑ کو اپنا سردار نہ مان رہا ہو وہ جنت میں جانے والوں کی LIST سے اپنا نام کٹوا رہا ہے۔ بات طے ہو گئی، کوئی اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔

اب میں ایک بات آپ کے سامنے عرض کر دوں کہ جو حسنؑ کو سردار مانے گا وہ کبھی حسنؑ سے مطالبۂ بیعت نہ کرے گا اور جو حسینؑ کو سردار مانے گا وہ کبھی حسینؑ سے مطالبۂ بیعت نہ کرے گا۔ جو حسنؑ سے مطالبۂ بیعت کرے وہ اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ ہم حسنؑ کو سردار نہیں مانتے اور جو حسینؑ سے مطالبۂ بیعت کرے وہ اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ ہم حسینؑ کو سردار نہیں مانتے۔ اور جو حسنؑ و حسینؑ کو سردار نہیں مانتا اس کا انجام رسولؐ بتا گئے ہیں۔ بس میں یہ کوشش کر رہا ہوں کہ دھیرے دھیرے میں اسی لائن پر آجاؤں، میرے ایک دوست کی فرمائش ہے کہ جو شبہات امام حسنؑ سے متعلق تھی ان کی وضاحت ہو جائے، تو اب یہ منزلت ہے اس کی جس کا نام ہے حسنؑ۔

برادران عزیز! آپ کو امام حسنؑ کے بارے میں کوئی بھی غلط فہمی نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ معاذ اللہ اگر امام حسنؑ کا مرتبہ امام حسینؑ کے مرتبہ سے ذرا بھی کم ہوتا تو رسولؐ کے برتاؤ میں فرق ہوتا۔ اب آپ دیکھ لیں کہ رسولؐ کا جو برتاؤ ایک کے لیے ہے وہی دوسرے کے لیے۔ حضورؐ کا جو سلوک ایک کے لیے ہے وہی دوسرے کے لیے۔ اگر سرداری دی اہلِ جنت کی تو دونوں کو۔ اگر اپنے چمن کا پھول کہا تو

دونوں کو۔ اگر عرشِ اعظم کا گوشوارہ کہا تو دونوں کو۔ اگر کاندھے پر بٹھایا تو دونوں کو۔ جو ایک کے ساتھ کیا وہی دوسرے کے ساتھ کیا۔ تو اس کا مطلب یہ کہ رسولؐ اپنے عمل سے بتا رہے ہیں کہ جو ایک کا مرتبہ ہے وہی دوسرے کا۔ اب امام حسنؑ کے بارے میں سیرتِ حسنؑ پر مزید روشنی ڈالتا مگر اس لیے کہ وقت چونکہ کم ہے اور دوسرے یہ کہ جو شبہات میرے دوست کو تھے MODERN HISTORY پڑھ کے، میں ذرا اس پر زیادہ زور دینا چاہتا ہوں حالانکہ سیرتِ امام حسنؑ کی مناسبت سے میں چاہتا تھا کہ کچھ واقعات کو آپ کے سامنے پیش کروں مگر چونکہ اب وقت نہیں ہے، تو امام حسنؑ کی سیرت کے بارے میں دو شبہے ہیں جن میں پہلا شبہ یہ ہے کہ امام حسنؑ، حسینؑ سے کمزور تھے اسی لیے امام حسینؑ کربلا میں یزیدؑ سے ٹکرا گئے اور حسنؑ اپنے دشمن سے ڈر گئے۔ اور کچھ لوگوں نے یہ کہا کہ امام حسنؑ کو دولت کی طمع تھی اس لیے کوفے کا خزانہ اور ایک مقدار درہم و دینار کی قبول کر لی، حکومت نہیں کی۔ میں آپ کے سامنے بالکل واضح الفاظ میں کہہ رہا ہوں۔ دیکھیے میرا عقیدہ یہ کہ دونوں امامؑ، میرا عقیدہ یہ کہ دونوں معصومؑ اور حضورؐ کی حدیث موجود ہے شیعہ اور سنی دونوں فرقوں میں جس کو ہمارے سُنّی علماء بھی برابر CODE کرتے رہتے ہیں۔ رسولؐ نے ارشاد فرمایا اِبْنَایَ هٰذَانِ اِمَامَانِ قَامَا اَوْ قَعَدَا۔ فرمایا کہ حسنؑ و حسینؑ دونوں اس امت کے امامؑ ہیں چاہے کھڑے ہوں چاہے بیٹھے رہیں۔ تو کھڑے اور بیٹھے رہنے کا مطلب کیا ہے؟ یہ مطلب تھوڑی ہے کہ کھڑے رہیں

اور بیٹھے رہیں۔ مقصد یہ ہے کہ حسنؑ اگر صلح کر کے بیٹھ جائیں تب بھی امامؑ ہیں، حسینؑ اگر جہاد کے لیے کھڑے ہو جائیں تب بھی امامؑ ہیں۔ ان کی صلح میں شبہ نہ کرنا، نہ ان کی جنگ میں شبہ کرنا۔ وہ جنگ بھی مشیت الٰہی کی تکمیل ہے یہ صلح بھی مشیتِ الٰہی کی تکمیل ہے۔ لیکن بہر حال لوگ کہتے ہیں کہ جب دونوں امامؑ ہیں اور دونوں معصوم ہیں تو دونوں کی راہوں میں فرق کیوں ہو گیا؟ ایک نے صلح کیوں کی اور ایک نے جنگ کیوں کی؟ صلح کرتے تو دونوں کرتے، جنگ کرتے تو دونوں کرتے، یا تو حسینؑ بھی یزید سے صلح کر لیتے یا حسنؑ بھی امیرِ شام سے جنگ کرتے۔

میں سمجھتا ہوں کہ آج کے بعد آپ کو یہ شبہ شاید کبھی نہ ہو۔ ابھی میں بھی یہی کہہ رہا ہوں کہ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ ایک صلح کرے اور ایک جنگ کرے۔ آپ صحیح کہہ رہے ہیں، میں بھی آپ کی آواز سے آواز ملا کر کہتا ہوں اور کوئی یہ ثابت کر دے کہ امام حسینؑ اور امام حسنؑ کی راہوں میں فرق ہو گیا تو نہ میں اُن کو امام مانوں گا نہ اِن کو امام مانوں گا۔ اس لیے کہ باطل کی راہوں میں فرق ہوتا ہے، حق کی راہوں میں نہیں۔ آپ کہیں گے کہ یہ کیسی بات آپ کہہ رہے ہیں یہ تو HISTORICAL FACT ہے، یہ تو تاریخی حقیقت ہے کہ حسنؑ نے صلح کی اور حسینؑ نے جنگ کی۔ میں کہتا ہوں کہ یہ حقیقت نہیں ہے۔ یہیں تو آپ کو غلط فہمی ہے۔ یہیں پر تو آپ بات سمجھ نہیں رہے ہیں۔

برادرانِ عزیز! آپ تاریخ کو پڑھ کر اندازہ لگائیں حسنؑ نے صلح

نہیں کی اور حسینؑ نے جنگ نہیں کی۔ حسنؑ سے صلح کی گئی حسینؑ سے جنگ کی گئی۔ یہ "نے" اور "سے" کا فرق بڑی قیامت کا ہے۔ (صلواۃ)

امام حسنؑ نے صلح نہیں کی اور نہ امام حسینؑ نے جنگ کی۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ امام حسنؑ سے صلح کی گئی تھی، امام حسینؑ سے جنگ کی گئی تھی۔ تاریخ کو پڑھ لیجیے۔ اگر امام حسنؑ کی طرف سے امیر شام کے پاس جا رہا ہو پیغام صلح کا، مجھ میں لڑنے کی طاقت نہیں، مجھ سے صلح کر لو تو حسنؑ صلح کر رہے ہیں۔ اور اگر ادھر سے سفید کاغذ' WHITE PAPER آ رہا ہو کہ جو چاہے لکھ کے بھیج دیجیے، ہم صلح کرنے کے لیے تیار ہیں۔ تو حسنؑ صلح کر رہے ہیں کہ امیر شام صلح کر رہا ہے؟ اور حسینؑ تو کربلا کے میدان میں شبِ عاشور تک کہتے رہے کہ کیوں مجھ سے جنگ کرتے ہو، چھوڑ دو مجھے میں ہندوستان چلا جاؤں، چھوڑ دو مجھے کہ میں سرحدوں پر چلا جاؤں، چھوڑ دو مجھے کہ میں مدینے واپس ہو جاؤں۔ تو حسینؑ کہاں جنگ کے لیے گئے تھے؟ حسینؑ تو شبِ عاشور تک چاہتے ہیں کہ جنگ نہ ہو۔ تو ملاحظہ کیا آپ نے کہ نہ حسنؑ نے صلح کی نہ حسینؑ نے جنگ۔ حسنؑ سے صلح کی گئی اور حسینؑ سے جنگ کی گئی۔ پہلے باطل نے صلح کے ذریعے سے حق کو دبانا چاہا تھا اور بظاہر کامیابی بھی ہو گئی تھی۔ لیکن جب محسوس کرنے والے نے محسوس کیا کہ فراستِ ربانی نے ہم کو شکستِ فاش دے دی ہے تو باطل نے اپنی چال بدلی کہ صلح سے وہ کام نہ ہو سکا تو جنگ سے وہ کام کراؤ۔ یاد رکھیے کہ صلح کے پردے میں بھی حسنؑ نے شکست دی اور

طرح بچالیا گیا۔ اس فرق کے ساتھ کہ ان کو آسمان پر اٹھا کر بچایا گیا اور ابو تراب کے وارث کو زمین پر رکھ کر بچایا گیا۔

بہر حال ترجمۂ آیت آپ سماعت فرما چکے۔ اس آیت کے ذیل میں ان مسائل پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا جو آج کے زمانہ کی پیداوار ہیں۔

جو فرقے پیدا ہو کر فنا ہو گئے اب ان کی تردید کرنا ایسا ہی ہے جیسے مردہ پہلوانوں سے لڑنے کی کوشش کرنا۔ ہمیں ان مجلسوں کے ذریعہ اپنے نوجوانوں کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ آج کے پہلوانوں کو چت کر سکیں۔ جدید شبہات کا جواب دے سکیں۔ شیطانی ملک کے نئے نئے جالوں کو سمجھ سکیں اور اس کا توڑ کر سکیں۔

آپ مغرب کی جس سرزمین پر بیٹھے ہیں یہاں سب سے زاید شور HUMAN RIGHTS حقوق انسانی کا ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ ان کے نزدیک انسان صرف وہی ہے جس کی چمڑی سفید ہو۔ سونلی کھال والے یا سیاہ رنگ والے انسان ہی نہیں ہوتے۔ اس لیے نہ ان کا کوئی حق ہے نہ کوئی RIGHT۔ ہمیں اختیار ہے کہ ہم جس طرح چاہیں ان کو لوٹیں، ان کا استحصال کریں، ان کو ماریں، برباد کریں، ان کو احتجاج کا بھی حق نہیں۔

عزیزو! آج کا زمانہ حقیقتاً بڑا خطرناک زمانہ ہے، آج کفر کا دور نہیں نفاق کی حکمرانی ہے۔ آج کے حالات کے پس منظر میں یہ بات عرض کر رہا ہوں کہ آج کوئی امریکن جب زہر دینا چاہتا ہے تو زہر کی شکل میں نہیں

جنگ کے پردے میں بھی حسینؑ نے شکست دی۔ انجام دونوں کا ایک ہوا۔

بس میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ دیکھیے حقیقت کی بات ہے، عقیدت کی بات نہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ کربلا میں حسینؑ نے اسلام کو زندہ کر دیا اور شریعت کو بچالیا۔ کیا زندہ کیا؟ آپ بتائیے، کیا شہادت حسینؑ سے پہلے مسلمان شراب پینے لگے تھے آج نہیں پیتے ہیں۔ بس مجھ سے کہلوائیے نہیں بھائی صاحب! ابھی میں جب یہاں لکھنؤ سے آرہا تھا تو میرے آنے سے کچھ روز پہلے سعودی عرب کا ایک BUSINESS DELEGATION وفد ہندوستان آیا ہوا تھا اور انھوں نے یہ عنایت فرمائی کہ لکھنؤ بھی تشریف لائے اور لکھنؤ میں جو کلارک اودھ فائیو اسٹار ہوٹل ہے، وہاں انھوں نے قیام فرمایا۔ تو لکھنؤ کے جو بڑے بڑے ایجنٹ تھے وہ ڈھونڈتے پھر رہے تھے WINE کہ لکھنؤ میں سب سے قیمتی اور کہنہ شراب کہاں ملتی ہے؟ جو اُن کی خدمت میں پیش کی جائے۔ اب مسلمانوں کی ناک یہاں سے کٹی کہ یہ سعودی عرب کے شیوخ ہیں۔ جبھی تو آج مسلمان شراب نہیں پیتے ہیں، پیتے ہیں آج بھی۔ تو مسلمان شہادتِ حسینؑ سے پہلے بدکاریاں کرتے تھے آج بھی کرتے ہیں۔ لاس اینجلس میں جو یہ ابھی سعودی پرنس کا حشر ہوا ہے وہ آپ کے پیش نظر ہے۔

تفصیل میں نہیں جانا ہے۔ جو کام مسلمان پہلے کرتے تھے بحمد اللہ آج بھی کرتے ہیں، اس سے زیادہ کرتے ہیں، تو کربلا کی شہادت سے کیا حاصل ہوا؟ کیا اسلام زندہ ہو گیا، کون سا اسلام پلٹ گیا، کون سا

انقلاب آگیا؟ حسینؑ نے اسلام کو زندہ کردیا۔ اس کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ اب شراب کوئی مسلمان نہیں پیے گا، اب بدکاری کوئی مسلمان نہیں کرے گا، نمازی ہوجائیں گے اب سارے مسلمان۔ یہ مطلب تھوڑی ہے مطلب یہ تھا کہ یزید کا زمانہ آتے آتے گڑبڑی یہ ہوگئی تھی کہ جو مسلمان کررہے تھے، اسی کو اسلام سمجھا جارہا تھا۔ حسینؑ نے اپنے خون ناحق سے ایک LINE OF DESTINCTION خطِ فاصل بیچ میں کھینچ دیا کہ اسلام اور ہے مسلمان اور ہیں۔ حسینؑ نے اپنے خون ناحق سے ایک خطِ امتیاز کھینچ دیا کہ کربلا تک معاملات گڈمڈ تھے۔ اب یہاں سے لائن الگ ہے۔ مسلمانوں کے کرتوت الگ ہیں اسلام کے اصول الگ ہیں۔ اب مسلمانوں کے کسی کام کی ذمہ داری اسلام پر نہیں آسکتی۔ تو اس کا مطلب یہ کہ کربلا سے جو کچھ حاصل ہوا وہ یہ کہ باطل اور حق کے درمیان ایک LINE OF DESTINCTION ہوگئی۔

کسی شیعہ تاریخ کا حوالہ نہیں پیش کررہا ہوں، برادرانِ اہل سنت کے بڑے ماہر لکھنے والے ہیں ایک محترم بزرگ جو بہت زیادہ خفا ہیں، ان کی کتاب ہے صواعقِ محرقہ۔ بہت بڑے عالم ہیں اور بہت مشہور شخصیت ہیں تو انھوں نے اپنی کتاب میں جو شرطیں تحریر فرمائی ہیں، علامہ ابن حجر مکّی صواعق محرقہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ مندرجہ ذیل شرطوں پر صلح ہوئی۔ امام حسنؑ نے سب سے پہلی شرط رکھی وہ یہ ہے کہ امیرِ شام کو اس

بات کا اقرار کرنا پڑے گا کہ وہ کتابِ خدا اور سنت رسولؐ کی پابندی کریں گے۔ میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں بھائی صاحب! صلح نامہ کس شے پر ہوتا ہے DISPUTED MATTER پر ہوتا ہے نا؟ مختلف جو باتیں ہوتی ہیں اسی پر تو صلح نامہ ہوتا ہے۔ تو امام حسنؑ کا پہلے ہی یہ شرط رکھنا کہ یہ کتاب خدا اور سنت رسولؐ کی پابندی کیا کریں گے اور ان محترم کا آنکھیں بند کر کے اس پر دستخط کر دینا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ صلح نامہ نہیں ہو رہا ہے، یہ امام حسنؑ CHARGE SHEET پیش کر رہے ہیں جس پر دشمن دستخط کر رہا ہے۔ یعنی اس بات کا اقرار ہو رہا ہے کہ آج تک ہم نے پابندی نہیں کی تھی اور اگر پابندی ہوتی تو کہتے کہ یہ شرط ہی مہمل ہے، ہم تو خود ہی پابندی کر رہے ہیں۔ تو اس شرط پر دستخط کر دینا اس بات کی دلیل ہے کہ امام حسنؑ نے فراست ربّانی سے کام لیتے ہوئے دنیا کو دکھا دیا کہ اب تک کیا ہو رہا تھا۔ اب سمجھیں حق، حق ہو گیا باطل، باطل ہو گیا۔

پھر کتاب خدا اور سنت رسولؐ پر عمل ہوا کہ نہیں، یہ ہم تاریخ سے پوچھیں اور ایک شبہ یہ بھی ہے کہ امام حسنؑ نے روپیہ لے لیا تھا کوفہ کا خزانہ، کہا تھا کہ مل جائے اور اتنے ہزار درہم مجھے سالانہ ملا کریں۔ یہ بھی فراست ربّانی ہے، آپ اس کو سمجھ لیں۔ حسنؑ جانتے تھے کہ آئندہ آنے والے زمانے میں ناسمجھ انسان مجھ پر الزام لگائیں گے کہ ہم نے دب کر صلح کر لی تو حسنؑ نے روپئے کے مطالبے کی شرط رکھ کر دنیا کو

بتا دیا کہ حسنؑ دب کر صلح نہیں کر رہے ہیں بلکہ اپنے مطالبے کو منوا کر صلح کر رہے ہیں اور پھر آپ کو معلوم ہے، روپیہ جو آیا یہ روپیہ غریبوں پر صرف ہوتا تھا، یہ بیواؤں پر صرف ہوتا تھا، یہ یتیموں پر صرف ہوتا تھا۔ میں صلح حسنؑ کے بارے میں کچھ اور باتیں عرض کرتا لیکن اب صرف ۲۰ منٹ میرے پاس رہ گئے ہیں اور کچھ ضروری باتیں ہیں جو جلدی جلدی عرض کر دوں۔

اب دوسرا اعتراض جو امام حسنؑ پر کیا جاتا ہے وہ یہ کہ امام حسنؑ نے شادیاں بہت کیں، نکاح بہت کیے۔ اچھا اب وہ میں آپ کو بتا دوں کہ کتنے نکاح کیے ہیں؟ الحمد للہ! اگر آپ تاریخ میں مطالعہ کریں گے تو ستّر سے تعداد شروع ہوتی ہے، ستّر سے کم تو بات ہوتی ہی نہیں اور اس کے بعد ستر سے بڑھ کر کے دو سو اور دو سو سے بڑھ کر کے تین سو اور تین سو سے بڑھ کر کے پانچ سو اور اس سے بڑھ کر سات سو اور سات سو سے بڑھ کر کے ایک ہزار اور ایک ہزار پہ آ کے معاملہ اس لیے رک گیا کہ میں نے عرض کیا آپ کے سامنے کہ ہزار کے آگے گنتی ہی نہیں تھی۔ یہ سچ ہے کہ عربی زبان میں اَلف کے آگے گنتی ہی نہیں تھی اس زمانے میں ورنہ پہنچاتے وہ ایک MILLION تک۔

تو ایک ہزار شادیاں امام حسنؑ نے کیں۔ اچھا تو کی ہوں گی مگر میں تمام اپنے برادرانِ اسلامی سے چاہے وہ شیعہ بھائی ہوں چاہے سُنّی بھائی ہوں، ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ایک ہزار شادیاں جو

امام حسنؑ نے کی ہیں، پہلے میں اس کے بارے میں ایک سوال کر لوں اور ایک حقیقت آپ کو بتا دوں۔ بہت سے علمائے اہل سنّت نے یہ بات لکھی ہے کہ اصل میں امام حسنؑ بہت سی شادیاں کرنے کے لیے مجبور تھے۔ مجبوری یہ ہے کہ ہر انسان چاہتا تھا کہ رسولؐ سے اس کی قرابت داری ہو جائے۔ تو اب کوئی رسولؐ کا بیٹا تو بن نہیں سکتا تھا، رسولؐ کا پوتا اور نواسہ تو بن نہیں سکتا تھا، یہی رشتہ امکان میں تھا کہ سسرالی قرابت رسولؐ سے کر لی جائے۔ لہٰذا ہر مسلمان یہ چاہتا تھا کہ چاہے دو چار روز کے لیے ہی سہی مگر اس کی بیٹی یا بہن رسولؐ کی بہو بن جائے اس لیے از خود (بہت سے علمائے اہل سنت نے یہ نکتہ تحریر فرمایا ہے کہ) از خود وہ لوگ تشریف لاتے تھے، حضورؐ سے رشتہ قائم کرنے کی درخواست کرتے تھے، امام حسنؑ سے درخواست کرتے تھے کہ ہم بھی یہ شرف چاہتے ہیں اور امام حسنؑ مجبور ہو جاتے تھے۔

خیر، میری سمجھ میں تو یہ بات آتی نہیں کہ اگر ایسا ہی تھا تو سارا LOAD امام حسنؑ ہی پر کیوں؟ امام حسینؑ بھی تو تھے۔ تو بس یہ بات طے ہو گئی کہ ان شادیوں کا پس منظر یہ ہے کہ کیونکہ لوگ حضورؐ اکرم سے قرابت کرنا چاہتے تھے تو جب پس منظر یہ ہے تو جن لڑکیوں کی شادی ہو گئی ان کے ناموں کو تاریخ چھپائے گی نہیں بلکہ اجاگر کرے گی۔ یہ بھی رسولؐ کے قرابت دار، یہ بھی رسولؐ کے قرابت دار، یہ بھی رسولؐ کے قرابت دار۔ اب میں تمام برادرانِ عزیز سے عرض کرتا ہوں، چاہے وہ میرے شیعہ

بھائی ہوں چاہے وہ میرے سُنّی بھائی ہوں، سبھی سے کہ یہ ایک ہزار بیویاں امام حسنؑ کی ہیں، ان کے مجھے نام و پتے دے دیں اور میں اس بات کا اختیار دیتا ہوں کہ تاریخ سے نہیں بلکہ تاریخوں سے آپ چندہ کرلیں چندہ ایک نام یہاں سے لے لیں ایک وہاں سے لے لیں، آدھا یہاں سے لے لیں کچھ وہاں سے اور ایک ہزار بیویوں کے نام و پتے مجھے بتادیں۔ تو برادران عزیز! میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ پوری تاریخ اسلام کو آپ چھان ماریں گے تو ایک ہزار بیویوں میں سے پانچ سو نام بھی نہیں ملیں گے سو نام بھی نہیں ملیں گے، پچاس بھی نہیں ملیں گے، پچیس بھی نہیں ملیں گے پندرہ بھی نہیں ملیں گے، بارہ بھی نہیں ملیں گے۔ زیادہ سے زیادہ نوؔ نام ملیں گے۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ نوْ نام تو ہم کو ملے اور یہ نو سو اکیانوے کدھر چلے گئے؟ بس حضرات نہ نام ملتا ہے نہ پتہ نہ نشان۔ مطلب یہ کہ حسنؑ پر الزام لگانے والوں نے FIGURES تو گڑھ لیے مگر نام لکھنا....

بس ایک ذرا سا DELECATE ہے صاحب! غور سے سن لیجیے، اگر آپ نے توجہ سے نہ سنا تو یہ فقہی مسئلہ ہے، ممکن ہے کہ آپ کو میرے ہی بارے میں شبہ ہونے لگے میں کیا الٹی سیدھی بات پڑھ کر چلا گیا۔ تو ذرا سا خدارا توجہ سے آپ سماعت فرمائیں تو مجھے امید یہ ہے کہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اسلام میں بیشک اس بات کی اجازت ہے کہ بعض CIRCUMSTANCES میں حالات میں ایک انسان کو یہ اختیار ہے کہ وہ آج ایک شادی کرے اور اگر اس میں ہمت ہو تو کل دوسری

شادی کرلے اور اگر اور ہمت ہو تو پرسوں تیسری شادی کرلے اور اگر اور ہمت ہے تو چوتھی شادی کرے چار دن میں۔ اس لیے کہ ایک آدمی کے اٹھانے کے لیے چار ہی کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ اسلام نے بھی شادیاں صرف چار رکھی ہیں کہ جنازہ اطمینان سے اٹھ جائے۔ تو خیر بہرحال یہاں تک تو دیکھیے گنجائش ہے۔ اب رہا یہ فتویٰ، اس میں کوئی شیعہ سنّی کا اختلاف نہیں ہے کہ چار دن میں انسان نے چار شادیاں کرلیں، اب وہ کہتا ہے کہ میں پانچویں شادی اور کروں گا۔ ایک مولوی صاحب کے پاس گیا کہ مجھے ایک شادی اور کرنا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کسی ایک کو طلاق دینا ہوگی تب پانچویں شادی آپ کر سکتے ہیں۔ ہے نا، طلاق دینے کے بعد۔ (بھئی بہت یہاں پر یہ نازک موڑ ہے، اچھی طرح سمجھ لیجیے ورنہ گھبرا جائیے گا۔)

اسلام میں حکم یہ ہے کہ طلاق دینے کے بعد بھی تقریباً تین مہینے تک یا اس سے کچھ زیادہ عورت بیوی تو نہیں ہوتی مگر بیوی کے حکم میں ہوتی ہے۔ اس PERIOD میں نان و نفقہ، روٹی، کپڑا، دیکھ بھال سب شوہر پر واجب ہے۔ توجہ فرمائی آپ نے! اب چونکہ یہ ایک طرح سے ابھی اس کی بیوی چلی آرہی ہے، اگر دوبارہ میل کرنا چاہے تو دوبارہ نکاح پڑھوانے کی ضرورت نہیں ہے، بس جائے گلے مل جائے قصہ ختم ہو جائے گا کیونکہ بیوی ہی چلی آرہی ہے، وہ PERIOD چل رہا ہے عدّت کا۔ البتہ اگر تین سوا تین مہینے کا یہ عرصہ ختم ہو جائے تو پھر وہ اس کی

بیوی نہیں رہتی۔ اب اگر دوسرا نکاح کرنا چاہے تو پھر شرط اس کی طلاق دینے کی نہیں رہتی۔

توجہ فرمائی آپ نے! تو اس کا مطلب یہ کہ چار شادیاں تو انسان چار دن میں کر سکتا ہے۔ مگر اس کے بعد ہر شادی کے لیے یہ تین سوا تین مہینے کا GAP شرعی اعتبار سے ضروری ہے جس میں کسی فرقے میں اختلاف نہیں ہے۔ امام حسنؑ کی زیادہ سے زیادہ عمر ہے سینتالیس برس۔ پہلی شادی کی ہے امام حسنؑ نے بہ اتفاق تاریخ شیعہ و سنّی دونوں بائیسویں برس میں۔ تو اس کا مطلب ہے کہ پچیس سال کل بچتے ہیں کہ جس میں امام حسنؑ شادی کر سکتے ہیں۔ ایک ہزار شادیاں کرنے کے لیے زیادہ نہیں صرف ساڑھے تین سو برس کی عمر چاہیے جدید علمِ منطق میں اس کو TIME FACTOR کہتے ہیں کہ جو بات آپ بیان کر رہے ہیں وہ اس TIME FACTOR سے ممکن بھی ہے۔ بس اب اس سے زیادہ عرض کرنے کا موقع نہیں۔

برادرانِ عزیز! اگر آپ کو یہ دیکھنا ہے کہ امام حسنؑ نے صلح کرنے کے بعد معاذ اللہ شکست پائی تھی یا امام حسنؑ نے صلح کرنے کے بعد فتح پائی تھی۔ ہر برائی میں ایک بھلائی کا پہلو ہوتا ہے، جس کا اثر ختم ہو جاتا ہے اسے DEAD تصوّر کرتے ہیں، مگر امیرِ شام کا امام حسنؑ کو زہر دلوانا جعدہ بنت اشعث کے ذریعہ سے اس بات کا اعلان ہو رہا ہے کہ حسنؑ نے صلح کے پردے میں اگر ہم کو شکست نہ دے دی ہوتی تو ہم

ان کی زندگی کا خاتمہ نہ کرتے۔ زہر دے دیا گیا اور امام حسنؑ دنیا سے رخصت ہونے لگے۔ وصیتیں کرنا شروع کر دیں، ایک بچہ تین چار برس کے سن کا آگے بڑھا جس کا نام تھا قاسمؑ۔ بچہ رو رہا تھا، تڑپ رہا تھا، یتیمی کا احساس ستا رہا تھا۔ باپ نے قریب بلایا، سینے سے لگایا پیار کیا اور ایک کاغذ کا ٹکڑا تعویذ کی شکل میں بازو پر باندھ دیا۔ کہا بیٹا، بیٹا! روؤ نہیں، تم پر ایک وقت اس سے بھی زیادہ سخت آئے گا۔ جب وہ سخت وقت آجائے تو اس کاغذ کو کھول کر دیکھ لینا اور جو اس میں لکھا ہو اس پر عمل کرنا۔

عزادارانِ حسینؑ! حسنؑ دنیا سے رخصت ہو گئے، جنازے پر مسلمانوں نے تیر بارانی کی، ان واقعات کو آپ کے سامنے پیش نہیں کرنا ہے۔ یہاں تک کہ اب حسینؑ امام وقت ہیں۔ تاریخوں پر تاریخیں گزرنے لگیں، سال پلٹنے لگے اور ایک وقت وہ بھی آگیا کہ جب حسینؑ مجبور ہو گئے مدینہ چھوڑنے کے لیے تو جہاں سب چل رہے ہیں ساتھ ساتھ وہاں یہ بچہ بھی جو حسنؑ کی شہادت کے وقت تین چار سال کا تھا اور اب تیرہ چودہ برس کا ہے، حسینؑ کے ساتھ ہے۔

روایت بتاتی ہے، تصریح کر دی ہے روایت نے۔ قاسمؑ کی عمر کا آپ اس سے ہی اندازہ کر لیں کہ جب، مدینے سے قافلہ روانہ ہو رہا تھا تو یہ شاہزادہ اتنا کم سن تھا کہ اسے عورتوں کے ساتھ محمل میں بٹھایا گیا تھا۔ اور جب کربلا کے میدان میں حسینؑ آگئے۔ دوسری محرم کو حسینؑ کربلا

پہنچے۔ چوتھی محرم سے لشکر پر لشکر آنا شروع ہو گئے اور کہیے تو آپ کو یاد دلا دوں کہ آج ساتویں شب ہے، ساتویں کا دن جب آیا تو حسینؑ اور حسینؑ کے ساتھیوں پر پانی بند ہو گیا۔ آٹھویں گزری پیاس سے تڑپتی ہوئی نویں گزری پیاس سے تڑپتی ہوئی یہاں تک کہ عاشور کی صبح نمودار ہو گئی۔ سارے امتحانات ختم ہو گئے اور حسینؑ و حسینؑ کے ساتھی کربلا کے میدان میں اپنی شہادت پیش کرنے کے لیے اپنی کمریں کس رہے ہیں۔

ہاں عزادارانِ حسینؑ! اس سے پہلے شبِ عاشور بھی آئی تھی آج دنیا کتنا ADVANCE ہو چکی ہے۔ آج دنیا کتنی بدل چکی ہے، مگر آج بھی COURT MARTIAL کا قانون چلتا ہے۔ یہ فوجی عدالت کا قانون کیا ہے کہ اگر کوئی سپاہی میدانِ جنگ سے بھاگنے لگے تو اسے زندہ رہنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ آج کی MODERN دنیا میں بھی یہ قانون چلا کرتا ہے اور یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ کسی ایک شخص نے ویت نام (VIETNAM) کی جنگ میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا تھا تو اسے جیل میں ڈال دیا گیا۔ یہ MODERN دنیا ہے مگر حسینؑ کربلا کے میدان میں اپنے ان مختصر سے ساتھیوں کو جو ہزاروں کے لشکر کے مقابلے میں جمے ہیں، ایک خطبۂ فصیح و بلیغ کے بعد یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ میں اپنی بیعت تمھاری گردنوں پر سے اٹھائے لیتا ہوں، تمھارا جس طرف جی چاہے چلے جاؤ میں تم سب کو آزاد کرتا ہوں اور یہ بتائے دیتا ہوں کہ یہ جب مجھ کو پا لیں گے تو پھر تم کو تلاش نہیں کریں گے اور اس کے بعد جب حسینؑ نے دیکھا کہ

بلکہ آپ کو تازہ واقعات معلوم ہیں، دوا کے کیپسول کو کھول کر اس میں سے دوا نکال کر اور اس کی جگہ زہر بھر کر دواخانوں کو سپلائی کر دیتا ہے۔ کیپسول سر کے درد کا ہوتا ہے مگر اس کیپسول میں درد کو مارنے والی دوا نہیں ہوتی آدمی ہی کو مار ڈالنے والا زہر ہوتا ہے۔

ہمیں حقوق انسانی کا جو کیپسول دیا جا رہا ہے یہ کیپسول تو چمک دار ہے۔ صاف شفاف ہے مگر اس کے اندر ہمارا خون چوس لینے والا زہر بھرا ہوا ہے۔

آپ حقوق انسانی کے تحفظ کے ان کھوکھلے نعروں سے گمراہ نہ ہوں۔ اسلام سے زاید حقوق انسانی کا محافظ کون ہو سکتا ہے؟ اسلام جب حقوق انسانی کی بات کرتا ہے تو تکریم انسان کے اس دائرہ میں سب ہی آجاتے ہیں خواہ وہ دوست ہوں یا دشمن، اپنے ہوں یا پرائے، سیاہ ہوں یا سفید، غریب ہوں یا امیر، کافر ہوں یا مسلم، مومن ہوں یا مشرک۔

میں حق بات کہتا ہوں کہ عیسائیت نے نعوذ باللہ حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا بنا کر بھی وہ رتبہ نہیں دیا جو اسلام نے مسلمانوں کو نہیں بلکہ عام انسانوں کو، سب ہی انسانوں کا دیا ہے۔

روایت بتاتی ہے کہ حضرت آدم زمین پر آچکے، ترک اولیٰ کا احساس ہے ندامت ہے، شرمندگی ہے کہ اسی عالم میں جبرئیلؑ آئے اور کہا کہ آدمؑ! اللہ نے کہلوایا ہے کہ تم زمین پہ آگئے، جو ہونا تھا سو ہو گیا اب یہ بتاؤ کہ اگر میں، یعنی خدا فرماتا ہے کہ "میں کبھی تمھارے دروازہ پہ آ کر کہوں کہ

کوئی نہیں اٹھتا۔ تو کہا کہ اچھا یہ چراغ جو خیمے میں جل رہا ہے ممکن ہے کہ تم کو میری صورت دکھائی دے رہی ہو اور حجاب معلوم دے رہا ہو تو لو میں چراغ کو خاموش کیے دیتا ہوں۔ چراغ خاموش ہو گیا خیمے میں تاریکی۔ مگر اب صورتیں تو نہیں دکھائی دے رہی ہیں مگر آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ کوئی کہہ رہا ہے فرزندِ رسولؐ! آپ کب تک ہمارا امتحان لیں گے؟ کسی نے کہا یہ تو بتائیے کہ ہم اگر آپ کا ساتھ چھوڑ کر چلے جائیں تو کل حشر میں آپ کے نانا کو کیا جواب دیں گے؟ کسی نے کہا آپ کی مادر گرامی کو ہم کیا صورت دکھائیں گے۔ ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں کہ فرزندِ رسولؐ! ہم ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں مگر آپ کا ساتھ چھوڑنے پر تیار نہیں ہیں۔

جب سب اٹھ کر بیٹھ چکے، جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے تو ایک کونے سے یہی تیرہ چودہ برس کا بچہ اٹھا اور اس بچے نے اٹھ کے یہ سوال کیا کہ چچا جان! کیا دفترِ شہداء میں میرا بھی نام ہے تو حسینؑ نے کہا کہ یَا بُنَیَّ کَیْفَ الْمَوْتُ عِنْدَكَ اے بیٹا! پہلے یہ بتاؤ کہ موت تیری نظروں میں ہے کیسی؟ تو ارشاد فرمایا قاسمؑ نے یَا عَمّ أَحْلٰی مِنَ الْعَسَلِ۔ بابا! راہِ حق میں جان دینے میں تو شہد سے بھی زیادہ شیرینی ہوا کرتی ہے۔ جب امتحانِ قاسمؑ ہو چکا تو کہا حسینؑ نے کہ بیٹا! تم بھی شہید ہو گے اور تمہارا چھوٹا بھائی علی اصغرؑ بھی شہید ہو گا۔

روایت بتاتی ہے کہ اپنا نام سنا تو خوش ہو گئے اور چھوٹے بھائی علی اصغر کا نام سنا تو ایک مرتبہ گھبرا کر قاسمؑ نے کہا کہ کیوں چچا! کیا

یہ اشقیا خیموں میں چلے آئیں گے تو حسینؑ نے فرمایا کہ نہیں، میں علی اصغرؑ کو اپنی آغوش میں خود لے کر میدان میں جاؤں گا اور علی اصغرؑ تیرِ ظلم کا نشانہ بنے گا۔

عزادارانِ حسینؑ! تو اس کا مطلب یہ کہ قاسمؑ یہ تصور کرنے کو بھی تیار نہ تھے کہ اشقیا، خیموں میں دررانہ گھس آئیں گے۔ میں کہتا ہوں میرے شاہزادے! ذرا آکر بعد عصرِ عاشور دیکھو، خیموں سے دھواں بلند ہو رہا ہے، اشقیا، خیموں میں دررانہ گھسے چلے آ رہے ہیں۔

عزادارانِ حسینؑ! آج آپ کو اسی یتیم کا ماتم کرنا ہے۔ عزادارانِ حسینؑ! صبحِ عاشور نمودار ہو گئی۔ حسینؑ کا دفترِ قربانی کھل گیا۔ ایک کے بعد دوسرا مجاہد آگے بڑھ کر راہِ حق میں اپنی قربانی پیش کر رہا ہے، یہاں تک کہ انصار ختم ہو گئے، اصحاب کٹ گئے، اولادِ جعفرؑ کٹ گئی، اولادِ عقیلؑ کام آگئی تو اب قاسمؑ آگے بڑھے اور آگے بڑھنے کے بعد کہا کہ چچا، مجھے بھی اب اسلام پر قربان ہونے کی اجازت دیجیے۔

ہاں عزادارانِ حسینؑ! حسینؑ نے فرمایا کہ قاسمؑ، تم تو میرے بھائی کی یادگار ہو، ایک یتیم بچے کو کیسے مرنے کی اجازت دے دوں؟ حسینؑ انکار کر رہے ہیں قاسمؑ اصرار کر رہے ہیں۔ کسی صورت سے قاسمؑ کو اجازتِ جہاد دینے پر حسینؑ تیار نہیں۔ روایت بتاتی ہے کہ آخر قاسمؑ مایوس ہو گئے اور آکر خیمے میں سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ اب سوچ رہے ہیں اپنی جگہ کے اوپر کہ ہائے میری بدنصیبی کہ میرا چچا تلواروں میں گھرا ہوا

ہے اور مجھے مدد کرنے کی اجازت نہیں مل رہی ہے، اس سے بڑھ کے میرے لیے سخت وقت کیا ہو سکتا ہے۔ بس سخت وقت کے ساتھ فوراً ہی یہ خیال آیا کہ بابا جب دنیا سے جا رہے تھے تو انھوں نے کہا تھا کہ بیٹا' تم پر ایک سخت وقت آئے گا، جب سخت وقت پڑے تو اس تعویذ کو کھول کر دیکھنا۔ اب میری زندگی میں اس سے زیادہ سخت وقت اور کون سا ہو سکتا ہے کہ حسینؑ کا ایسا چچا دشمنوں میں گھرا ہے اور مجھے مدد کرنے کی اجازت نہیں مل رہی ہے۔ بازو پر سے تعویذ کھولا، پڑھا توجہ فرمائیے، تاریخ بتاتی ہے کہ اس کاغذ میں لکھا ہوا تھا کہ:

"میرے لال قاسمؑ! تم میرا یہ کاغذ اس وقت کھولو گے جب عاشور کے دن تمھارا چچا تم کو جہاد کی اجازت نہ دے رہا ہو گا میری طرف سے یہ تحریر لے جا کر اپنے چچا کو دکھا دینا اور میں حسینؑ سے یہ وصیت کرتا ہوں کہ وہ قاسمؑ کو میری طرف سے میرا نمائندہ سمجھ کر اسلام پر قربان ہونے کی اجازت دے دیں۔"

بس خوش ہو گیا شاہزادہ۔ تحریر لیے ہوئے چچا کے پاس آئے اور چچا کے پاس آئے اور کہا چچا چچا! بابا کی تحریر۔ حسینؑ نے اس تحریر کو دیکھا، آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے، بھائی کی تحریر کو پہچانا' اب وصیتِ حسنؑ سے مجبور ہو گئے۔ لیکن ابھی بھی بھتیجے کو اجازت دینے کو تیار نہیں ہیں۔ حمید ابن مسلم کے الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کر دوں' اس سے آپ کو اندازہ ہو گا قاسمؑ کی بے چینی کا۔ حمید ابن مسلم کہتا ہے کہ

جب وہ تحریر دیکھنے کے بعد بھی حسینؑ روتے رہے، بھتیجے کو اجازتِ جنگ دینے پر تیار نہیں ہو رہے تھے۔ قاسمؑ نے دیکھا کہ اب بھی مجھے اجازت نہیں ملتی ہے بس تڑپ تڑپ کر کبھی چچا کے ہاتھوں کو چومنا شروع کیا کبھی پیروں کو چومنا شروع کیا۔ چچا مجھے مرنے کی اجازت دے دیجیے، مجھے مرنے کی اجازت دے دیجیے۔ یہاں تک کہ روایت بتاتی ہے کہ جب حسینؑ نے دیکھا کہ بچہ یوں تڑپ رہا ہے اور اجازتِ جنگ لیے بغیر ماننے والا نہیں ہے تو میں نے یہ منظر کہیں نہیں دیکھا جو قاسمؑ کے یہاں نظر آتا ہے کہ حسینؑ نے قاسمؑ کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور چچا بھتیجے گلے مل کر اتنا روئے کہ روتے روتے زمینِ کربلا کے اوپر غش کھا کر گر گئے۔

عزادارانِ حسینؑ! آپ کے یہاں جب کوئی انسان غش کھا کر گر پڑتا ہے تو پانی کے چھینٹے دیے جاتے ہیں۔ آئیے اور آکر حسینؑ کے منھ پر پانی کے چھینٹے دے دیجیے، قاسمؑ کے رخسار کے اوپر پانی کے چھینٹے دے دیجیے مگر کربلا کے میدان میں پینے کے لیے پانی موجود نہیں چھینٹوں کے لیے پانی کہاں سے لایا جائے !!

بہر حال عزادارانِ حسینؑ! تھوڑی دیر کے بعد حسینؑ اٹھے، شاہزادہ بھی اٹھا۔ اتنا کم سن تھا یہ بچہ کہ خود گھوڑے پر سوار نہ ہو سکا۔ حسینؑ نے گود میں اٹھا کر گھوڑے پر سوار کیا۔ رکابیں اتنی نیچی تھیں کہ پاؤں رکابوں تک پہنچ نہ سکتے تھے اس لیے ایک رکاب پر زور دے کر گھوڑے پر سوار ہوئے۔ قد اتنا چھوٹا کہ کوئی زرہ ممکن نہ تھی، کوئی خود ممکن نہ تھا، کرتا

باریک پہنے ہوئے، اب حسینؑ نے ایک چھوٹا سا عمامہ سر کے اوپر باندھ دیا اور اس کے دونوں سرے تحت الحنک کی طرح سے دونوں طرف جھکا دیے۔ بس قاسمؑ روانہ ہوئے تو حسینؑ نے فرمایا کہ تَمْشِیْ یَا بُنَیَّ بِرِجْلِكَ اِلَی الْمَوْتِ۔ بیٹا! اپنے پیروں سے موت کی طرف جا رہا ہے۔ یہ دشمن ہیں، یہ خونخوار بھیڑیے تمہاری کم سنی پر ترس نہیں کھائیں گے۔ یہ تمہارے حُسن پر ترس نہیں کھائیں گے، یہ اس رشتے کو نہیں دیکھیں کہ جو تم کو رسولؐ سے حاصل ہے۔ بیٹا! موت کے منھ میں تم اپنی خوشی سے جا رہے ہو۔

حمید ابن مسلم کا بیان ہے، اللہ اکبر! کیا جملہ ہے۔ یہ لشکرِ یزیدی کا سپاہی ہے، مگر یہ کہتا ہے کہ میں نے دیکھا کہ جیسے ایک چاند حسینؑ کے خیمے سے نکلا اور شام کی بدلی میں آکر چھپ گیا۔ جب دشمن کی نظر میں یہ چاند تھا بچّہ تو حسینؑ کی نظر میں اس بچے کے حُسن کا عالم کیا ہوگا؟ اور بس میں آپ کو زیادہ زحمت دینا نہیں چاہتا۔ آئے اور آنے کے بعد بڑی شجاعت سے جنگ کی یہاں تک کہ پسرِ سعد کو اپنے مایۂ ناز پہلوان ازرق سے کہنا پڑا کہ یہ بچہ تہلکہ ڈالے دیتا ہے میرے لشکر میں، تیری نمک حلالی کب میرے کام آئے گی۔ جا، اور اس بچّے کا کام تمام کر۔ مگر وہ تکبّر کا پُتلا، کہا میں اس بچے سے لڑنے کے لیے جاؤں! یہ بچہ ہے، میں بھی اپنے بچے کو بھیجے دیتا ہوں، ابھی یہ جا کر اس کا کام تمام کر دے گا چنانچہ ازرق کا بیٹا آیا، آکر اس نے جنگ کی مگر دو ہی ایک ضربوں کے

بعد پروانۂ دوزخ قاسمؑ کی شمشیر نے اسے دیا اور وہ جہنم واصل ہوا۔ دوسرا بیٹا آیا وہ بھی قتل۔ تیسرا بیٹا آیا وہ بھی قتل۔ چوتھا بیٹا وہ بھی قتل۔ چار بیٹے لے کے آیا تھا ازرق کربلا کے میدان میں، چاروں قاسمؑ کی تلوار سے قتل ہو گئے۔ اس کی نظروں میں دنیا تاریک ہو گئی۔ یہ سیاہ ہاتھی کی طرح سے بڑھتا ہوا قاسمؑ کے سامنے آیا۔ حسینؑ دور سے کھڑے اس منظر کو دیکھ رہے ہیں کہ ایک گرگ باراں دیدہ، ایک زبردست پہلوان قاسمؑ کے مقابلے میں آیا جس کی عمر تیرہ چودہ برس کی ہے۔ ایک مرتبہ تڑپ کر درِ خیمہ پر گئے اور قاسمؑ کی ماں کو آواز دی کہ ام فروہ! (حسنؑ کی بیوہ) جاؤ جاکر اپنے بچے کی کامیابی کے لیے دعا کرو، اس لیے کہ اللہ بیواؤں کی دعاؤں کو رد نہیں کیا کرتا ہے۔ تیرے لال کے مقابلے میں ایک بہت بڑا پہلوان آگیا ہے۔ بیوۂ حسنؑ گئی، سر کے بال کھول دیے، کہا بیبیوں آؤ میں اپنے بچے کی کامیابی کے لیے دعا کرتی ہوں، تم مل کر آمین کہو۔ اس بیوہ نے دعا کی کہ پالنے والے! تو میرے بچے کو غالب کر دے اس پہلوان کے اوپر اور اہلِ حرم نے آمین کہی اور قاسمؑ نے اس ملعون کو بھی قتل کر دیا۔

لیکن جب یہ احساس ہو گیا کہ ایک ایک کر کے مقابلہ کرتے رہیں گے تو جنگ طول پکڑتی جائے گی اور قاسم پر کوئی غالب نہ آسکے گا تو پسر سعد نے حکم دیا کہ اس حسینؑ کے ننھے سے سپاہی کو چاروں طرف سے گھیر لو، اب پورے لشکر نے ایک تنِ تنہا پر حملہ کر دیا مگر قاسمؑ اس عالم میں بھی جنگ کیے جاتے ہیں اور اللہ اکبر! بہادری کا عالم یہ تھا کہ کوئی قریب

نہیں آسکتا تھا۔ مگر روایت بتاتی ہے کہ اثنائے جنگ میں قاسمؑ کے جوتے کا تسمہ ٹوٹ گیا تو قاسمؑ کے اطمینان کا عالم یہ کہ جھک کر ڈوری باندھ رہے تھے۔ بس اتنے میں موقع مل گیا دشمن کو۔ پھر ایک دشمن پشت پر آیا اور آنے کے بعد قاسمؑ کے سر کے اوپر تلوار کا ایک ایسا وار کیا کہ بچہ پھر گھوڑے پر سنبھل نہ سکا اور آواز دی کہ یَا عَمَّاہُ اَدْرِکْنِیْ اے چچا! میری خبر لیجیے اور حسینؑ ایک شیر کی طرح جھپٹے۔ میں نے کسی تاریخ میں نہیں دیکھا کہ حسینؑ نے اپنے کسی سپاہی کے قاتل پر حملہ کیا ہو مگر بس قاسمؑ کے قاتل کو دیکھ لیا حسینؑ نے کہ کیا نامردی کی بات کی تھی اس ملعون نے کہ بچہ میرا اپنے جوتے کی ڈوری باندھ رہا تھا، غفلت کے عالم میں تھا اور اس کے سامنے سے نہیں پسِ پشت آکر میرے بچے پر حملہ کیا، تو غصہ آگیا۔ حسینؑ آگے بڑھے اور اس کے قاتل پر حملہ کر دیا اور قاتل نے اپنا ہاتھ بلند کر دیا، ہاتھ کٹ کر زمین پر گرا، اس نے کہا لشکر والوں مجھے حسینؑ سے بچاؤ۔

لشکر دوڑ پڑا اسے بچانے کے لیے۔ ۶۰ اداران حسینؑ! اب تاریخ نے عجیب منظر کھینچا ہے۔ منظر یہ کھینچا ہے کہ حسینؑ چاہتے ہیں کہ قاسمؑ کا قاتل بچ کر جانے نہ پائے اور لشکر والے چاہتے ہیں کہ ہم اسے بچا لے جائیں اور جب جنگ چھڑ گئی ہے تو آپ کو معلوم ہے کہ اِدھر کے سوار اُدھر اور اُدھر کے سوار اِدھر اور بیچ میں قاسم زخمی پڑے ہیں۔ روایت بتاتی ہے کہ بار بار قاسمؑ کی آواز آرہی تھی کہ چچا مجھے بچائیے، میں پامال ہوا

جاتا ہوں، اتنے میں جنگ ختم ہوئی اور حسینؑ اپنے بھتیجے کے سرہانے پہنچے تو دیکھا کہ قاسمؑ خاک کے اوپر ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ فرمایا حسینؑ نے قاسمؑ کا سر اپنی گود میں رکھ کر بیٹا! تیرے چچا پر بہت سخت وقت ہے کہ تو نے اپنے چچا کو مدد کے لیے پکارا اور تیرا چچا تیری مدد کے لیے نہ آسکا۔

بس عزادارانِ حسینؑ! ابھی مہندی کا جلوس برآمد ہوگا اور آپ سب اس کی زیارت کریں گے۔ اس کی بھی حقیقت آپ پر ظاہر کردوں کہ جس وقت قاسمؑ لے کر آئے اپنے بابا کی وصیت تو حسینؑ نے فرمایا کہ بیٹا، اگر تم کو تمھارے بابا کی وصیت ہے تو مجھے بھی اپنے بھائی کی وصیت کا خیال ہے۔ میرے بھائی نے وصیت کی تھی کہ تمھارا عقد میری بیٹی کے ساتھ ہونا چاہیے۔ چلو اس وصیت کی بھی تکمیل کردی جائے اور اس کے بعد قاسمؑ کو لے کر خیمے میں آئے اور اپنی بیٹی حضرت فاطمہ کبریٰ کے ساتھ حضرت قاسمؑ کا عقد جیسا کہ بعض روایات بتاتی ہیں، پڑھ دیا۔

عزادارانِ حسینؑ! اب امامت کی مصلحت امامت بہتر سمجھ سکتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کربلا کے میدان میں حسینؑ اس حکمت عملی پر عمل کر رہے تھے کہ اصحاب پر جس جس طرح سے مصیبت آئے بنی ہاشم کے جگر کے ٹکڑے بھی اس مصیبت میں اسی اسی طرح سے شریک ہوجائیں۔ میں سمجھتا ہوں میدان کربلا میں ایک نیا دولھا وہب ابن عبداللہ کلبی کی شکل میں موجود تھا جس کی شادی کو ابھی سترہ دن ہی

ہوئے تھے اس لیے حسینؑ نے کہا کہ میرے گھر کا بھی ایک دولھا، ایک رات کا دولھا میدان میں موجود رہے۔

بہرحال عزادارانِ حسینؑ! قاسمؑ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ عالم یہ کہ حسینؑ نے قاسمؑ کی لاش اٹھائی مگر حسنؑ کے بیٹے کی لاش آرام سے اٹھا لینے والے کی قوت اتنی گھٹ چکی تھی کہ روایت بتاتی ہے کہ قاسمؑ کا سینہ سینے سے ملا ہوا اور پاؤں زمین پر کھنچتے چلے جا رہے ہیں اور اس طرح سے قاسمؑ کی لاش لائے اور لا کر گنج شہیداں میں رکھ دی۔

اب میں آپ کے سامنے بس اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حسینؑ اپنے قاسمؑ کو لے کر نہیں آئے ہیں، اپنے بھتیجے کو لے کر نہیں آئے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں دستور یہ ہے، آپ بھی تائید فرمائیں گے کہ دولھا کو جب براتیوں کے بیچ میں لایا جاتا ہے تو اکثر گود میں اٹھا کر لایا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حسینؑ اپنے دولھا کو اپنی گود میں اٹھا کر لا رہے تھے اور لا کر شہیدوں کی جو بارات لیٹی ہوئی آرام کر رہی تھی، اسی کے درمیان اپنے دولھا کو لٹا دیا۔

عزادارو! ایک سوال کر کے آپ سے میں اپنی بات ختم کیے دیتا ہوں۔ عزادارو! میں کہتا ہوں کہ قاسم تو آ گئے اپنے براتیوں میں شہداء کی لاشوں کے درمیان، دولھا آ گیا مگر عزادارو! دلھن بھی بیاہ کر جاتی ہے دولھا کے گھر میں۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ قاسم کی دلھن بیاہ کر کہاں گئی؟ تو تاریخ شہادت دے گی کہ دولھا تو آ گیا شہیدوں

کے درمیان اور دلھن کے ہاتھ پس گردن سے باندھے گئے۔ کبھی بازار کوفہ، کبھی بازارِ شام۔

حسینؑ نے قاسمؑ کی لاش لاکر خیمے کے در پر رکھی، ایک مرتبہ خیمے کا پردہ بلند ہوا، ایک چھوٹی سی بچی تڑپ کر نکلی واا خاہ، واقاسماہ ہائے میرا بھائی، ہائے میرا قاسمؑ! یہ کہتے کہتے آکر اپنے کو لاشِ قاسمؑ پر گرا دیا۔ حسینؑ قاسمؑ کا غم بھول گئے، کہا بچی تو نے بڑا غضب کیا میری زندگی میں خیمے کے باہر نکل آئیں۔ یہ کہہ کر بچی کو خیمے کے اندر پہنچا دیا۔ میں کہتا ہوں، آپ نے قاسمؑ کی بہن کو خیمے کے اندر پہنچا دیا، مولا جب سکینہؑ خیمے کے باہر نکل رہی ہے تو آکر سکینہؑ کو بچا لیجیے۔ اس لیے کہ شمر تازیانے لگا رہا ہے، کانوں سے گوشوارے چھین رہا ہے۔

بھوکا ہوں کھانا کھلادو، تو آدم کھانا کھلادوگے؟ آدمؑ کانپنے لگے، مالک رازق تو خود تو ہے، بھوک لگے گی تو میں تجھ سے رزق طلب کروں گا، تو مجھ فقیر کے پاس کیوں آنے لگا؟ جبریلؑ نے بات آگے بڑھائی اور کہا کہ آدم تمھارے رب نے کہلوایا ہے کہ اگر کبھی تمھارے پاس آکر کہوں، آدم لباس نہیں ہے کپڑے دے دو، تو آدمؑ کپڑے دے دوگے نا، اپنے اللہ اپنے رب کو۔ آدمؑ اور پریشان ہوئے کہا مالک یہ کیسی بات، تو کائنات کا مالک اور خالق، پھر تو لباس سے بے نیاز، تو میرے در پر کیوں آنے لگا۔ ہاں مجھے ضرورت ہوگی لباس کی تو تیرے در پر فقیر بن کر آجاؤں گا۔ ابھی بات یہیں تک پہنچی تھی کہ جبریلؑ نے کہا آدم! تمھارے پروردگار نے یہ بھی کہلوایا ہے کہ آدمؑ! اگر کبھی آکر مکان کا سوال کروں تو مکان دے دوگے اپنا، آدمؑ! آدمؑ تھرتھرانے لگے، مالک یہ کیسے سوالات ہو رہے ہیں؟ سب کچھ تیرا، ہم سب تیرے محتاج تو لامکان، تجھے گھر کی کیا ضرورت، مالک! ان سوالوں کے راز سے جلد پردہ اٹھا۔ ارشاد ہوا آدمؑ! سنو! اور دوسروں کو بھی سنادو کہ اگر کبھی کوئی بھوکا تمھارے در پر آئے، کوئی لباس کا محتاج تمھارے در پر آئے، کوئی بے در بے گھر بندہ تمھارے دروازہ پر آئے تو یہ نہ سمجھنا کہ میرا بندہ آگیا ہے۔ یوں سمجھنا کہ میں خود آگیا ہوں۔ تمھارا رب تمھارے دروازہ پر آگیا ہے۔

اب بتائیے کہ اس سے بڑھ کر تکریم انسانیت کیا ہوگی کہ بندہ کو گویا خدا بنا دیا جائے۔

یہ تو عام انسانوں کی بات تھی۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں آج بھی مخالف

آٹھویں مجلس

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ وَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝ (سورہ آل عمران آیت ۸۵)

برادرانِ عزیز! آٹھویں محرم کا دن آج گزر گیا اور نویں محرم کی شب میں نے اسی آیت کو آپ کے سامنے پیش کیا کہ جس کو آپ برابر سماعت فرماتے رہے ہیں اور جس میں ارشادِ اقدسِ الٰہی ہو رہا ہے کہ "اسلام کے علاوہ اور کوئی دوسرا دین اختیار نہ کرنا ورنہ تمھارا شمار بھی اس گروہ میں ہو گا کہ جو نقصان اٹھانے والوں میں تھا"۔

تمہید میں قرآن مجید کی الہامی شان کے بارے میں اور اس کی عظمت و جلالت کے بارے میں برابر آپ کی خدمت میں کچھ ناگزیر چیزیں پیش کر رہا ہوں۔ کل میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ اکثر لوگ یہ شکوہ کرتے ہیں کہ جب سائنس کے ذریعے سے کوئی انکشاف ہو جاتا ہے تو آپ قرآن سے اس کا شاہد پیش کر دیتے ہیں اس لیے

کل میں نے آپ کی خدمت میں ایک مثال ایسی پیش کی تھی کہ وہ شے کہ جو ابھی سائنس کی دنیا میں طے نہیں ہے UNDERCONSIDERATION ہے، زیرِ غور ہے، اس کے بارے میں جو قرآن مجید ایک فیصلہ کن بات کہہ چکا ہے اور اب آج اسی سے متعلق ایک دوسری بات آپ کے سامنے عرض کرنا چاہتا ہوں۔ یعنی یہ آیت کہ جس کو میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کو کچھ عرصہ پہلے سمجھا نہیں جا سکتا تھا لیکن اب ہم دھیرے دھیرے سمجھ سکتے ہیں، تصور کر سکتے ہیں کہ آیت کا مفہوم کیا ہے۔

تذکرہ ہو رہا ہے قرآن مجید میں قیامت کا، کہ جب اس دنیا میں قیامت آئے گی تو کیا ہوگا تو یہ ذکر کرتے ہوئے کہ زمین میں انقلاب آئے گا اور زلزلے آئیں گے اور یہ ہوگا اور وہ ہوگا اور اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ وَاِذَا الۡبِحَارُ سُجِّرَتۡ ٥ جب قیامت کا دن آئے گا تو سمندروں سے آگ کے شعلے بلند ہونا شروع ہو جائیں گے بحار جمع ہے بحر کی اور سُجِّرَتۡ بنا ہے تَسۡجِیۡر سے۔ تسجیر کے معنی ہیں آگ کا بھڑکنا۔ یعنی جب سمندروں سے آگ بھڑکنے لگے تو سمجھنا کہ قیامت آگئی۔ اب بتائیے کسی انسان کی سمجھ میں کیا آ سکتا تھا؟ پانی میں کون آگ لگا سکتا ہے۔ پانی تو آگ بجھانے کا کام کرتی ہے، پانی میں کیسے آگ لگے گی۔ لیکن آج جب سائنس آگے بڑھی اور ہم نے پانی کی حقیقت پر غور کیا تو ہم کو یہ معلوم ہوا کہ پانی دو گیسوں سے مل کر

بنتا ہے ایک کا نام ہے HYDROGEN دوسرے کا نام ہے OXYGEN آکسیجن، دوسرے کا نام ہے ہائیڈروجن۔ ایک اور حقیقت جو ہم کو معلوم ہے کہ زمین کی یہ سطح جو ٹھنڈی ہے مگر زمین کے جگر میں آگ ہی آگ ہے، لاوا ہی لاوا ہے۔ گویا ایک جہنم کی بھٹی ہے جو زمین کے اندر دہک رہی ہے اور یہ بات قرآنِ مجید نے کہی ہے اس وقت کہ جب زمین میں زلزلے آجائیں گے اور زمین کے طبقے پھٹ رہے ہوں گے۔ اس کے بعد یہ ارشاد ہوتا ہے کہ وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ٥ ادھر زمین کے طبقے پھٹ رہے ہوں گے اور اُدھر سمندروں سے آگ بھڑک رہی ہوگی۔

اب سمجھ میں آتا ہے کہ قرآن مجید کی اس آیت کا مطلب کیا ہے۔ اس لیے کہ میں نے عرض کیا آپ کے سامنے کہ پانی بنا ہے دو گیسوں سے مل کر۔ ایک کا نام ہے ہائیڈروجن اور ایک گیس کا نام ہے آکسیجن اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ یہ دونوں گیسیں وہ ہیں کہ اس میں سے ایک گیس آگ پکڑنے والی ہے اور دوسری گیس آگ بھڑکانے والی ہے مگر اس کی قدرت کا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے آگ پکڑنے والی اور آگ بھڑکانے والی دونوں گیسوں کو ملا دیا تو آگ بجھانے والے پانی کی شکل دے دی۔ یہ اس کی قدرت کا کارنامہ ہے تو وہ کہ جس نے ان دو گیسوں کو ملا کر پانی سے آگ بجھانے کا کام لے لیا اس بات پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ ان دونوں گیسوں کو الگ کر دے اور زمین سے بلند ہوتے ہوئے لاوے کے شعلے سمندروں میں آگ لگا دیں۔

بہرحال آج یہ بات ایسی نہیں رہ گئی ہے کہ جس کے لیے آپ کہیں کہ UNSCIENTIFIC ہے۔ SCIENTIFICALY یہ بات ممکن ہو گئی ہے تو میں آپ کے سامنے جو خلاصہ عرض کر رہا ہوں وہ یہی ہے، کتنا آپ کے سامنے عرض کروں۔ بار بار میں آپ کے سامنے یہی عرض کر رہا ہوں کہ قرآن میں غور کیجیے تو قرآن خود بتا دے گا کہ اس کی شان وہ شان ہے کہ یہ کسی انسان کا کلام ہو ہی نہیں سکتا اور اسی قرآن مجید میں یہ ارشاد ہے کہ اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین اختیار نہ کرنا ورنہ تم نقصان اٹھانے والوں میں ہو جاؤ گے۔ میں عرض کر رہا تھا آپ کے سامنے، کئی تقریروں میں میں نے عرض کیا کہ اسلام اور سائنس میں کوئی دشمنی نہیں ہے۔ یہ دونوں آپس میں دوست ہیں، ایک دوسرے کو مکمل کرنے والے ہیں، یہ دونوں ایک دوسرے کو COMPLETE کرنے والے ہیں۔

توجہ فرمالیں آپ۔ اس صدی کا مشہور ترین سائنس داں البرٹ آئنسٹائن کہتا ہے:

SCIENCE WITHOUT RELIGION IS BLIND AND RELIGION WITHOUT SCIENCE IS LAME.

یہ صحیح پوزیشن ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ ایک دوسرے کو مکمل کرتے ہیں۔ آپ دیکھ لیجیے کہ دنیا نے سائنس کو لیا اور مذہب کو چھوڑا تو آج دنیا کہاں پہنچ گئی؟ آج دنیا کہاں پہنچ گئی بھائی صاحب! آپ انکار نہیں کر سکتے اس بات سے کہ آج دنیا کہاں پہنچ گئی ہے۔ آج یہ دنیا آپ یوں سمجھیں کہ ایک

دستر خوان بچھا ہوا ہے، نعمتیں چنی ہوئی ہیں، بہترین کھانے چنے ہوئے ہیں آپ کے سامنے، بہترین مشروبات چنے ہوئے ہیں۔ مگر اس دستر خوان کی مثال ایسی ہی ہے کہ جیسے کسی پھانسی کے تختے پر کھڑے ہوئے انسان کے سامنے دستر خوان بچھا دیا جائے تو اس کو یہ اعتبار ہی نہیں کہ پھانسی کا تختہ کب کھٹ سے ہو جائے گا اور میں پھانسی پا کر نیچے لٹک جاؤں گا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت کوئی بھی TECHNICAL FAULT اس دنیا میں جنگِ عظیم بر پا کر سکتی ہے۔ اور یہ جنگ وہ جنگ نہیں ہوگی کہ اس میں کوئی لڑے اور کوئی تماشہ دیکھے۔ یہ جنگ وہ جنگ ہوگی جس میں چند منٹ کے اندر پورے GLOBE اس پوری دنیا کے اندر دھوئیں کے بادل اٹھتے ہوئے دکھائی دے رہے ہوں گے اور چار ارب سے زیادہ کی آبادی دم توڑ رہی ہوگی۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے تو یہ صورتِ حال کیوں کر پیدا ہوگئی؟ یہ صورتِ حال اس لیے پیدا ہوگئی ہے کہ ہم نے سائنس کی تیز رفتار گاڑی تو بنالی مگر مذہب کے بریک توڑ دیے اور اسی مذہب کے بریک توڑ دینے کا نتیجہ کیا ہوا۔ آپ کسی گاڑی سے بریک توڑ دیں تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا سوائے ایکسیڈینٹ کے اور کیا ہوگا۔ تو یہ جو ایکسیڈینٹ ہونے والا ہے یہ اس لیے ہونے والا ہے کہ ہم نے سائنس کی تیز رفتار گاڑی سے مذہب کے بریکوں کو توڑ دیا ہے۔ مذہب کے بریک وہ ہیں کہ جو سائنس کی چلتی ہوئی تیز رفتار گاڑی کو قابو میں رکھ سکتا ہے۔ اس

کے لیے ایک سمت معین کر سکتے ہیں۔

پھر میں آپ کے سامنے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ علم سے اور سائنس سے اقتدار آتا ہے۔ جس کے پاس جتنا علم ہوگا اتنا ہی زیادہ اس کے پاس اقتدار ہوگا۔ ہمارے پاس تھوڑا علم ہے، ہم چاند پر جاتے ہیں اور چلے آتے ہیں۔ اُن کے پاس زیادہ علم تھا جن کو آخری رسولؐ بنا کر بھیجا گیا تھا، ان کے علم کا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے زمین پر کھڑے کھڑے انگلی کے اشارے سے چاند کے دو ٹکڑے کر دیے۔ مگر اس میں یہیں پر آپ کے لیے ایک سبق ہے۔ ملاحظہ فرما رہے ہیں آپ کہ انسان چاند پر فقط جاتا ہے اور پلٹ کر آتا ہے تو اس کی خطرناکی کتنی زیادہ بڑھ گئی ہے، یہ کتنا ہولناک بن گیا ہے کہ پوری بنی نوع انسانی کو آج خطرات نے گھیر رکھا ہے۔

میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ جس کے پاس اقتدار آیا علم کے ذریعے سے اور نفس پر اختیار آیا مذہب کے ذریعے سے، اس کا کردار آپ ملاحظہ فرمائیں کہ جو انگلی کے ایک اشارے سے آسمان پر چاند کے دو ٹکڑے کر سکتا تھا، کیا وہ انگلی کے اشارے سے ابولہب کی گردن نہیں اڑا سکتا تھا، کیا وہ انگلی کے ایک اشارے سے ابوجہل کی گردن نہیں اڑا سکتا تھا، کیا وہ اپنے دشمنوں کو نہیں ختم کر سکتا تھا! مگر حضورؐ نے اس اقتدار کے بعد یہ دکھایا کہ دیکھو کہ علم کے ذریعے سے اقتدار اتنا ہے کہ چاند کو زمین پر کھڑے کھڑے دو ٹکڑے کر سکتا ہوں مگر معرفتِ الٰہی

سے اپنے نفس پر اختیار اتنا ہے کہ گالیاں کھاؤں گا اور مسکراتا رہوں گا ڈھیلے کھاؤں گا اور ہنستا رہوں گا۔

بس برادران عزیز! سمجھ لیجیے کہ سائنس کے ذریعے سے ایک مسلمان کا فریضہ ہے کہ دنیا پر اقتدار حاصل کرے اس لیے کہ ایک مسلمان کا حق ہے کہ سب سے پہلے وہ کائنات پر قابو حاصل کرے اور اس کے ساتھ ساتھ مذہب کے ذریعے سے، معرفتِ الٰہی کے ذریعے سے انسان اپنے نفس پر قابو رکھے اس لیے کہ سائنس کے ذریعے سے جو اقتدار اسے حاصل ہو رہا ہے یہ بنی نوع انسانی کی آبادی میں صرف ہو، بنی نوع انسانی کی بربادی میں صرف نہ ہو۔ (صلوٰۃ)

اب آیت میں ارشاد ہے کہ اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین اختیار نہ کرنا ورنہ آخرت میں نقصان اٹھاؤ گے۔ اب آیت کا ٹکڑا رہ جا رہا ہے تو اس کے بارے میں بھی میں آپ کے سامنے کچھ باتیں آج عرض کردوں ممکن ہے کہ کچھ باتیں کل ہوں۔

آخرت کیا ہے؟ جب انسان دوبارہ زندہ ہو کر اللہ کی بارگاہ میں آئے گا۔ آج ساری دنیا میں ویڈیو فلمیں چل رہی ہیں۔ ہر گھر میں V.C.R. ہے، مگر یہ زمانہ وہ زمانہ ہے کہ جہاں انسان دوسروں کی فلم دیکھتا ہے اور حشر میں انسان اپنی فلم خود دیکھے گا۔ وہاں انسان اپنی فلم خود دیکھ رہا ہوگا۔ دیکھیے میں عرض کر چکا آپ کے سامنے کہ جتنا جتنا زمانہ آگے بڑھتا جا رہا ہے اسلام کی بتائی ہوئی حقیقتیں سامنے آتی جا رہی ہیں۔

میں نام نہیں لینا چاہتا کہ کچھ عرصہ پہلے یہیں برّ صغیر کی ایک خاتون لندن تشریف لے گئیں اور پہلی مرتبہ ان کی نظروں کے سامنے ایک DEPART MENTAL STORE آیا۔ ان کو حیرت یہ ہوئی کہ سارا سامان وہاں کھلا پڑا ہوا تھا، کوئی دیکھنے والا نہ تھا SHOW CASES میں سارا سامان بھرا ہوا تھا۔ اب وہ انگریزوں کی عقل کا ماتم کرتی ہوئی اس کے اندر داخل ہوئیں کہ کیسے بے وقوف لوگ ہیں کہ اتنی قیمتی قیمتی چیزیں سب انھوں نے یوں ہی OPEN کھلی ہوئی چھوڑ دی ہیں۔ تو اب انھوں نے یہ حرکت فرمائی کہ کچھ سامان تو انھوں نے لیا اور کچھ سامان انھوں نے اپنے پرس کے اندر رکھنا شروع کیا۔ اس کے بعد جب گیٹ پر آئیں تو مسماۃ نے دیکھا کہ سامنے پولیس کھڑی ہے۔ کہا پولیس کس کے لیے، کہا آپ کے لیے۔ کہا میں نے کیا کیا؟ کہا آپ نے چوری کی۔ کہا میں نے تو کچھ نہیں چرایا۔ کہا نہیں چرایا تو دیکھیے، بٹن دبایا، فلم سامنے آنے لگی، خود اپنے آپ کو ملاحظہ فرمالیا انھوں نے کہ وہ چوری کر رہی ہیں۔

جہاں نگرانی کا غیبی انتظام نہیں ہوتا ہے وہاں محافظ نظروں کے سامنے کھڑے رہتے ہیں یا سامان LOCK UP میں رہتا ہے اور جہاں ٹیلی ویژن کے خفیہ کیمرے لگے ہوئے ہیں اور کسی کمرے میں کوئی بیٹھا ہوتا ہے نگرانی کرنے والا، وہاں بظاہر کوئی محافظ نہیں دکھائی دیتا۔ اس لیے کہ وہ ایک بیٹھا ہوا سب کو دیکھ رہا ہے۔

توجہ فرمائی آپ نے۔ تو اب میں آپ کے سامنے یہ عرض کرنا چاہتا

ہوں کہ اس دنیا میں آپ کے سامنے نعمتوں کے جو دسترخوان بچھے ہوئے
جن کی آپ گنتی اور شمار نہیں کر سکتے، یہ سب LOCK UP میں ہیں کہ
OPEN ہیں۔ اگر یہ سب OPEN ہیں تو سمجھ لیجیے کہ یہاں بھی کوئی نگراں
بیٹھا ہوا ہے۔ ورنہ وہ ایسا معاذ اللہ بے وقوف نہیں تھا کہ اتنی قیمتی
چیزیں آپ کے لیے یوں ہی چھوڑ دے کہ جو جا ہو اٹھالے جاؤ۔ اس کا
سامان کو کھلا چھوڑ دینا اور آپ کو آزاد چھوڑ دینا اس بات کی دلیل ہے
کہ اس کے بھی کچھ کیمرے لگے ہوئے ہیں کہ جو نگرانی کر رہے ہیں اور
اس SHOPPING CENTRE سے SHOPPING کرنے کے بعد جب ہم حشر
کے میدان میں پہنچیں گے تو ہم کو معلوم ہو گا کہ ہم نے کیا شاپنگ کی تھی۔
پڑھیے قرآن مجید، آیتوں کو پڑھیے، انسان جب حشر کے میدان میں آئے گا
اور CHARGE SHEET فردِ جرم دی جائے گی کہ تو نے یہ کیا، یہ کیا اور یہ کیا
تو اس کو تو انکار کرنے کی عادت ہے۔ کہا میں نے کچھ نہیں کیا۔ تو نے کہا
میں نے تو کچھ نہیں کیا SIR تو جناب وہ پہلے ہی آپ کے لیے مرزا غالبؔ
کہہ چکے ہیں ؎

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

وہ تو پہلے ہی کہہ چکے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ انسان کی MONTALITY یہ
ہے کہ ہم نے کیا، ہم نے کیا ہی نہیں تھا، ہے کوئی ثبوت، کوئی گواہ۔ کیسے گا
ثبوت! تو لو ثبوت۔ بس ویڈیو (معاذ اللہ) ویڈیو کا بٹن دبے گا اور

انسان دیکھے گا کہ کیا کر رہا ہے۔ ساری زندگی کی فلم نظروں کے سامنے آنے لگے گی۔

مگر دیکھیے آپ! آدمی بڑا ہوشیار ہے پھر بھی قائل نہیں ہو گا۔ دیکھ رہا ہے سامنے کہ میں یہ کر رہا ہوں تو کہے گا کہ ایک صورت کے تو سیکڑوں ہوتے ہیں، اس کا کیا ثبوت کہ میں ہی ہوں؟ ہو سکتا ہے یہ کوئی دوسرا ہو۔ لیکن اس نے بھی ویسا ہی انتظام کر رکھا ہے۔ بس جیسے ہی یہ کہے گا ہو سکتا ہے کوئی دوسرا ہو۔ ویسے ہی اُدھر سے ایک دوسرا بٹن دبے گا اور اب جسم کے ہر ہر عضو سے آواز آنا شروع ہو جائے گی۔ آنکھیں کہیں گی کہ ہم نے یہ دیکھا تھا، کان کہیں گے کہ ہم نے یہ سنا تھا، ہاتھ کہیں گے کہ ہم نے یہ لیا تھا، پاؤں کہیں گے کہ ہم کہاں کہاں گئے تھے۔ تب انسان گھبرا کر اپنے جسم سے کہے گا کہ وَقَالُوا لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ۖ قَالُوا أَنطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنطَقَ كُلَّ شَيْءٍ — اس وقت انسان گھبرا کر اپنے جسم سے کہے گا کہ تم کو کیا ہو گیا، تم کیسے آج بولنے لگے، تم تو نہ بولتے تھے تو ہر بُن مو سے آواز آئے گی کہ آج ہم کو اس اللہ نے بولنے کا حکم دیا ہے کہ جو جس شے میں چاہے کلام اور بات کو پیدا کر دے۔ (صلوٰۃ)

آج آپ نے ELECTRO MAGNETIC RECORDING ایجاد کر لی ہے تو یہ جو آپ کی BODY ہے اس کے اوپر سب RECORDING ہو رہی ہے۔ سب ریکارڈ یہیں ہو رہا ہے۔ یہ فلم یہیں بن رہی ہے مگر سائنس

پر کھانا تو کھانا دوائیں تک بند کر دی جاتی ہیں۔ بچوں کے لیے دودھ کے ڈبوں تک پر پابندی لگا دی جاتی ہے۔ بلکہ کمبوڈیا میں فضا سے آکسی جن کو ختم کر کے "دشمن" کا دم گھونٹ کر مار ڈالا جاتا ہے۔ ایسی ظالم دنیا میں اسلام دشمن کے ساتھ، مخالف کے ساتھ کس برتاؤ کا حکم دیتا ہے۔ یہ دیکھنا ہے تو یہ روایت دیکھیں۔

یہ خدا کے ایک اور پیارے نبی کا ذکر ہے۔ خدا کا خلیل ابراہیمؑ۔ ان کا دستور یہ تھا کہ اس وقت تک کھانا نہ کھاتے تھے جب تک کوئی مہمان آکر شریک طعام نہ ہو جاتا تھا۔ دیکھنے میں یہ بات معمولی لگتی ہے مگر دنیا کا ہر انسان اور پھر دنیا کی تمام قومیں اسی سنت ابراہیمی پر عمل پیرا ہو جائیں تو آپ ہی بتائیں دنیا میں کوئی بھوکا رہ سکتا ہے، کوئی بے غذا رہ سکتا ہے۔ مگر یہ اسلام تھا اور ہماری دنیا کا عالم یہ ہے کہ اگر ضرورت سے زاید گیہوں پیدا ہو گیا تو امریکا لاکھوں ٹن گیہوں سمندر میں DUMP کر دیتا ہے کہ مارکٹ ریٹ خراب نہ ہونے پائے۔

بہر حال ایک روز ابراہیمؑ راستہ پر جا کر بیٹھ گئے، وقت گزر گیا کوئی مسافر نہ ملا۔ دوسرے وقت گئے یہ وقت بھی یوں ہی گزر گیا کوئی بندۂ خدا نہ ملا۔ تیسرے وقت جا کر کہیں ایک مسافر دکھائی دیا۔ خوش ہو گئے، جلدی جلدی لے کر آئے، فوراً دستر خوان بچھایا، کھانا۔ فرمایا بسم اللہ، اس نے کہا بسم اللہ کیا، کہا بھائی اللہ کا نام لیجیے اور کھانا شروع کیجیے۔ اس نے کہا یہ تو نہ ہو گا۔ میں اللہ کو جانتا ہی نہیں تو نام کیا لوں! اب ابراہیمؑ سنائے

لاکھ ترقی کرلے، انسان انسان ہے اور خدا خدا ہے۔ ہماری ایک ایک بات کی ریکارڈنگ ہوسکتی ہے مگر کس بات کے تحت، ہماری نیت کیا تھی INTENSION کیا تھی، اس بات کی ریکارڈنگ نہیں ہوسکتی۔ لیکن اس نے جو نظام بنایا ہے اس میں کام کی بھی ریکارڈنگ ہوگی۔ کس بات کے تحت، ہماری نیت کیا تھی، اس کی بھی ریکارڈنگ ہوگی کہ کون سا کام ہم نے کس نیت سے کیا اور انجام دیا ہے۔ اس لیے کہ دنیا میں ہمیشہ سزائیں دی جاتی ہیں فعل کے اعتبار سے۔ مگر سزا ملنا چاہیے نیت کے اعتبار سے۔ بعض وقت انسان کوئی برائی کرتا ہے مگر نیت اس کی نیک ہوتی ہے۔ بعض وقت انسان کوئی نیکی کرتا ہے بظاہر اور نیت اس کی بد ہوتی ہے۔ تو یہاں سزائیں اور جزائیں ملتی ہیں، جزائیں تو خیر ملتی ہی نہیں، سزائیں ملتی ہیں اعمال کے اوپر۔ مگر اللہ کی طرف سے سزا بھی ملتی ہے اور جزا بھی ملتی ہے، اسی لیے ارشاد ہے کہ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّات تم کو جزا ملے گی تمہاری نیت کے اعتبار سے۔ جزا ملے گی اس لیے کہ یہی ہماری عدالت کا تقاضہ ہے اور یہی انصاف ہے۔

اب لوگ کہتے ہیں کہ اس نے شیطان کو کیوں پیدا کر دیا جی۔

جوشؔ صاحب کہہ گئے کہ ؎

انسان کو شیطان نے گمراہ کیا
شیطان کو گمراہ کیا ہے کس نے

تو آپ ذرا غور کیجیے، بات خود ہی سمجھ میں آجائے گی کہ اللہ آپ کو

جزا دینا چاہتا ہے اور جزا آپ کو کیسے ملے گی اگر آپ کے سامنے ایک ہی لائن ہے، ایک ہی راستہ ہے تو آپ کے لیے انتخاب کی منزل ہی نہیں ہے۔ یہی ایک راستہ ہے، اسی پر ساری دنیا کو چلنا ہے تو سب برابر۔ پھر جزا کا کیا سوال اٹھتا ہے؟ اس لیے اس کے نظام نے شیطان کی پیدائش گوارا کر لی کہ ایک طرف حق کا راستہ ہو دوسری طرف باطل کا راستہ ہو تاکہ اب تمھارے انتخاب میں تمھارا امتحان ہو جائے کہ تم حق کے راستے پر چلتے ہو یا باطل کے راستے پر چلتے ہو۔ اب اس سے زیادہ اس وقت تفصیلات میں جانے کا محل نہیں کیونکہ اس وقت مجھے آپ کے سامنے بہت سی باتیں عرض کرنا ہیں۔

بہرحال میں نے عرض کیا کہ جتنا انسان میں علم ہوتا ہے اتنا ہی اس کا اقتدار ہوتا ہے اور اس کا اختیار بڑھتا ہے۔ محمدؐ اور آل محمدؐ نور سے پیدا ہوئے ہیں (صلوٰۃ) یہ نور تھے تو ہمارا ان کا کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ ان کو اللہ نے وہ سب بتا دیا تھا جو اس نے بتانا چاہا۔ ان کا علم بہت زیادہ ہے ہمارا علم بہت کم ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ (ایک اور فرمائش کی تکمیل ہو جائے) اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ نور سے تھے تو ثبوت آپ کی نظروں کے سامنے ہیں۔ آج شب جمعہ بھی ہے اس لیے میں نے اس فرمائش کو آج کی تاریخ کے لیے ملتوی کر رکھا تھا۔ شب جمعہ ہمارے دو اصول ہیں، دو طریقے ہیں۔ ایک "زیارتِ وارثہ"، جو ہو گئی اور ایک "حدیث کسائ"۔ تو بس حدیثِ کساء پر ہی

آپ کے سامنے عرض کر دوں۔ یہ چیز فضائل کی جگہ کے اوپر حدیث کساء اگر آپ پڑھیں گے تو آپ کو خود اندازہ ہو گا کہ حدیثِ کساء شروع ہوئی اور انسان کی سمجھ میں آگیا کہ یہ نور ہیں۔ محمدؐ اور آل محمدؐ جو ہیں وہ نور ہیں بخدا میں آج بہت کچھ آپ کے سامنے عرض کرتا مگر وقت کم ہے اور مصائب کا حصہ آج زیادہ ہے لہٰذا بس ضروری ضروری باتیں آپ کے سامنے عرض کرنا چاہتا ہوں۔

توجہ کریں کہ حضرت فاطمہ زہراؑ سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ میں گھر میں بیٹھی ہوئی تھی کہ میرے بابا آئے اور آنے کے بعد کہا کہ بیٹی مجھے تھوڑی سی کمزوری سی محسوس ہو رہی ہے، ذرا چادر مجھے دے دو، تو شاہزادی نے چادر یمانی اپنے بابا کو دی۔ فرماتی ہیں کہ وہ کالی چادر جب میرے بابا نے اوڑھ لی تو میرے بابا کا وہ سفید دمکتا ہوا چہرہ اس کالی چادر میں یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے کہ اندھیری گھپ رات میں چاند چمکتا ہے۔ فرماتی ہیں کہ تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ اتنے میں حسنؑ آئے اور آنے کے بعد کہا کہ مادر گرامی، مجھے یہاں اپنے نانا کی خوشبو محسوس ہو رہی ہے۔ فرماتی ہیں کہ ہاں وہ اس چادر میں ہیں چلے جاؤ۔ آئے اور آنے کے بعد سلام کیا۔ کہا نانا جان! میں اس چادر میں آؤں، کہا کہ ہاں چلے آؤ، آ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد حسینؑ آئے، انھوں نے بھی وہی کہا کہ جو حسنؑ نے کہا تھا۔ کہا وہ تمھارے نانا موجود ہیں۔ آئے کہا نانا جان! سلام، جوابِ سلام، اجازت ہے کہ آجاؤں۔

چلے آؤ، یہ بھی چلے گئے۔ پھر علیؑ بن ابی طالب گھر میں تشریف لائے۔ انھوں نے بھی وہی کہا اور ان سے بھی شاہزادی نے وہی کہا، وہ آئے اور آنے کے بعد سلام کیا، کہا میں بھی آجاؤں، کہا تم بھی آجاؤ۔ اب شاہزادی فرماتی ہیں کہ میں بھی آگے بڑھی اور میں بھی چادر کے اندر آگئی۔

بس ایک منٹ رُک جائیے بھائی صاحب! یہاں، ساری دنیا جانتی ہے کہ فاطمہ زہراؑ کی چادر اتنی چھوٹی تھی کہ سر ڈھانکتی تھیں تو پیر کھل جاتے تھے اور پیر ڈھانکتی تھیں تو سر کھل جاتا تھا۔ اتنی چھوٹی تو چادر تھی۔ اب ذرا غور فرمائیے کہ جو چادر اتنی چھوٹی تھی کہ ایک بی بی کے جسم کو نہ چھپا سکے، اسی چادر کے اندر رسولؐ بھی آگئے، علیؑ بھی آگئے فاطمہؑ زہرا بھی آگئیں اور حسنؑ بھی آگئے اور حسینؑ بھی آگئے اور مجھے نظر نہیں آتا کہ اس چادر نے تنگ دامانی کا شکوہ کیا ہو۔ کیسے آگئے سب اس میں؟ بس تو آپ کی خدمت میں مثال دے دوں تو بات واضح ہو جائے گی۔

ایک گلاس آپ لے لیں، پانی بھرنا شروع کریں۔ جب گلاس پورا پانی سے بھر جائے تو اب اگر ایک قطرہ پانی کا آپ اس میں اور ڈالیں گے تو وہ ایک قطرہ پانی کا اس میں سے چھلک کر گر جائے گا۔ کیوں؟ اس لیے کہ پانی ہے مادّی چیز۔ اچھا اب ایک چھوٹا سا کمرہ SEALD بالکل، اور اس کے اندر میں نے ایک سوئچ آن کیا اور پانیے کہ 500 VOLTS کا ایک بلب جلنے لگا۔ میں نے کہا کہ یہ کمرہ روشنی سے

بھر گیا، آپ نے کہا جی ہاں بھر گیا۔ میں نے کہا بھر گیا، آپ نے کہا جی ہاں بھر گیا۔ میں نے ایک سوئچ اور آن کر دیا اُتنے ہی پاور کا ایک بلب اور جلنے لگا تو اب کیا وہ بلب کی روشنی اس میں نہیں سمائے گی۔ کچھ روشنی توڑ کے نکل جائے گی دیواروں کو؟ پھر میں نے ایک اور سوئچ آن کر دیا، پھر ایک اور سوئچ آن کر دیا، پھر ایک اور سوئچ آن کر دیا۔ اگرچہ نور اور روشنی سے یہ کمرہ پہلے ہی روشنی سے بھر چکا تھا مگر گنجائش رہی، نور آتا گیا سماتا گیا۔ اس کا مطلب یہ کہ جہاں محدود ظرف میں کوئی شے چھلک جائے وہ ہوتی ہے مادی اور جہاں محدود ظرف میں نور آتا جائے سماتا جائے وہ ہوتی ہے نورانی۔ (صلوٰۃ) تو ان پانچ ہستیوں کا اس چھوٹی سی چادر کے اندر سمٹ کر آجانا اور چادر کو تنگ دامانی کا شکوہ نہ پیدا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ خاکی وجود نہ تھے، یہ نورانی وجود تھے۔

بس برادران عزیز! اب جب شاہزادی بھی آگئیں۔ ذرا رُک رُک کے چلیے، گھڑی کو میں خود بھی دیکھ رہا ہوں۔ فرماتی ہیں شاہزادی کہ فَلَمَّا اکْتَمَلْنَا جَمِیعًا اب حقیقت یہ ہے کہ عربی پڑھ کے پھنس گیا ہوں، جو مروجہ ترجمہ ہے اس سے مجھے الگ ترجمہ کرنا پڑتا ہے۔ پھر یہاں پر صحیح ترجمہ نہیں کیا جاتا، لوگوں نے ترجمہ کر دیا یہاں پر کہ شاہزادی نے فرمایا کہ "جب ہم سب جمع ہو گئے" میں نے کہا یہ کیسے کہہ دیا آپ نے یہ نہیں کہ جب ہم پانچوں جمع ہو گئے فَلَمَّا اشْتَمَلْنَا نہیں کہہ دیا شاہزادی نے فرما رہی ہیں فَلَمَّا اکْتَمَلْنَا۔ اکْتَمَلْنَا بنتا ہے کمال سے

اِجۡتَمَعۡنَا بنتا ہے جمع سے۔ جمع اور کمال میں فرق کیا ہے؟

ANNOUNCEMENT ہوا، اعلان ہوا کہ اس ہال میں، جعفریہ ہال میں مجلسیں ہوں گی۔ کوئی ستّر میل دور سے آیا، کوئی پچاس میل دور سے آیا، کوئی پچیس ۲۵ میل دور سے آیا، کوئی سترہ میل دور سے آیا، کوئی دس میل دور سے آیا، کوئی یہیں سے آگیا سامنے سے، جی! سارا مجمع اکٹھا ہوگیا تو آپ نے کیا کہا کہ سب لوگ جمع ہو گئے۔ یہی کہیں گے نا آپ کہ سب لوگ جمع ہو گئے۔ اچھا یں۔ فرض کیجیے۔ مجلس پڑھنے کے لیے آیا اور منبر مکمل نہیں تھا۔ پٹرے الگ تھے، کیلیں الگ تھیں، سب چیزیں الگ تھیں۔ یہاں تو ہر کام دو منٹ میں ہی ہو جاتا ہے۔ دو چار آدمی لگ گئے، ٹھونک بجا کر پٹرے سے پٹرا ملا دیا، چول سے چول ملا دی، یہ منبر ٹھیک ہوگیا، میں یہاں آکر بیٹھنے کی تیاری کرنے لگا تو میں نے کہا، ہاں منبر اب مکمل ہوگیا۔ اب میں یہ نہیں کہوں گا کہ منبر جمع ہوگیا۔ ذرا ان نزاکتوں پر نظر رکھیے گا۔ اس کا مطلب یہ کہ جہاں وجود الگ الگ ہوں اور کسی ایک منزل پر آجائیں تو کہا جاتا ہے جمع ہونا اور جہاں ایک ہی شے کے بکھرے ہوئے اجزا ہوں اور وہ کسی منزل پر سمٹ جائیں تو اسے کہا جاتا ہے مکمل ہو جانا۔ شاہزادی فرما رہی ہیں فَلَمَّا اكۡتَمَلۡنَا جَمِيۡعًا ہم سب مکمل ہو گئے، اس کا مطلب یہ کہ فرما رہی ہیں کہ ہم کو الگ الگ نہ سمجھنا، ایک ہی نور تھا جس کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے چادر میں آکر سب مکمل ہو گئے۔ جب ہم سب مکمل ہو گئے تو رسولؐ نے

چادر کا سرا پکڑا اور آسمان کی طرف دیکھا اور کہا اَللّٰھُمَّ اِنَّ ھٰؤُلَآءِ اَھْلُ بَیْتِیْ وَخَاصَّتِیْ وَحَامَّتِیْ پالنے والے! یہ ہیں میرے اہلبیتؑ تو کیا اللہ نہیں جانتا تھا یہ ہیں اہلِ بیتؑ۔ تو کیوں کہ رسولؐ جانتے تھے کہ اہل بیت کی LIST ممکن ہے طولانی ہو جائے اس لیے ارشاد فرمادیا کہ میری نظر میں تو میرے اہل بیتؑ بس یہی ہیں۔ اور جب رسولؐ نے یہ ارشاد فرمایا تو وہاں ارشاد ہوا ملائکہ سے خطاب کر کے کہ ملائکہ سمندر سے اٹھتی ہوئی موجیں چلتی ہوئی ہوائیں، دمکتے ہوئے ستارے، چمکتا ہوا ماہتاب، جگمگاتا ہوا سورج، کائنات کی کوئی بھی شے میں پیدا نہ کرتا، میں نے سب کچھ پیدا کیا ہے اِلَّا فِیْ مُحَبَّۃِ ھٰؤُلَآءِ الْخَمْسَۃِ الَّذِیْنَ ھُمْ تَحْتَ الْکِسَآءِ فرمایا کہ یہ پانچ جو چادر کے اندر ہیں ان کی محبت میں پیدا کیا۔

کسی کو نام نہیں بتایا تھا۔ وہ کہہ رہا ہے کہ یہ جو پانچ چادر کے اندر ہیں۔ جبرئیلؑ نے فرمایا... یہ سب روایت شاہزادی فاطمہ زہراؑ سے ہے جہاں غلط بیانی کا کوئی امکان نہیں ہے بھائی صاحب فرماتی ہیں کہ جب اللہ نے یہ ارشاد فرمایا تو جبرئیلؑ نے کہا یَارَبِّ وَمَنْ تَحْتَ الْکِسَآءِ پالنے والے! یہ جو تو فرما رہا ہے کہ یہ پانچ جو چادر کے نیچے ہیں جن کے طفیل میں سب پیدا ہوا ہے تو یہ بتا دے کہ وہ پانچ ہیں کون؟ ذرا جبرئیل کا بھولا پن دیکھیے گا۔ واہ بھئی واہ کیا بھولے ہیں بھئی جبرئیل! آپ نہیں پہچانتے، کون ہے نیا اس میں آپ کے لیے؟

اے خدا کے مقرب فرشتے! اس میں کون آپ کے لیے نیا ہے؟ رسولؐ صبح و شام ان کے پاس آپ آتے ہیں، علیؑ جن کے لیے کبھی ذوالفقار لے کر آئے کبھی حلۂ جنت لے کر آ گئے کبھی جناب آب کوثر لے کر آ گئے۔ حسنینؑ جن کا گہوارہ آپ نے جھلایا، فاطمہؑ جن کی چکّی چلائی۔ اس میں کون نیا ہے آپ کے لیے تو شاید جبرئیلؑ کا جواب ہو گا کہ پہچانوں گا نہیں تو جاؤں گا کہاں؟ پہچانتا سب کو ہوں۔ مگر میں اس وقت پہچانتا تھا آسانی سے جب نورِ حسنؑ الگ ہوتا تھا، نورِ حسینؑ الگ ہوتا تھا، نورِ فاطمہؑ الگ ہوتا تھا، نورِ علیؑ الگ ہوتا تھا، نورِ رسالتؐ الگ ہوتا تھا اور آج تو پانچوں نوروں کی جگمگاتی ہوئی لَوئیں یوں آپس میں مل گئی ہیں کہ میں بھی نہیں یہ سمجھ پا رہا ہوں کہ کہاں پر نورِ رسالتؐ ہے، کہاں پر نورِ علیؑ ہے کہاں پر نورِ فاطمہؑ ہے، کہاں پر نورِ حسنینؑ ہے۔ (صلوٰۃ)

بس برادرانِ عزیز! جب جبرئیلؑ نے کہا پالنے والے! چادر کے نیچے کون ہیں؟ ارشاد ہوتا ہے هُمْ فَاطِمَةُ وَاَبُوْهَا وَبَعْلُهَا وَبَنُوْهَا چادر کے اندر فاطمہؑ ہیں اور فاطمہؑ کے والد ہیں اور فاطمہؑ کے شوہر ہیں اور فاطمہؑ کے بچے ہیں۔

میں جب ۱۹۸۱ء میں حاضر ہوا تھا آپ کے سامنے پہلی بار تو میرے ساتھ میرا چھوٹا بچہ بھی تھا۔ فرض کیجیے یہ بچہ میرا پانچ سال کا نیچے بیٹھا ہوا ہوتا، پانچ سال کا اور آپ تعارف کرانے کھڑے ہوئے ہم دونوں کا اس بچے کا بھی تعارف INTRODUCTION اور میرا بھی تعارف

INTRODUCTION تو آپ نے اس بچے کا ہاتھ پکڑ کے کھڑا کیا اور کہا اس بچے کو آپ پہچان لیجیے، کلب صادق صاحب اسی بچے کے والد ہیں جی یہ ہے طریقہ، کوئی تہذیب ہے دنیا میں! کہیں بڑے کو چھوٹے سے نہیں پہچنوایا جاتا ہے۔ یہی آداب و تہذیب ہے۔

وَهُمْ فَاطِمَةُ وَأَبُوهَا وَبَعْلُهَا وَبَنُوهَا فاطمہؑ ہیں اور ان کے والد ہیں، فاطمہؑ ہیں اور ان کے شوہر، فاطمہؑ ہیں اور ان کے بچے پالنے والے! یہ کیا طریقہ ہے، تو یوں بھی ارشاد فرما سکتا تھا کہ میرا حبیب ہے رسولؐ، اس کی بیٹی ہے، اس کے داماد ہیں اور اس کے نواسے ہیں یا زیادہ سے زیادہ یہ ارشاد فرما دیتا کہ علیؑ ہیں اور علیؑ کے ابن عم اور ان کے خسر اور فاطمہ زہراؑ اور حسنینؑ ہیں ان کے بچے۔ جب دو بڑے موجود ہیں تو ان کو چھوڑ کر فاطمہؑ زہرا سے۔ جو ایک کی زوجہ اور ایک کی بیٹی، دونوں رشتے کے اعتبار سے بڑے ہیں۔ مگر قدرت کو ایک ایسے NEUCLES کی ضرورت تھی، ایک ایسے مرکز کی ضرورت تھی کہ جس سے جتنی بھی LINES نکل رہی ہوں سب برابر کی نکل رہی ہوں۔ اس کو تعارف کے لیے ایک CENTRE کی ضرورت تھی۔

اب آپ دیکھیں کہ CENTRE اور مرکز کی POSITION کیا ہوتی ہے آپ نے ایک CIRCLE بنایا، اب سرکل کے بیچ میں جو POINT ہو گا اس پوائنٹ کے صحیح ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہو گی کہ اس پوائنٹ سے اس سرکل کی طرف جتنی بھی لکیریں کھینچی جائیں وہ سب

برابر کی ہوں۔ اگر لکیریں چھوٹی بڑی ہوں گی تو اس کا مطلب یہ کہ سینٹر ٹھیک نہیں ہے۔ تو سینٹر اسی وقت ٹھیک ہوتا ہے کہ جب اس پوائنٹ سے سرکل کی طرف جتنی بھی لکیریں کھینچی جائیں وہ سب DIRECT ہوں اور برابر ہوں۔ اس بات کو یاد رکھیے گا آپ۔

اب آئیے ہم RELATION اور رشتوں کو دیکھیں۔ دیکھیے کچھ رشتے وہ ہوتے ہیں جو DIRECT ہوتے ہیں اور کچھ INDIRECT ہوتے ہیں۔ مثلاً باپ اور بیٹا رشتہ ڈائریکٹ، ماں اور بیٹی رشتہ ڈائریکٹ لیکن دادا اور پوتا ڈائریکٹ نہیں ہے یہ باپ سے ہوتا ہوا گیا ہے۔ نانا اور نواسہ یہ رشتہ ڈائریکٹ نہیں ہے بیٹی سے ہوتا ہوا گیا ہے۔ چچا اور بھتیجا یہ رشتہ ڈائریکٹ نہیں ہے بھائی سے ہوتا ہوا گیا ہے۔ ماموں اور بھانجہ یہ بھی رشتہ ڈائریکٹ نہیں ہے بہن سے ہو کر گیا ہے۔ توجہ فرمائی آپ نے! خسر اور داماد، سسرال والے جتنے رشتے ہوتے ہیں اس میں سے کوئی DIRECT نہیں ہے سب INDIRECT ہیں۔

اب آئیے میں آپ کو دکھاؤں چادر کے نیچے کون کون ہے۔ رسولؐ ہیں، علیؑ ہیں، فاطمہ زہراؑ ہیں، حسنؑ ہیں اور حسینؑ ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ اگر رسولؐ کو مرکزِ تعارف بنایا جائے تو رسولؐ کا رشتہ فاطمہ زہراؑ سے تو سیدھا ہے کیونکہ وہ بیٹی ہیں مگر علیؑ سے وہ داماد ہیں، حسنؑ اور حسینؑ نواسے ہیں، رشتہ گھوم کر جاتا ہے۔ اگر علیؑ کو بنایا جائے تو علیؑ کا رشتہ فاطمہ زہراؑ سے تو سیدھا ہے کہ وہ بیوی ہیں، حسنینؑ سے سیدھا ہے

میں۔ ارے یہ تو میرے رب کا دشمن ہے، یہ تو اسے مانتا ہی نہیں۔ اب خلّت کا تقاضہ، دوستی کا تقاضہ تھا کہ ٹھیک ہے، چو تھا وقت بھی گزر جائے مگر خدا بیزار میرے رزق میں شریک ہو یہ نہیں ہو سکتا۔ کہا ٹھیک ہے تو جو بدنصیب رازق کو مانتا ہی نہیں اس کا میرے رزق میں حصہ بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ بھی ایسا اصول کا پکا تھا کہ بھوکا اٹھ گیا مگر خدا کا نام نہ لیا۔

وہ بھوکا آیا تھا، بھوکا چلا گیا۔ وحی ہوئی ابراہیمؑ! یہ تم نے کیا کیا؟ اسے بھوکا چلا جانے دیا۔ ابراہیمؑ نے گھبرا کر کہا کہ پالنے والے تو نے مجھے اپنا دوست قرار دیا۔ وہ تیرا منکر، میں تیرا دوست ہم اور وہ ہم نوالہ و ہم پیالہ کیسے ہو جاتے۔ ارشاد ہوا کہ ابراہیمؑ محبت کا جوش ہوش پر غالب آگیا۔ تم نے یہ بھی تو سوچا ہوتا کہ میرا یہ منکر بندہ جب سے پیدا ہوا میں اسے رزق دے رہا ہوں کہ نہیں، یہ میری زمین پر، میرے آسمان کے نیچے، میری پیدا کی ہوئی ہوا میں، میری نعمتوں سے بہرہ مند ہو رہا ہے کہ نہیں؟ یہ ہمارا منکر ہے مگر جب ہم نے اس کے کفر کے سبب اس کا رزق بند نہیں کیا تو تم کون ہوتے تھے اسے بھوکا مارنے والے۔

معلوم ہوا کہ خدا سے بے نیاز نظام میں دوست دشمن کی تفریق ہوتی ہے۔ الٰہی نظام میں کسی کا حق نہیں مارا جاتا۔ وہ رازق سب کو رزق دلاتا ہے وہ پروردگار سب کی پرورش کراتا ہے۔ ابراہیمؑ رسول تھے، مرسل تھے، صاحب شریعت نبی تھے، خلیل خدا تھے مگر امامت کی پہلی منزل میں تھے، اس لیے عشق الٰہی میں نیک نیتی کے ساتھ سہی مگر بہر حال ایک ایسی بات

اس لیے کہ بیٹے ہیں، مگر رسولؐ سے چچازاد بھائی اور خسر کا رشتہ پھر گھوم گیا۔ اگر حسنینؑ کو بنایا جائے تو حسنینؑ کا رشتہ ماں اور باپ سے تو سیدھا ہے مگر رسولؐ سے کیونکہ نانا ہیں، رشتہ پھر گھوم گیا۔ اس کا مطلب یہ کہ پنجتنِ پاک میں اگر کوئی مرکز ایسا تھا کہ جس سے رشتہ ہر ایک کی طرف سیدھا جاتا ہو تو وہ صرف ایک فاطمہ زہرا کی ذات تھی۔ اس لیے کہ رسولؐ باپ تھے، علیؑ شوہر تھے، حسنینؑ بیٹے تھے۔ (صلواۃ)

ارشاد ہوتا ہے کہ ھُمْ فَاطِمَۃُ وَاَبُوْھَا وَ بَعْلُھَا وَ بَنُوْھَا فاطمہ ہیں اور ان کے والد ہیں وَ بَعْلُھَا، بعل کہتے ہیں شوہر کو، ان کے شوہر ہیں۔ اب آپ کسی حدیث کی کتاب اٹھا کر دیکھ لیں اُس میں ترجمہ یہ ملے گا "ان کے دونوں بچے ہیں"۔ بھائی صاحب یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے۔ انگریزی میں SINGULAR و PLURAL دو ہی ہیں، اردو میں بھی واحد اور جمع۔ ایک ہے تو ایک اور ایک سے زیادہ تو بس PLURAL اردو کے اعتبار سے اور فارسی کے اعتبار جمع مگر عربی میں تین ہوتے ہیں۔ ایک، دو، دو سے زیادہ۔ ایک کو کہا جاتا ہے واحد، دو کو کہا جاتا ہے تثنیہ، جب دو سے زیادہ ہوں تو کہا جاتا ہے جمع۔ جی! اگر آپ کو کہنا ہو ایک بیٹا تو آپ کہیں گے ابن، اگر آپ کو کہنا ہو ایک سے زیادہ مگر تین سے کم تو آپ کہیں گے اِبنان یا اِبنَین اور جب دو سے زیادہ ہوں تب آپ کہیں گے بنون یا بنین۔ جی ملاحظہ فرمایا آپ نے! اب دیکھیے اللہ کیا فرمارہا ہے، بچے تو دو ہی ہیں مگر

وہ کیا کہہ رہا ہے کہ ھُمْ فَاطِمَۃُ وَاَبُوْھَا وَبَعْلُھَا وَبَنُوْھَا۔ اب صحیح ترجمہ کیا ہوگا کہ فاطمہؑ ہیں، فاطمہؑ کے والد، ان کے شوہر اور ان کے دو سے زیادہ بچے۔ ترجمہ یہ ہوگا، دو بچے غلط ہے ترجمہ، دو سے زیادہ بچے۔

لیجیے بھئی! آنکھیں کہتی ہیں کہ دو بچے، قدرت کہتی ہے دو سے زیادہ بچے ہیں۔ نہ آنکھوں کو چھوڑ سکتے ہیں، نہ قدرت کو جھٹلا سکتے ہیں۔ اب کیا کریں؟ کوئی آدمی ہو تو کہیں کہ GRAMMETICAL MISTAKE ہو گئی اس سے۔ ایسی ذات ہے وہ کہ جہاں MISTAKE کا سوال نہیں، غلطی کا سوال نہیں۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ دو سے زیادہ کوئی تیسرا بچہ تھا ہی نہیں۔ میں بھی چکرا گیا کہ یا اللہ! یہ کیا ماجرا ہے! مگر چونکہ رابطہ اس SUPER BRAINS سے ہے جو کہ مدد کے لیے آجایا کرتے ہیں۔ میں نے کہا مدد کیجیے، میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ یہ کیا چکر ہے۔ ایک خیال آیا دل میں، آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

بس آخری بات برادران عزیز! اگر کوئی اور INTRODUCTION کرا رہا ہوتا تو وہ یہی کہتا کہ فاطمہؑ ہیں اور فاطمہؑ کے والد اور فاطمہؑ کے شوہر اور فاطمہؑ کے دو بچے۔ مگر یاد رکھیے کہ جس نے آیۂ تطہیر نازل کی تھی اگر وہ بھی یہی کہہ دیتا کہ فاطمہؑ کے دو بچے ہیں تو جو بعد میں آنے والے بچے تھے وہ سب وارثِ آیۂ تطہیر ہونے سے خارج ہو جاتے اس لیے ارشاد ہوا کہ نگاہِ ظاہر تک دو بچے ہیں مگر نگاہِ باطن میں ابھی

اور بچے ہیں جو سب کے سب وارثِ آیۂ تطہیر ہیں۔ (صلوٰۃ)

بس برادرانِ عزیز! تو یہ ہستیاں وہ ہستیاں ہیں کہ جو نور کی منزل میں شریک ہیں اور نور کی صفت میں نے آپ کے سامنے عرض کر دی ہے کہ جو شئے ہم نہیں دیکھ سکتے ہیں وہ بھی نور دیکھ لیتا ہے۔ اب میں کہاں ULTRAVIOLET اور INFRARED میں جاؤں گا XRAY کو آپ ملاحظہ کر لیجیے۔ پیٹ کے اندر کیا ہے کچھ پتہ نہیں مگر ایکسرے سے دیکھ لیتے ہیں کہ پیٹ کے اندر کیا ہے؟ الحمد للہ! کیا عرض کیا جائے، اسلام کی ہر شئے غارت ہو گئی ہے۔ اب بمبئی میں جو حاجی صاحبان پلٹ کر آئے ہیں، ان سب کے پیٹوں کا بھی ایکسرے ہوتا ہے۔ یعنی وہاں سے کیا تحفے لے کر آ رہے ہیں۔ تو اب اگر ان کو اپنی آنکھوں سے دکھائی دے جائے کہ پیٹ کے اندر کیا ہے تو ایکسرے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کا مطلب ہے کہ آنکھیں جسے نہیں دیکھ سکتی ہیں نور اسے دیکھ لیتا ہے اور دیکھ ہی نہیں لیتا بلکہ دکھا بھی دیتا ہے۔ یوں ہم نہیں دیکھ سکتے مگر ایکسرے سے ہم دیکھ لیتے ہیں۔ بس یہ نور کی صفت میں نے آپ کو بتا دی کہ وہ خود دیکھتا ہی نہیں ہے بلکہ جو خود دیکھتا ہے وہ دوسروں کو دکھا بھی دیتا ہے۔

میں مثال کے طور پر عرض کر رہا ہوں، معاذ اللہ کہاں یہ مادی نور اور کہاں وہ نور۔ اللہ نے مچھر کی مثال دی ہے قرآن مجید میں کہا ٹھیک ہے، اگر اسی سے کوئی حقیقت ثابت ہوتی ہے تو کوئی بات

نہیں ہے۔ مچھر کی مثال ہے قرآن مجید میں، تو میں بھی بطور مثال آپ کے سامنے عرض کر رہا ہوں۔ آپ نے ملاحظہ فرمالیا کہ نور کی صفت کیا ہے۔ کربلا میں یہی منظر ہماری نظروں کے سامنے تھا کہ جب شب عاشور حسینؑ نے کہا کہ میرا ساتھ چھوڑ کر چلے جاؤ اور سب نے کہا کہ ہم ساتھ چھوڑ کر نہیں جائیں گے، ہم جان دینے کے لیے آئے ہیں، ہم میدان چھوڑنے کے لیے نہیں آئے ہیں۔ تب حسینؑ نے کہا اچھا طے ہو گیا کہ تم میرا ساتھ نہیں چھوڑو گے۔ یعنی جب اصحاب حسینؑ نے دکھا دیا کہ ہم کو جنت کی لالچ بھی نہیں ہے، ہم تو حق کے فدائی ہیں۔ تب امامؑ نے ایک ایک صحابی کو بلایا کہا کہ زہیر ادھر آؤ، زہیر آئے، امام نے دو انگلیاں بلند کیں۔ کہا کہ دیکھو کچھ دکھائی دیتا ہے؟ کہا کہ ہاں قصر دکھائی دیتا ہے، حبیب کو بلایا دیکھتے ہو کچھ؟ جی ہاں! جنت کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ یہ منزل نور وہ تھی کہ جہاں چھپی ہوئی حقیقتیں امامؑ کی دو انگلیوں کے بیچ دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ سب منزلیں نور کی منزلیں ہیں۔

بس اب برادران عزیز! آج آٹھویں تاریخ محرم کی ہے۔ آج عباسؑ کا ماتم آپ کو کرنا ہے۔ حضرتِ فاطمہ زہراؑ شہزادی کونین، بتول عذرا دنیا سے رخصت ہو گئیں تو علی ابن ابی طالبؑ نے عقیل سے کہا کہ عقیل تم انسابِ عرب سے واقف ہو، میں چاہتا ہوں کہ میرے لیے ایک ایسی خاتون کا انتخاب کر دو جو ایک بہادر قبیلے

سے تعلق رکھتی ہو تاکہ اللہ اس سے مجھے وہ فرزند عطا کرے جو کربلا میں میرے حسینؑ کی نصرت کرے۔ اور پھر عقیل نے حضرت فاطمہ بنت حزام کا جن کی کنیت ام البنین ہے، انتخاب فرمایا اور یہ شاہزادی آئیں۔ اور تاریخ بتاتی ہے کہ جب آئیں تو گھر کے اندر داخل نہیں ہوئیں۔ جب علیؑ کا دروازہ دکھائی دیا تو بیٹھیں اور بیٹھنے کے بعد علیؑ کی دہلیز کو پہلے چوما اور اب یہ خاتون علیؑ کی دہلیز کو چوم رہی تھیں کہ حسنؑ حسینؑ اور زینبؑ و ام کلثومؑ یہ دونوں شاہزادیاں دوڑی ہوئی آئیں اور آنے کے بعد کہا کہ ماں اندر چلیے، ماں اندر چلیے تو کہا کہ بیٹا! جب تک ماں کہتی رہو گی میں گھر کے اندر قدم نہیں رکھوں گی۔ میں تمھاری ماں بن کر نہیں آئی ہوں، میں تم سب کی کنیز بن کر آئی ہوں، تم سب کی لونڈی بن کر آئی ہوں، تمھاری خدمتیں کرنے کے لیے۔ یہ تھی وفا ماں کی جو عباسؑ کو دودھ میں ملی تھی، وراثت میں۔

توجہ فرمائی آپ نے! ام البنین کا مرتبہ آپ کچھ کم سمجھتے ہیں۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر! جب شہادت کی خبر پہنچی ہے تو چار قبریں انگلی کے اشارے سے بناتی تھیں۔ یہ ایک بیٹے کی قبر ہے، یہ دوسرے بیٹے کی قبر ہے، یہ تیسرے کی، یہ عباسؑ کی قبر ہے اور اس کے بعد فرماتی تھیں کہ نہ میں اسے روؤں گی نہ اسے روؤں گی نہ اسے روؤں گی نہ اسے روؤں گی۔ میں فاطمہؑ کے لال کو روؤں گی۔ ہماری جانیں نثار ہو جائیں اس وفا شعار خاتون پر۔

بس عزادارانِ حسینؑ! جب حسینؑ کا لشکر ختم ہوگیا اور کوئی نہ رہا سوائے علی اکبرؑ کے۔ بعض روایت کی بنا پر تو عباسؑ ابن علیؑ آگے بڑھے اور کہا کہ آقا اب مجھے بھی مرنے کی اجازت دیجیے۔ حسینؑ نے عجب جملہ فرمایا کہا کہ بھیا تم تو میرے لشکر کے علمدار ہو اور سیدانیوں کو خیمے کے اندر کیا خبر کہ کربلا میں کیا ہو رہا ہے؟ تفصیلات سے ان کو کہاں آگاہی! ہاں تمھارے کاندھے پر جب تک یہ علم لہرا رہا ہے ان کو یہ اطمینان ہے کہ ہمارا بچانے والا موجود ہے اور جب یہ علم سیدانیوں کو دکھائی نہ دے گا تو عباسؑ، ان کے دل ٹوٹ جائیں گے۔ عباسؑ نے فرمایا کہ آقا! آپ نے فرمایا کہ تم لشکر کے علم دار ہو لیکن آقا علمدار وہیں ہوتا ہے جہاں لشکر ہوتا ہے تو اب جہاں لشکر چلا گیا ہے وہیں آپ مجھے علمداری کے لیے بھی بھیج دیں۔

عباسؑ اصرار کر رہے ہیں اور حسینؑ انکار کر رہے ہیں، اجازت نہیں دیتے کہ ایک مرتبہ (خیمے کے در پر یہ گفتگو ہو رہی ہے کہ) ایک چھوٹی سی بچی جس کا نام تھا سکینہؑ۔ جس کے ہونٹ سوکھ چکے تھے، جس کے رخسار پیاس کی شدت سے نیلے ہو چکے تھے جو باپ کی بھی چہیتی تھی اور چچا کی بھی چہیتی تھی، سوکھی ہوئی مشک لے کر دوڑتی ہوئی چچا کے پاس آئی اور آکر کہا چچا، سب تو سب، آپ کو بھی میرے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر ترس نہیں آیا۔ کیا آپ کو بھی میرے ان نیلے رخساروں کے اوپر ترس نہیں آتا۔ کیا آپ یہ گوارا کریں گے کہ میں پیاس

سے تڑپ تڑپ کر ہلاک ہو جاؤں۔ بس، سکینہ کو گود میں اٹھایا عباسؑ نے، کہا نہیں شاہزادی نہیں میری بچی! میں تیرے لیے پانی لے کر آؤں گا وہ مشک لے لی سکینہ کے ہاتھ سے اور حسینؑ کی طرف دیکھ کے فرمایا کہ آقا مجھے لڑنے کی اجازت نہیں دیتے، بتائیے اب میں سکینہؑ کو کیا جواب دوں۔ کم سے کم اتنی اجازت تو دے دیجیے کہ بچی کے لیے پانی لے آؤں تھوڑا سا جا کے۔ حسینؑ نے سر جھکایا، عباسؑ نے اسی کو اجازت سمجھا۔ مشکِ سکینہؑ لے کر چلے، مشک علم سے باندھ دی، گویا پہلے سے یہ اعلان کر رہے ہوں کہ میں پانی لینے آ رہا ہوں کسی میں دم ہو تو آ کر مجھے روک لے۔ اور اس کے بعد آ کر پہلے لشکرِ پسرِ سعد سے خطاب کر کے کہا کہ او رسولؐ کے نام نہاد کلمہ گو یو! کیا انصاف یہی ہے کہ اس دریا سے کتے اور سوّر تک پانی پیئیں اور تمھارے رسولؐ کا نواسہ اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے پیاس سے تڑپ تڑپ کر مرے جا رہے ہیں۔ تم ایک قطرہ پانی کا نہیں لینے دیتے۔ مگر جب ادھر سے جواب دیا گیا کہ حسینؑ سے کہہ دو کہ جب تک بیعت نہیں کریں گے ایک قطرہ پانی کا نہیں ملے گا۔

بس اتمامِ حجت ہو چکا تھا، عباسؑ نے حملہ کیا، حمید ابن مسلم کا بیان ہے کہ پہلے ہی حملے میں اسّی لاشے فرات کے کنارے تڑپنے لگے گھاٹ صاف ہو گیا، لوگ ڈر کر بھاگ گئے اور عباسؑ سیدھے پہنچے فرات کے کنارے اور اس کے بعد گھوڑا پانی میں ڈال دیا۔ مشک سکینہؑ بھری۔ مشک سکینہؑ بھرنے کے بعد کاندھے پر رکھی، اب

کہیے تو میں عباسؑ کی تعریف کروں۔ میں عباسؑ کی تعریف کیا کروں کہ وہ پیاسے نکل آئے۔ عباسؑ کی کیا تعریف کروں، عباسؑ جب گھوڑے پر بیٹھے ہوئے تھے اس کے لیے روایت ہے کہ عباسؑ نے اشارہ کیا کہ پانی پی لے، عباسؑ نے اشارہ کیا مگر گھوڑے نے پانی سے منھ اٹھا لیا۔ ارے جس کا گھوڑا پانی نہ پیے اس کے لیے آپ سوچ بھی سکتے ہیں؟ ہاں بس اتنا ضرور ہوا کہ عباسؑ نے چُلّو میں پانی لے لیا۔

میں کہتا ہوں کہ عباسؑ چُلّو میں بھی پانی نہ لیتے مگر عباسؑ نے چلّو میں پانی لے کے یہ دکھا دیا کہ پانی پر قبضہ ہمارا ہو گیا ہے اور اس کے بعد وہ پانی پھینک دیا اور پیاسے نکل آئے اور گھوڑے پر سوار ہوئے اور جیسا کہ ملعون حرملہ کی روایت میں نے آپ کے سامنے عرض کی تھی، بس جب لوگوں نے دیکھا کہ مشک پانی سے بھر گئی اور عباسؑ اب خیمے کی طرف چل رہے ہیں، ایک مرتبہ پسر سعد نے کہا کہ میرے سپاہیو! جانیں جائیں، سر کٹ جائیں، جسموں کے ٹکڑے اڑ جائیں مگر پانی کا ایک قطرہ بھی حسینؑ کے خیمے تک پہنچنے نہ پائے۔

عزادارو! سارے واقعات آپ کے سنے ہوئے ہیں مگر میں اس سنی ہوئی داستان کو آپ کے سامنے پھر دوہرا رہا ہوں تاکہ بچے بھی ان واقعات کو یاد رکھیں تاکہ آئندہ وہ اشاروں پر چل سکیں جیسے آج آپ اشاروں پر چل رہے ہیں۔

عباسؑ کاندھے پر مشک، ایک ہاتھ میں علم اور دوسرے ہاتھ سے

جہاد کر رہے ہیں اور کسی کے بس میں نہیں ہے کہ علیؑ کے شیر کو روک لے یہاں تک کہ جب یقین ہو گیا ان کو کہ ہم سب مل کر بھی عباسؑ کو روک نہیں سکتے تو عیاری اور مکاری یہ کی گئی کہ ایک دشمن ایک درخت کی آڑ میں آیا اور آنے کے بعد عباسؑ کا داہنا ہاتھ کاٹ دیا۔ عباسؑ نے اسی وقت رجز پڑھا کہ اگر تم نے میرا داہنا ہاتھ کاٹ دیا ہے تو میں بائیں ہاتھ سے جنگ کروں گا اور اپنے آقا کی مدد کروں گا اور بائیں ہاتھ سے جنگ کرنا شروع کر دی۔

عزادارانِ حسینؑ! اب عباسؑ کو یہاں جنگ کرنے دیجیے۔ اب چلیے دیکھیں خیمے میں کیا ہو رہا ہے۔ تو روایت بتاتی ہے کہ عباسؑ فرات کے کنارے چلے، حسینؑ درِ خیمہ پر کھڑے ہوئے عباسؑ کی جنگ کا نظارہ کر رہے ہیں۔ جب عباسؑ لشکر میں گھر گئے تو ظاہر ہے کہ اب دکھائی نہیں دے رہا ہے کہ کیا گذر رہی ہے لیکن ایک مرتبہ حسینؑ نے دیکھا کہ ان کے بھائی کا علم جھکا اور میں سمجھتا ہوں کہ ادھر عباسؑ کا علم جھکا ہو گا اُدھر حسینؑ کا دل ڈوبا ہو گا۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد دیکھا حسینؑ نے پھر علم سنبھل گیا۔ آپ سمجھے کہ کیا ہوا! پہلے داہنا ہاتھ کٹا، علم کو جھٹکا لگا تو پھر عباسؑ نے فوراً بائیں ہاتھ سے سنبھالا علم اور پھر اسی ہاتھ سے جہاد شروع کر دیا۔

اب عزادارانِ حسینؑ! بس اب اتنا کہنا ہے تم سے، عباسؑ کے چاہنے والے ہو تم، عباسؑ کے علم بہت اٹھاتے ہو نا تم! یا تو آگے

بڑھ کر عباسؑ کا علم سنبھال لو یا حسینؑ کا دل سنبھال لو، اس لیے کہ اب دوبارہ جو علم جھکا تو پھر اس علم کو سیدھا ہونا نصیب نہ ہوا بس عزادارانِ حسینؑ، لیکن عباسؑ دونوں ہاتھ کٹ جانے کے بعد بھی لشکر کو چیرتے پھاڑتے آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں یہاں تک کہ حرملہ کا تیر آیا سنسناتا ہوا اور مشکِ سکینہ توڑتا ہوا عباسؑ کے سینے سے پار ہو گیا۔

بس عزادارانِ حسینؑ! میں نے تاریخ میں اپنی نگاہوں سے عباسؑ کی دو دعائیں دیکھی ہیں جو مجھے آپ کے سامنے پیش کرنا ہے، پہلی دعا تو عباسؑ نے اس وقت کی کہ جب دونوں ہاتھ کٹ گئے۔ اپنی بے بسی کا احساس ہوا تو نظر اٹھا کر فلک کو دیکھا اور کہا کہ اَللّٰھُمَّ اِنَّ اَطْفَالَ الْحُسَیْنِ عَطْشَانِ پالنے والے! میرے کریم! میرے رحیم! میرے دونوں ہاتھ کٹ گئے اور حسینؑ کے بچے پیاسے ہیں۔ اس پانی کو کسی صورت سے خیمے تک پہنچا دے میرے کریم! مگر ابھی عباسؑ کی دعا ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک تیر سنسناتا ہوا آیا مشکِ سکینہؑ کے پار ہو گیا تو عباسؑ نے گھوڑے کی گردن پر سر رکھا اور سر رکھنے کے بعد دوسری دعا یہ کی کہ پالنے والے! تیری مصلحت نہیں تھی کہ پانی حسینؑ کے بچوں تک پہنچے، میں تیری مصلحت پر صابر و شاکر ہوں لیکن پالنے والے، اب میری دوسری دعا سن لے اور میری دوسری دعا یہ ہے کہ اگر یہ مشک حسینؑ کے خیمے تک نہیں پہنچی ہے تو میری لاش بھی اب سکینہ کے سامنے نہ جائے۔

ہوگئی جو نہ ہونا چاہیے تھی مگر یہی امامت جب اہل بیتؑ تک پہنچی تو اب منظر دوسرا دکھائی دے رہا ہے۔

انھوں نے خلق خدا کی خدمت کے سلسلہ میں کبھی نہیں دیکھا کہ آنے والا کون ہے۔ یہ تو بس ایک رشتہ دیکھا کرتے تھے کہ آنے والا کوئی بھی ہو، ہے تو اس کا پیدا کرنے والا ہمارا معبود۔ بس اب روایت آپ کی سنی ہوئی ہے کہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ کم سنی میں بیمار ہوگئے اور ماں نے نذر کرلی کہ میرے بچے صحت یاب ہوں گے تو میں تین روزے رکھوں گی۔ ماں کی خبر باپ کو ہوئی تو علیؑ بن ابی طالب نے بھی نذر فرمالی پھر خود شہزادوں نے بھی نذر کرلی اور گھر کی کنیز فضہؓ نے بھی نذر کرلی۔ واقعہ آپ کا سنا ہوا ہے مجھے تو صرف حق ادا کرنا ہے۔ چنانچہ بچے صحت یاب ہوئے، نذر پورا کرنے کا وقت آیا، اہل بیتؑ نے روزے رکھے، فضہ بھی روزے سے ہیں۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح سے تھوڑا سا سامان کھانے کا فراہم ہوا یعنی جَو کا آٹا۔ فاطمہ زہرؑا نے روٹیاں اپنے ہاتھوں سے تیار کیں، اور علیؑ تشریف فرما ہیں۔ امام حسنؑ، امام حسینؑ، فاطمہ زہرؑا اور گھر کی خادمہ فضہؓ اور ہر ایک کے سامنے ایک پانی کا جام اور ایک روٹی رکھی ہوئی ہے، ابھی روزہ کھولنے کا ارادہ کر رہے ہیں کہ دروازہ پر آواز آئی کہ آل محمدؐ جو تم کھا رہے ہو اس میں مجھے بھی شریک کرلو۔ مگر یاد رکھیے کہ اپنے کھانے میں شریک وہ کیا کرتے ہیں جو خدا میں شرکت کے قائل ہوتے ہیں یہاں علیؑ نے سب سے پہلے اپنے آگے سے روٹی اٹھائی، فاطمہ زہرؑا نے اپنے آگے سے روٹی اٹھائی، شہزادوں نے اپنے

بس عزادارانِ حسینؑ! سر اٹھایا، ایک ظالم سامنے آیا ایک بھاری گرز لیے ہوئے اور آنے کے بعد کہا کہ عباسؑ! کیا ہو گئی تمہاری بہادری؟ بڑی بہادری سے جنگ کر رہے تھے، کیا ہو گئی تمہاری شجاعت؟ کہا ملعون اب آیا ہے میرے سامنے جب میرے ہاتھ کٹ چکے ہیں۔ ہاتھ ہوتے تو بتاتا۔ اب میں کیا بتاؤں، ہائے اس کو ترس نہ آیا اور اس نے وہ بھاری گرز عباسؑ کے سر پر اس زور سے مارا کہ سرِ مبارک شگافتہ ہو گیا اور اس کے بعد علیؑ کا شیر گھوڑے کی بلندی سے زمین کی طرف جھکا ایک روایت یاد آگئی، کہیے تو پڑھ دوں آپ کے سامنے۔

عراق میں ایک ذاکر تھے جن کو عباسؑ ابن علیؑ سے اتنی محبت تھی کہ مجلس کا اختتام ہمیشہ ذکرِ عباسؑ پر کیا کرتے تھے۔ وہ ذاکر یہ فرماتے ہیں کہ ایک روز جیسے عباسؑ ابن علیؑ میرے خواب میں آئے ہیں اور آکر یہ فرما رہے ہیں کہ اے بھائی! تو جب میرے آقا کی مجلس پڑھتا ہے تو سب کے مصائب پڑھتا ہے میرے مصائب نہیں پڑھتا۔ انھوں نے کہا کہ آقا! آپ یہ کیا فرما رہے ہیں، میں تو کوئی مجلس بغیر آپ کے ذکر کے ختم ہی نہیں کرتا، یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ کہا کہ ہاں بھائی مجھے معلوم ہے کہ تو مجلس کو اس وقت تک ختم نہیں کرتا جس وقت تک میرا ذکر نہ کر لے لیکن تو ہر مصیبت بیان کرتا ہے میری ایک مصیبت تو بیان ہی نہیں کرتا۔ کہا آقا وہ کون مصیبت ہے آپ کی؟ کہا کہ وہ مصیبت یہ ہے کہ میرے آقا کا کوئی بھی سپاہی جب گھوڑے سے زمین پر گرنے لگا

تو کم سے کم اس کے ہاتھ موجود ہوتے۔ گرتے گرتے اپنے ہاتھوں کا سہارا لے لیتا اور میرے تو ہاتھ بھی کٹ چکے تھے۔ تجھے کیا خبر کہ جب گھوڑے سے گرا ہوں تو مجھ پر کیا گزری۔

گرتے گرتے آقا کو آواز دی۔ حسینؑ چلے، آئے اور آنے کے بعد بھائی کے سرہانے پہنچے۔ خدا کسی بھائی کو کسی بھائی کا وہ منظر نہ دکھائے کہ جو حسینؑ نے دیکھا۔ بیٹھ گئے زمین کے اوپر اور عباسؑ کا سر اٹھا کر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ روایت میں یہ ہے کہ جیسے ہی حسینؑ نے عباسؑ کا سر اٹھا کر اپنے زانو پر رکھا، عباسؑ نے اپنا سر پھر زمین پر رکھ لیا۔ پھر حسینؑ نے عباسؑ کا سر اٹھا کر اپنے زانو پر رکھا، پھر عباسؑ نے زمین پر رکھ لیا۔ کہا بھیا! میری وجہ سے زخمی ہوئے، میری وجہ سے جان دے رہے ہو، کیا مجھ سے ناراض ہو گئے ہو، اپنا سر کیوں میرے زانو پر سے ہٹا رہے ہو؟ کہا آقا کیا فرما رہے ہیں، اب کیا غلاموں کی بھی یہ مجال ہے کہ آقا سے ناراض ہو جائیں۔ کہا پھر کیوں اپنا سر بار بار میرے زانو سے ہٹا رہے ہو؟ اللہ اکبر! کیا ہے وفا عباسؑ کی بس اب چند لمحوں کے مہمان ہیں۔ کہتے ہیں آقا، آقا! مجھے ایک منظر کا خیال آرہا ہے۔ عباسؑ نے کہا کہ منظر مجھے یہ خیال آرہا ہے کہ جب میرا آخری وقت ہے تو میرا سر تو آپ کے زانو پر ہے آقا! لیکن جب آپ کا آخری وقت ہوگا تو آپ کا سر کس کے زانو پر ہوگا؟ آقا میری وفا کا تقاضہ یہ ہے کہ اگر آپ کا سر زمین پر رہے وقتِ آخر تو میرا سر بھی زمین پر رہے۔

میں کہتا ہوں آقا! فکر نہ کیجیے۔ حسینؑ کے وقتِ آخر اگر کوئی نہ ہوگا تو فاطمہ زہرؑا جنت سے آجائیں گی اور کہیں گی، آ میرے بچےّ تیرا سر میں اپنے زانو پر رکھ لوں۔

بس عزادارانِ حسینؑ! آخری منزل اور آخری جملہ اور اسی کے ساتھ ساتھ آپ کی زحمتیں ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ روایت میں ایک منظر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس کے بعد عباسؑ نے اشارۂ چشم سے، آنکھ کے اشارے سے علی اکبرؑ کو اپنے پاس بلایا اور جب علی اکبرؑ آگئے تو کہا کہ بیٹا ذرا اپنا کان میرے منھ کے قریب لے آؤ، کان لے گیا شاہزادہ عباسؑ کے دہن کے قریب، تو عباسؑ نے کہا کہ علی اکبرؑ میری تم سے ایک وصیت ہے۔ کہا کہ چچا ارشاد ہو، کیا وصیت ہے؟ کہا وصیت یہ ہے کہ میں جب دنیا سے رخصت ہو جاؤں تو تم جا کر پسرِ سعد سے کہنا کہ عباسؑ یہ وصیت کر گئے ہیں کہ اگر حسینؑ کی شہادت کے بعد حسینؑ کی لاش کو پامال کرنے کا ارادہ ہو تو حسینؑ کی لاش کو پامال نہ کرنا، عباسؑ کی لاش کو پامال کر دینا۔

بس عزادارانِ حسینؑ! اب موت کا پسینہ آنے لگا، سانس رکنے لگی۔ عباسؑ نے کہا آقا آقا! میں جا رہا ہوں، میں جا رہا ہوں۔ جنت کے دروازے کھلے ہوئے ہیں، لیکن وقتِ آخر میری ایک تمنا پوری کر دیجیے کہا کہو عباسؑ! کیا ہے تمھاری تمنا؟ کہا کہ تمنا یہ ہے کہ مجھ سے میری والدہ نے یہ بتایا ہے کہ جب میں پیدا ہوا تو میری آنکھیں بند تھیں، جب میں

آپ کی آغوش میں آگیا اس وقت میں نے آنکھ کھولی۔ تو سب سے پہلے دنیا میں آنے کے بعد میں نے آپ کے چہرے کی زیارت کی تھی آقا، کہا کہ پھر اب کیا چاہتے ہو، کہا کہ جہاں سے زندگی کی ابتدا ہوئی تھی وہیں پر زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ آنکھ کھول کر آپ کو دیکھا تھا تو چاہتا ہوں کہ آپ کو دیکھ کر ہمیشہ کے لیے دنیا سے آنکھیں بند کر لوں۔ کہا پھر کیوں نہیں دیکھتے مجھے۔ کہا آقا، کیسے دیکھوں؟ کیسے دیکھوں، ایک آنکھ میں تیر لگ چکا ہے اور دوسری آنکھ میں سر کا بہتا ہوا خون آکر جم گیا ہے۔ اے آقا! اگر میرے ہاتھ موجود ہوتے تو آپ کو یہ زحمت بھی نہ دیتا۔ اپنے ہاتھ سے اپنی آنکھ کا خون پاک کر لیتا۔ لیکن آقا، کیا کروں کہ ہاتھ میرے کٹ چکے ہیں۔ اگر ہو سکے تو مقدس عبا سے میری آنکھ سے خون کو پاک کر دیجیے۔ حسینؑ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، خون کو آنکھ سے پاک کیا۔ بھائی نے بھائی کو آخری مرتبہ حسرت سے دیکھا۔ حسینؑ نے کہا بھیا! تمہاری تمنا پوری ہو گئی، کہا ہاں، ہاں آقا! میری تمنا اب پوری ہو گئی۔ حسینؑ نے کہا کہ تو پھر میری بھی ایک تمنا ہے، پوری کر دو۔ کہا آپ کی کیا تمنا ہے آقا! کہا میری تمنا یہ ہے کہ جب سے پیدا ہوئے، تم نے مجھے کبھی بھائی کہہ کر نہیں پکارا۔ ایک مرتبہ بھائی کہہ کر پکار لو۔ حکمِ امامؑ سے مجبور ہو کر عباسؑ نے حسینؑ کو بھائی کہہ کر پکارا اور دنیا سے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔

نویں مجلس

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ
مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ٥ (سورہ آل عمران آیت ۸۵)

آج محرم کی نویں تاریخ ہے اور اسی آیت کو میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیا ہے جسے اب تک آپ کے سامنے تلاوت کرتا رہا تھا اور جس میں ہمارا پیدا کرنے والا بالکل واضح اور صاف لفظوں میں یہ اعلان کر رہا ہے کہ کوئی بھی انسان چاہے وہ کسی بھی دور میں ہو کسی بھی زمانے میں ہو، اگر اسلام کو چھوڑ کر کسی دوسرے دین اور کسی دوسرے نظام سے وفاداریاں اختیار کرے گا تو اس سے ہم وہ دین اور وہ نظام زندگی قبول نہیں کریں گے۔ اور ایسا انسان جب آخرت کی دائمی اور ابدی اور نہ ختم ہونے والی زندگی میں داخل ہو گا تو اسے خود اس بات کا پتہ چل جائے گا کہ اس نے اسلام کو چھوڑ کر اپنا نقصان کیا ہے۔

برادران عزیز! بس اب آج ہی کی یہ مجلس اور ہے کہ جس میں کچھ

باتیں عرض کر سکتا ہوں اس لیے کہ کل شامِ غریباں کی مجلس سوائے ذکرِ حسینیت کے اور ذکرِ مصائبِ کربلا کے کسی اور شے کو برداشت کرنے کے لائق نہیں ہے۔ تو کل میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ جتنا جتنا زمانہ آگے بڑھتا جائے گا اور سائنس کے ذریعے سے انسان کے علم میں KNOWLEDGE میں اضافہ ہوتا جائے گا اتنا اتنا اسلام کی چھپی ہوئی حقیقتیں واضح ہو ہو کر انسان کے سامنے آتی جائیں گی۔

بس آج گویا کہ اس آخری مجلس میں کچھ آخرت کے بارے میں عرض کر دوں۔ آپ دیکھیے کہ زمانہ جب آگے بڑھا ہے تو آخرت کا نظریہ بھی ہمارے سامنے SCIENTIFICALLY PROVE ہو کر اور ثابت ہو کر آگیا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ہم غور نہیں کرتے، توجہ نہیں کرتے ورنہ اگر ہم ذرا غور کریں تو جتنا جتنا دنیا آگے بڑھتی چلی جائے گی اتنا اتنا ہمارے عقیدوں کو بڑھتی ہوئی دنیا استحکام دیتی چلی جائے گی۔

پہلے آپ ایک بات سن لیں اور سمجھ لیں اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جو DISPUTED ہو۔ آج ہر وہ انسان کہ جو پڑھا لکھا ہے وہ اس بات کو جانتا ہے کہ کائنات کے پیدا کرنے والے نے اس دنیا کے بنانے والے نے دنیا میں کوئی شے جو ہے بے کار نہیں بنائی۔ ہر شے ایک PURPOSE کے لیے بنائی ہے، ہر شے کو ایک مقصد کے لیے بنایا ہے۔ ہماری جہالت تھی کہ ہم بہت سی باتوں کے مقصد کو نہیں سمجھ پا رہے تھے۔ جب علم آگے بڑھا تو ہم کو معلوم ہوا کہ یہ شے کیوں بنائی

گئی تھی۔ آسمان پر بجلی چمکا کرتی تھی مگر انسان اس چمکتی ہوئی بجلی کو دیکھ دیکھ کر ڈرا کرتا تھا اور اس کو یہ خبر نہ تھی کہ یہی بجلی انسان کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر سکتی ہے۔ زیادہ تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا ہوں میں اس لیے کہ وقت تنگ ہے اور ابھی مجھے کچھ اور باتیں بھی آپ کے سامنے عرض کرنا ہیں۔

بہر حال یہ بات طے شدہ ہے کہ انسان اپنی ناواقفیت اپنی جہالت اور اپنی نادانی کے سبب سے کسی بات کی علت اور اس کے CAUSE وجہ کو معلوم نہ کر سکے۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ پیدا کرنے والے" نے دنیا میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی شے بھی بغیر PURPOSE، بغیر مقصد کے نہیں بنائی ہے۔ اس نے جو شے بنائی ہے یا اس سے کام لے رہا ہے یا آئندہ اس کو کبھی اس سے کام لینا ہے، سائنس کی دنیا میں بھی مغرب کی دنیا سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی اب جب یہ بات طے شدہ ہے تو اب میں آگے بڑھ کر آپ سے عرض کرتا ہوں کہ سائنس آگے بڑھی اور آگے بڑھ کر اس نے انسان سے کہا کہ اے انسان! تو یہ سمجھتا تھا کہ تیری زبان سے جو لفظیں نکلتی ہیں، جو بول نکلتے ہیں جو WORDS نکلتے ہیں، جو تو گفتگو کرتا ہے، یہ فضا کے دامن میں ختم ہو جاتی ہے؟ ایسا نہیں ہے۔ جب تیری زبان کو حرکت ہوتی ہے اور زبان سے تیری کچھ لفظیں نکلتی ہیں اور کچھ جملے نکلتے ہیں تو وہ جملے تیری زبان سے نکل کر اس فضا میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے RECORD ہو جاتے ہیں۔ وہ مسلسل

مصروفِ سفر رہا کرتے ہیں مگر فنا نہیں ہوتے۔

توجہ فرما رہے ہیں آپ! اگر میری زبان سے نکلنے کے بعد الفاظ فوراً ختم ہو جاتے تو TAPE RECORDS کے امکان ہی میں نہ تھی یہ بات کہ وہ میری زبان سے نکلتے ہوئے جملوں کو RECORD کر لے۔ اس کا مطلب ہے کہ میری زبان سے آواز نکلنے کے بعد مر نہیں رہی ہے بلکہ سفر کر رہی ہے، مصروفِ سفر ہے اور یہ سفر اس کا ہمیشہ جاری رہے گا میں یہ بات آپ کے سامنے عرض کر دوں ابتدا میں کہ جو باتیں میں کہہ رہا ہوں اس کو میری ذمہ داری پر آپ قبول کر لیں اور اگر بعد میں آپ کو کوئی شک و شبہ ہو تو آپ مجھ سے سوالات فرما سکتے ہیں۔

بہرحال یہ طے شدہ بات ہے کہ ہماری زبان سے جو لفظیں نکلتی ہیں وہ ختم نہیں ہو جاتیں بلکہ وہ مصروف سفر رہتی ہیں اور اسی لیے سائنس میں اب یہ بات کہی جانے لگی ہے TECHNOLOGY کی دنیا میں کہ ابھی تو ہم نے وہی TAPE RECORDERS ایجاد کیے ہیں کہ ہم بولتے جائیں اور وہ RECORD کرتا جائے لیکن ہم کو اس بات کا EXPECTATION ہے، اس بات کی توقع ہے کہ ایک دن وہ بھی آئے گا کہ ہم ایسے RECORDS ایجاد کر لیں گے کہ جو دس برس پہلے کی آوازوں کو فضاؤں سے CATCH کر کے سنائیں گے، جو پچاس برس پہلے کی آوازوں کو سنانے پر قدرت رکھتے ہوں گے، جو سو برس پہلے زبانوں سے نکلے ہوئے الفاظ کو سنانے پر قدرت رکھتے ہوں گے۔

توجہ فرمائی آپ نے! میں تو کہتا ہوں کہ خدا کرے یہ ایجاد جلد از جلد ہمارے سامنے آجائے۔ اس لیے کہ جس دن یہ ایجاد ہمارے سامنے آگئی اسی دن بہت سے مسئلے حل ہو جائیں گے اور مسلمان خود سننے لگیں گے کہ زبانِ رسالت نے کس کے لیے کیا جملے کہے تھے۔ میں تو انتظار کر رہا ہوں کہ خدا کرے میری زندگی ہی میں یہ ایجاد میرے سامنے آجائے۔ اس لیے کہ مجھے اور تو کچھ سننے کی حسرت نہیں ہے لیکن غدیرخم کے مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ.... کے سننے کی مجھے بھی حسرت ہے۔ (صلوٰۃ) تو ہماری زبان سے جتنے بھی جملے نکل رہے ہیں وہ سب فنا نہیں ہو رہے ہیں، موجود ہیں سب۔

اس کے بعد دنیا ایک قدم اور آگے بڑھی اور اس کے بعد سائنس نے کہا کہ انسان، کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ تو جو مختلف ACTIONS کرتا ہے، مختلف کاموں کو انجام دیتا ہے، اپنے ہاتھوں اور دوسروں کی حرکتوں سے، MOVEMENT سے، اس کا کوئی RECORD نہیں ہے تو یہ بھی تیرا خیال غلط ہے۔ یہ سب سائنس بتا رہی ہے TECHNOLOGY بتا رہی ہے۔ مذہب نہیں بتا رہا ہے اور سائنس نے بتایا کہ جب تو کسی کام کے سلسلے میں اپنے ہاتھوں اور پیروں میں حرکت پیدا کرتا ہے ادھر ذرا سا حرکت ہوا اور ادھر WAVES بنیں اور ان WAVES اور ان لہروں کے ذریعے سے تیرے ہر کام کی تصویریں اور تیرے ہر کام کے فوٹو فضا کے دامن میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے بتانے

کی ضرورت نہیں ہے کہ آپ اشاروں پر چلنے والے ہیں جس سرزمین کے اوپر سے ایک ہوائی جہاز اڑتا ہوا نکل گیا اور پھر بعد میں حکومت کو یہ فکر ہوئی کہ معلوم کرے کہ یہ کون سا ہوائی جہاز تھا کہ جو ہماری سرحدوں کے اندر سے اڑتا ہوا چلا گیا تو وہ ہوائی جہاز کہ جو امریکہ کی فضاؤں سے گزرتا ہوا جا چکا تھا، اس نے اپنے پیچھے جو لہریں چھوڑی تھیں ایک مخصوص کیمرے سے ان لہروں کے ذریعے سے اُس ہوائی جہاز کی تصویر بنا کر دکھا دی گئی اور بتا دیا گیا کہ یہ MODEL تھا یہ SPEED تھی، اس رفتار سے جا رہا تھا، اتنی اونچائی کے اوپر جا رہا تھا۔ تو اس کا مطلب یہ کہ جب فضا میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے، لہریں پیدا ہوتی ہیں تو کام کی تصویر اس فضا کے دامن میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد علم اور ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور اس نے کہا کہ انسان کیا تو یہ خیال کرتا ہے کہ تیرے دل میں جو INTENTION ہوتا ہے، تیرے دماغ میں جو ارادے ہوتے ہیں، تیرے ذہن میں جو تصورات ہوتے ہیں تو اسے بھول جاتا ہے۔ تو تو یہ سمجھتا ہے کہ یہ فنا ہو گئے۔ نہیں، نہیں جو نیت تیرے دل میں پیدا ہوتی ہے، جو ارادے تیرے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں، جو تیرے تصورات ہوتے ہیں، یہ فنا نہیں ہوتے یہ کبھی SUB-CONSCIOUS میں چلے جاتے ہیں کبھی NON-CONSCIOUS میں چلے جاتے ہیں مگر فنا نہیں ہوتے۔ اب میری پہلی بات یاد رکھیے کہ اس کائنات کا نظام یہ ہے کہ یہاں کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام بھی

آگے سے روٹی اٹھائی، فضہ نے اپنے آگے سے روٹی اٹھائی اور پانچوں روٹیاں دے دیں سائل کو اور وہ چلا گیا۔

دوسرے دن پھر روزہ پر روزہ، آج ایک یتیم کی آواز آتی ہے آج بھی یہی سلوک اور تیسرے، دن ایک اسیر کی آواز آتی ہے۔ اس کا اشارہ قرآن مجید میں بھی موجود ہے کہ وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا ۝ یہ جن کا ہم تذکرہ کر رہے ہیں یہ وہ ہیں کہ جو اپنا کھانا اٹھا کر دے دیتے ہیں کبھی یتیم کو کبھی مسکین کو کبھی اسیر کو۔

بس برادران عزیز! میں آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں پہلے دن آنے والا مسکین مسلمان ہو سکتا ہے، دوسرے دن آنے والا یتیم مسلمان ہو سکتا ہے مگر تیسرے دن آنے والا اسیر، قیدی تو وہ مسلمان نہیں ہو سکتا۔ اس زمانے کا دستور یہ تھا کہ جنگی قیدی جب آجاتے تھے تو ان کو آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا کہ جاؤ اپنی روزی کماؤ۔ تو تیسرے دن آنے والا اسیر یہ یقیناً جنگی قیدی ہے جو مسلمانوں کے خلاف کسی جنگ میں شریک ہوا ہو گا تو آج تیرہ سو چودہ سو برس کے بعد میں یہ بات جانتا ہوں تو کیا آل محمدؐ نہ جانتے تھے۔ مگر تین دن کے فاقے کے بعد جب اسیر نے آکر دروازے پر سوال کیا تو آل محمدؐ نے یہ نہ کہا کہ مسلمانوں کا فاقہ توڑنا ہماری ذمہ داری ہے۔ ہم پر تین دن گزر چکے ہیں ہم تجھے کچھ نہیں دیں گے۔ نہیں، پہلے دن مسکین کو دیا، دوسرے دن یتیم کو دیا، تیسرے دن اسیر کو دیا اور اپنے کردار سے یہ ثابت کر دیا کہ ہم رحمۃ للمسلمین کے وارث نہیں ہیں ہم رحمۃ للعالمین کے وارث ہیں۔

بغیر کسی PURPOSE کے نہیں ہوا کرتا۔ جب کسی شے سے کچھ نہ کچھ کام لینا ہوتا ہے تو اللہ اسے بناتا ہے تو میں اب آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ جب UNIVERSALLY ACCEPTED اصول یہی ہے تو اب آپ مجھے بتائیں کہ ہماری زبان سے نکلنے والے لفظوں کو کیوں PERMANENTLY RECORD کیا جارہا ہے، ہمارے ایک ایک کام کے فوٹو کیوں فضا میں محفوظ کیے جارہے ہیں، ہماری نیتوں کے RECORD کیوں رکھے جارہے ہیں؟ جب تک کہ آپ آخرت کے دن کے قائل نہ ہوں گے آپ کو ریکارڈ کیے ہوئے الفاظ کا مطلب مل نہ سکے گا، آپ کو کھینچی ہوئی تصویروں کا مل نہ سکے گا، آپ کو نیتوں کے ریکارڈ ہونے کے سوال کا PURPOSE جواب مل نہ سکے گا۔ اسلام اس کا جواب دے گا کہ تیرا پیدا کرنے والا اے انسان! یہ جانتا تھا کہ تیری عادت ہے کہ بات کہتا ہے اور مکر جاتا ہے، تو کام کرتا ہے اور انکار کر دیتا ہے۔ اور اگر بات اور کام کی پکڑ ہو جائے تو اپنی نیتوں کی تاویل شروع کر دیتا ہے۔ اسی لیے اس نے اس کائنات میں ایسا نظام بنا دیا کہ جس نظام کے تحت تیری زبان سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو ریکارڈ کر لیا گیا ایک ایک کام کی تصویریں لے لی گئیں اور نیتوں کو محفوظ کر لیا گیا کہ کل حشر کے میدان میں جب تو اپنی باتوں سے انکار کرے تو باتیں سنا دی جائیں، کاموں سے انکار کرے تو کاموں کی فلم دکھا دی جائے، نیتوں سے انکار کرے تو نیتوں کے ریکارڈ پیش کر دیے جائیں۔ (صلوٰۃ)

اور اس نظام کے لیے آپ اور کوئی دوسری توجیہ اور کوئی تاویل نہیں کر سکتے جیسا کہ کل میں نے آپ کے سامنے پیش کیا تھا کہ ہمارے ہر ہر ایک بُنِ مو سے آواز آرہی ہوگی کہ ہم نے کیا کیا، ہمارا دل اور ہمارا دماغ بتا رہا ہوگا کہ ہم نے کس کام کو کس نیت سے انجام دیا۔

برادرانِ عزیز! کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ صرف ہم ہی مجلسِ عزا میں شرکت کریں یا وہ بھی جو اللہ نے آپ کی گود میں چمن کھلا دیا ہے، یہ چھوٹے چھوٹے بچے۔ آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ ہی کے دل میں خالی حسینؑ کی محبت رہے یا آپ یہ چاہتے ہیں کہ اسی طرح سے یہ بچے بھی حسینؑ کی غلامی پر ناز کریں کہ جس طرح سے آپ ناز کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ حسینؑ نے کربلا کے میدان میں اگر صرف اپنی جان دی ہوتی تو ہم یہ سوچ لیتے کہ ہم نے حسینؑ سے محبت کر لی اتنا کافی ہے مگر حسینؑ نے اسلام کو بچانے کے لیے فقط اپنی ہی جان نہیں دی تھی، اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں تک کو قربان کر دیا تھا۔ گویا حسینؑ درس دے رہے ہیں کہ میں نے کربلا کے میدان میں اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو قربان کر کے تم سے اس مطالبے کا حق محفوظ کر لیا ہے کہ جب تم دنیا سے جانے لگو تو اس بات کا انتظام کر کے جاؤ کہ میری محبت کو اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے دلوں میں منتقل کر کے جاؤ اور اس کے لیے دوسرا کوئی انتظام نہیں ہو سکتا ہے۔

یہاں کا ماحول جتنا خطرناک ہے وہ آپ کے پیش نظر ہے .T.V

یہاں پر جس طرح سے مصیبت بنا ہوا ہے وہ آپ حضرات جانتے ہیں۔ برادرانِ عزیز! اگر ہم یہاں پر کسی ناسازگار حالات میں پھنس جائیں، یہاں تو ظاہر ہے کوئی EPIDEMIC، وبا نہیں پھیلتی ہے۔ ہندوستان آپ آجائیں اور ملیریا پھیلا ہوا ہو اور آپ اس علاقے میں رہنے کے لیے مجبور ہوں تو آپ کیا کریں گے؟ آپ کے پاس دو ہی صورتیں ہیں یا تو وہ علاقہ چھوڑ دیں گے آپ MIGRATE کر کے دوسرے علاقے میں چلے جائیں گے اور اگر MIGRATE نہیں کریں گے تو آپ انجکشن لیتے رہیں گے دوائیں استعمال کرتے رہیں گے تاکہ ملیریا کا اثر آپ کے جسم پر نہ ہونے پائے۔ آپ اس ماحول میں رہنے کے لیے مجبور ہیں اور میں کہتا ہوں آپ اس ماحول میں ضرور رہیں مگر یہاں جو زہریلی ہوائیں چل رہی ہیں، یہاں جو بداخلاقی کو EPIDEMIC، وبا پھیلی ہوئی ہے اس سے بچنے کے لیے میں کہتا ہوں کہ ضروری ہے کہ آپ اپنے بچوں کو وقتاً فوقتاً مذہب کے انجکشن لگواتے رہیں اور مذہب کی دوائیں پلاتے رہیں تاکہ ان کے اوپر ان ہواؤں کا اثر نہ ہونے پائے۔ اس لیے میں آپ سے بکمالِ ادب اور بکمالِ خلوص یہ گزارش کروں گا کہ جہاں آپ اتنی زحمت کرتے ہیں، وہاں اتوار کے دن SUNDAY کو جو یہاں اسکول لگتا ہے اس میں آپ اپنے بچوں کو ضرور لے کے آئیں تاکہ وہ بچے آپس میں ملنے جلنے لگیں، تاکہ ان کو COMMUNITY کا احساس پیدا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے دین اور اپنی مذہبیت سے واقفیت بھی حاصل

کرتے چلے جائیں۔ (صلوٰۃ)

اسی کے ساتھ ساتھ دوسری گزارش جو مجھے آپ سے کرنا ہے وہ ہے قبرستان کا مسئلہ۔ آپ کو معلوم ہے کہ کچھ قبریں جو ہیں وہ یہاں پر خرید لی گئی ہیں۔ مجھ سے پوچھا گیا تھا کہ بہتر ہے کہ خدا نخواستہ کسی مومن کا انتقال یہاں ہو تو اسے ہندوستان یا پاکستان بھیج دیا جائے یا اسے یہاں دفن کیا جائے۔ میں نے کہا بہتر یہ ہے کہ اسے یہاں دفن کیا جائے۔ اس لیے کہ اگر کچھ مومنین یہاں دفن نہیں ہوئے تو جب ہمارے امامؑ کا ظہور ہوگا تو ساری دنیا سے لوگ مدد کرنے کے لیے چلیں گے مگر اس علاقے سے نہ جاسکیں گے۔ تو میں چاہتا ہوں کہ یہاں بھی کچھ امامؑ کے چاہنے والے امامؑ کے غلام دفن ہو جائیں تاکہ یہ خطہ خالی نہ رہنے پائے۔ ناصرانِ امامؑ سے بس اب اس سے زیادہ مجھے کچھ عرض کرنا نہیں ہے۔

بس برادران عزیز! تو میں عرض کر رہا تھا آپ کے سامنے، ایک میں نے آپ کے سامنے آخرت کی حقیقت پیش کی تھی اور میں نے عرض کیا تھا کہ اللہ نے ہماری ہدایت کے لیے کچھ نورانی ہستیوں کو بھیجا جو منزلِ نور میں تھیں اور اس سلسلے میں میں نے حضرت فاطمہ زہراؑ کا ذکر کیا اور میں چاہتا ہوں کہ آج بھی وہی ذکر چلتا رہے۔

برادرانِ عزیز! آپ توجہ فرمائیے، تمام شیعہ اور سنی تاریخیں اور حدیثیں اس پر شہادت دیتی ہیں کہ کُلَّمَا دَخَلَتْ فَاطِمَۃُ عَلٰی

رَسُولِ اللّٰہِ قَامَ اِلَیھَا رَسُولُ اللّٰہِ وَ رَحَّبَھَا وَ قَبَّلَ یَدَیْھَا وَ اَجْلَسَھَا فِی مَنْزِلِہٖ یہ صحیح ترمذی کے الفاظ ہیں جس کو بعینہٖ میں نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے کہ امام ترمذی یہ فرماتے ہیں کہ ایک دو مرتبہ کی بات نہیں ہے جب بھی فاطمہ زہرا رسولؐ کے پاس آتی تھیں تو رسولؐ ان کو دیکھ کر تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے وَرَحَّبَھَا اور ان کو مرحبا کہتے تھے WELCOME کہتے تھے ان کو وَ قَبَّلَ یَدَیْھَا اور ان کے ہاتھوں کے بوسے لیتے تھے وَ اَجْلَسَھَا فِی مَنْزِلِہٖ اور اپنی جگہ بٹھا دیا کرتے تھے۔ اپنی جگہ فاطمہ زہرا کے لیے رسولؐ چھوڑ دیا کرتے تھے۔

دنیا میں آپ نے کسی باپ کو نہیں دیکھا ہو گا کہ جو اپنی اولاد کو دیکھ کر کھڑا ہو جائے۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں بس ایک ہی مرتبہ یہ منظر دیکھا ہے جب ایک باپ اپنی اولاد کی تعظیم کے لیے کھڑا ہو گیا تھا، صرف ایک بار۔ ہندوستان میں ایک مشہور شہر ہے پٹنہ۔ وہاں شیعہ کانفرنس کا جلسہ ہو رہا تھا اور صدرِ جلسہ کے والد اسٹیج کے اوپر بیٹھے ہوئے تھے اور صدر جلسہ نہیں آئے تھے۔ پورا مجمع موجود تھا، جب صدرِ جلسہ داخل ہوئے تو جہاں پورا مجمع ان کی تعظیم کے لیے کھڑا ہوا وہاں باپ بھی ان کی تعظیم کے لیے کھڑا ہو گیا۔ کیوں، اس لیے کہ اب وہ بحیثیت بیٹے کے نہیں آ رہا تھا بلکہ بحیثیت صدر جلسہ کے آ رہا تھا۔ تو آدابِ جلسہ کا تقاضہ تھا کہ یہ باپ ہے تو ہوا کرے مگر اسے تعظیم کے لیے اٹھنا پڑے گا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں کہیں باپ کسی اولاد کی تعظیم کے لیے

اٹھتا ہے تو اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ رشتے کے لحاظ سے تعظیم نہیں ہو رہی ہے، منصب کے لحاظ سے تعظیم ہو رہی ہے۔ تو آپ سمجھ لیں کہ رسولؐ اگر فاطمہ زہراؑ کی تعظیم کے لیے اٹھتے تھے تو یہ اظہارِ محبت نہ تھا، اظہارِ جلالت تھا، یہ اظہارِ منزلتِ فاطمہؑ تھا۔ سمجھ دار مجمع ہے اس لیے میں آپ کے سامنے عرض کرنا چاہتا ہوں۔ برادرانِ عزیز! روایت بتاتی ہے کہ جب فاطمہ زہراؑ آتی تھیں تو رسولؐ ان کے استقبال کے لیے اٹھتے تھے اور جب رسولؐ فاطمہ زہراؑ کے یہاں جاتے تھے تو فاطمہ زہراؑ یہی سلوک ان کے ساتھ کرتی تھیں کہ اپنے بابا کو دیکھ کر کھڑی ہو جاتی تھیں، ہاتھوں کے بوسے لیتی تھیں، اپنی جگہ اپنے بابا کے لیے چھوڑ دیتی تھیں۔

میں آپ کے سامنے اس منزل پر ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے جذبات کو ٹھیس نہیں لگانا چاہتا مگر ایک حقیقت ہے۔ علیؑ ابن ابی طالب کے مرتبہ سے کون مسلمان ہے کہ جو انکار کر سکے لیکن میں کیا کروں کہ میں نے کسی شیعہ سُنّی روایت میں نہیں دیکھا کہ جب علیؑ آئے ہوں تو رسولؐ تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے ہوں۔ ہاں یہ ہمیشہ میں نے دیکھا میں نے دیکھا کہ فاطمہؑ آتی ہوں تو رسول تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے ہوں۔ تو علیؑ کا مرتبہ کم تو نہیں ہے، پھر کیا بات ہے کہ رسولؐ علیؑ کے استقبال کے لیے آگے نہیں بڑھتے ہیں؟ فاطمہ زہراؑ کے استقبال کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ آج کی دنیا میں یہ مسئلہ سمجھا دینا آسان ہے۔ آپ کو

معلوم ہے کہ آج دنیا مختلف STATES میں، مختلف حکومتوں میں، مختلف ملکوں میں بٹ گئی ہے اور آپس میں ایک دوسرے سے تعلقات خوشگوار رہنے کے لیے RELATIONS اچھے رکھنے کے لیے ایک ملک کا لیڈر دوسرے ملک میں جاتا ہے دورہ کرنے کے لیے تو PROTOCOL کی بات یہ ہے کہ جس STATUS کا انسان یہاں سے جاتا ہے دورہ کرنے کے لیے اسی STATUS کا نمائندہ آتا ہے اس کا استقبال کرنے کے لیے۔ ملک چاہے چھوٹا ہو چاہے بڑا ہو۔ مثال دے دوں آپ کے سامنے تو بات واضح ہو جائے گی۔ فرض کیجیے نیپال ایک بہت چھوٹا سا ملک ہے ہندوستان سے ملا ہوا، وہاں کا بادشاہ اگر کسی بڑے ملک میں آرہا ہے دورہ کرنے کے لیے تو وہاں کا HEAD OF THE STATE یہ نہیں سوچے گا چونکہ ایک چھوٹے سے ملک کا بادشاہ آرہا ہے، ہمارا کوئی وزیر ہی جا کر استقبال کر لے۔ وہ ملک چھوٹا ہے تو ہوا کرے مگر چونکہ وہاں کا HEAD OF THE STATE آرہا ہے اس لیے یہاں کا HEAD OF THE STATE ہی جا کر استقبال کرے گا اور اگر کسی بڑے ملک کا کوئی وزیر نیپال چلا جائے گا دورہ کرنے کے لیے VISIT کرنے کے لیے تو نیپال کا بادشاہ یہ نہیں سوچے گا کہ اتنے بڑے ملک کا وزیر آرہا ہے میرے ملک کا دورہ کرنے کے لیے، تو وزیر میرا نہ جائے استقبال کرنے کے لیے بلکہ میں خود چلا جاؤں استقبال کرنے کے لیے۔ وزیر آئے گا تو وزیر جائے گا استقبال کرنے کے لیے اور HEAD OF THE STATE آئے گا تو HEAD OF THE STATE جائے گا استقبال

کرنے کے لیے، ملک چھوٹا ہو چاہے ملک بڑا ہو، جب یہ PROTOCOL کی بات میرے سامنے آگئی تو مسئلہ حل ہو گیا۔

برادران عزیز! آپ یاد رکھیے کہ علیؑ ابن ابی طالب کو ہر فضیلت حاصل تھی، مرتبہ حاصل تھا، لیکن پھر بھی رسولؐ کی حیثیت تھی بادشاہ کی اور علیؑ کی حیثیت تھی وزیر کی۔ اور فاطمہ زہراؑ ایک چھوٹی سی مملکت کی سہی مگر عورتوں کے لیے رسولؐ کی طرح سے نمائندۂ خدا تھیں۔ تو چونکہ منصب سے منصب ملتا ہوا تھا اس لیے علیؑ کی تعظیم کے لیے رسولؐ نہ اٹھتے تھے، فاطمہ زہراؑ کی تعظیم کے لیے اٹھ جاتے تھے۔ (صلوٰۃ)

بس برادران عزیز! ہماری شاہزادی کا ایک واقعہ ملتا ہے اس منزل پر کچھ لوگوں کو ذرا شبہ ہو گیا ہے اس لیے میں نے چنا، SELECT کیا کہ اس واقعہ کو ذرا عرض کر دوں تاکہ وہ شبہ اس ذیل میں دور ہو جائے۔ عید کی رات ہے اور بچوں نے مادرِ گرامی سے کہا ماں! مدینہ کا ہر بچہ آج نئے کپڑے پہنے ہوئے ہے، نئی پوشاک، نیا لباس پہنے ہوئے ہے، ہمارے تن پر آج بھی وہی پھٹا پرانا لباس ہے۔ ماں کا دل ٹوٹ گیا، کہا بچوں سو جاؤ، تمھارے کپڑے درزی لے کر آجائے گا۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ کوئی دروازے پر آیا اور جب پوچھا گیا کہ کون؟ تو کہا کہ میں حسنینؑ کا درزی ہوں، کپڑے لے کر آیا ہوں۔ سنا آپ نے! اب لوگ یہاں پر یہ کہتے ہیں کہ آپ تو کہتے ہیں کہ فاطمہ زہراؑ صدیقہ تھیں۔ صدیقہ وہ کہ جس کی زبان پر جھوٹ نہ آئے۔ فاطمہ زہراؑ

کی زبان پر بچوں کو سمجھانے کے لیے ہی سہی، معاذ اللہ جھوٹ تو آ گیا۔

میں کہتا ہوں میرے بھائی آپ کو غلط فہمی ہے۔ زبان فاطمہؑ پر جھوٹ نہیں آیا۔ جھوٹ ہے کیا؟ اگر میں آپ کے سامنے یہ کہوں کہ لاس اینجلس میں پانی برسا تھا تو آپ کو دیکھنا پڑے گا کہ صبح سے شام تک بارش ہوئی تھی کہ نہیں۔ اگر پانی برسا تھا تو میں سچا اگر نہیں برسا تھا تو میں جھوٹا۔ اور اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ کل لاس اینجلس میں پانی برسے گا تو ابھی آپ طے ہی نہیں کر سکتے کہ میں سچا ہوں کہ جھوٹا۔ اب کل آنے دیجیے، اگر کل پانی نہیں برستا تو میں جھوٹا اور اگر کل پانی برس گیا تو میں سچا۔ تو فاطمہ زہراؑ گزشتہ واقعے کی خبر نہیں دے رہی ہیں، فرماتی ہیں کہ بچوں سو جاؤ درزی کپڑے لے کر آئے گا۔ تو اب دیکھیے کہ رضوان جنت درِ فاطمہؑ پہ کیا آواز دیتا ہے، اگر وہ یہ کہتا ہے کہ میں رضوان ہوں تو مان لیجیے کہ فاطمہ زہراؑ کی زبان پر معاذ اللہ جھوٹ آ گیا اور اگر زبانِ فاطمہ زہراؑ سے نکلے ہوئے جملوں کی لاج رکھنے کے لیے اسے رضوانِ جنت کا منصب چھوڑنا پڑے اور کہنا پڑے کہ میں حسنینؑ کا درزی ہوں تو سمجھیے کہ یہ وہ صدیقہ طاہرہ تھی کہ واقعہ جس کے الفاظ کی گردش کو دیکھا کرتا تھا جو زبان سے نکل جاتا تھا وہی حقیقت کا پیکر بن جاتا تھا۔ (صلوٰۃ)

یہی شاہزادی وہ ہے کہ جس کے لیے حضورؐ نے فرمایا کہ فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِنِّيْ مَنْ اٰذَاهَا فَقَدْ اٰذَانِيْ وَمَنْ اٰذَانِيْ فَقَدْ اٰذَى اللّٰهَ

وَمَنْ اٰذَی اللّٰہَ فَقَدْ کَفَرَہ فاطمہؑ، فاطمہؑ میرا ہی ایک جزو ہے۔ پھر لوگ یہ غلطی کر جاتے ہیں اور پارۂ جگر کہہ دیتے ہیں اور دل کا ٹکڑا کہہ دیتے ہیں۔ یہ ترجمہ غلط ہے، ایسا نہیں ہے۔ PART میرا ایک حصہ ہے، میرا ایک ٹکڑا ہے، میرا ایک جزو ہے۔ جس نے فاطمہؑ کو ستایا یا اذیت پہنچائی اس نے مجھے اذیت پہنچائی اور جس نے مجھے دُکھ پہنچایا اس نے خدا کو دُکھ پہنچایا، وہ اسلام سے خارج۔ یہ حضورؐ کی حدیث ہے جو شیعہ اور سُنّی دونوں کی کتابوں میں ایک طرح سے پائی جاتی ہے۔ برادران عزیز، سارے مسئلے حل ہو گئے۔ شیعہ اور سنی دونوں لکھتے ہیں فَاطِمَۃُ بَضْعَۃٌ مِنِّی... فاطمہؑ میرا ٹکڑا ہے۔ اب جب رسولؐ نے یہ ارشاد فرما دیا کہ فاطمہؑ میرا ٹکڑا ہے تو اب فاطمہؑ کے بارے میں کوئی بحث ہی بے کار ہے۔

برادران عزیز! آج یہاں نذر ہو رہی ہے، باہر بڑے بڑے پتیلوں میں شربت رکھا ہوا ہوگا، کل بھی نذر ہوئی تھی اور شربت رکھا ہوا تھا کیا یہ بات ممکن ہے کہ میں کسی بڑے برتن سے ایک گلاس میں شربت نکالوں اور جس برتن سے میں نے شربت نکالا ہے، اس برتن میں جو شربت ہو وہ میٹھا ہو اور یہ پھیکا ہو، وہ ٹھنڈا ہو اور یہ گرم ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جب یہ اسی کا PART ہے، اسی کا ایک ٹکڑا ہے، اسی کا ایک حصہ ہے، اسی کا ایک جزو ہے کہ جو الگ ہو گیا ہے تو جیسا وہ ہے ویسے ہی یہ بھی ہو گا۔ وہ اگر ٹھنڈا ہے تو یہ بھی ٹھنڈا ہو گا، وہ اگر گرم ہے تو یہ بھی گرم ہو گا، وہ اگر میٹھا ہے تو یہ بھی میٹھا ہو گا، اگر وہ

میں یہ واقعہ آپ کے سامنے پڑھ رہا تھا کہ پہلے دن آنے والا مسکین تھا، دوسرے دن آنے والا یتیم تھا اور تیسرے دن آنے والا اسیر تھا۔ مگر عزیزو! جو مسکین تھا وہ یتیم نہیں تھا اور جو یتیم تھا وہ اسیر نہیں تھا مگر خود آل محمدؐ پر یہ وقت پڑا تھا کہ ایک منزل ایسی آگئی تھی کہ ان کے بچے مسکین بھی تھے، یتیم بھی تھے اور اسیر بھی تھے۔ مگر ان پر کوئی ترس کھانے والا نہ تھا۔ کیا سکینہؑ سے بڑھ کے دنیا میں کوئی یتیم بچہ ہو سکتا ہے، مسکین ہو سکتا ہے، اسیر ہو سکتا ہے۔ ایک ہی بچی مسکین بھی تھی، یتیم بھی تھی، اسیر بھی تھی۔

تاریخ بشر میں کیا کوئی ایسا بچہ گزرا ہے جو ایک ہی وقت میں مسکین بھی ہو، یتیم بھی ہو، اسیر بھی ہو۔ یہ سکینہ کی مصیبت کہ مسکین بھی ہیں، یتیم بھی ہیں، اسیر بھی ہیں۔ مگر اس بچے کو کھانا تو کھانا پانی سے بھی محروم رکھا جا رہا ہے۔ کبھی طمانچے لگائے جاتے ہیں کبھی تازیانے۔

بس عزادارانِ حسینؑ! آج پہلی محرم کی شب ہے اور ابھی جیسا کہ آپ سوز خوانی میں سماعت فرما رہے تھے، آج کی تاریخ کی خصوصیت یہ ہے کہ آج آپ حسینؑ کی مدینہ سے رخصت کا حال سماعت کرتے ہیں۔

برادرانِ عزیز! آپ جب اذان دیتے ہیں، جب اللہ کا نام چار طرف آپ اپنی آواز میں پہنچا دیتے ہیں تو آخر میں آپ یہ دعا کرتے ہیں کہ پالنے والے ہم نے تیرا نام بلند کیا، تیری وحدانیت کی شہادت دی، اب ہماری زندگی کی آخری سانسیں ہمارے نبیؐ کی قبر کے پاس گذریں۔ تو عزادارو! آج ہر مومن کے دل کی تمنا یہ ہے کہ اس کی زندگی کی آخری سانسیں اس کے نبیؐ کی قبر

کھٹا ہے تو یہ بھی کھٹا ہو گا، جیسا وہ ہو گا ویسا ہی یہ ہو گا۔ اس لیے کہ وہ کُل ہے اور یہ اس کا جزو ہے۔ تو جب رسولؐ نے فرمادیا کہ فاطمہؑ میرا ٹکڑا ہے، میرا ایک جزو ہے تو پھر فاطمہؑ کی عصمت کے بارے میں بحث کرنا بے کار ہے۔ فاطمہؑ کی طہارت کے بارے میں بحث کرنا بے کار، فاطمہؑ کی نورانیت کے بارے میں بحث کرنا بے کار۔ اگر رسولؐ نورانی ہیں تو فاطمہؑ بھی نورانی، اگر رسولؐ معصوم ہیں تو فاطمہؑ بھی معصوم، اگر رسولؐ طیب و طاہر ہیں تو فاطمہؑ بھی طیبہ و طاہرہ ہیں۔ (صلوٰۃ)

بس ایک بات اور عرض کر دوں، ایک ACADEMIC بات ہے. میں کسی کے دل کو دکھایا نہیں کرتا، کل میں نے عرض کیا تھا آپ کے سامنے حدیث کساء پڑھتے وقت کہ جب حضرت فاطمہؑ زہرا، حضورؐ، علیؑ ابن ابی طالب، امام حسنؑ اور امام حسینؑ یہ سب چادر کے اندر جمع ہو گئے تو جبرئیل نے کہا کہ یَارَبِّ وَمَنْ تَحْتَ الْکِسَاءِ اے پالنے والے! یہ بتادے کہ چادر کے نیچے کون کون ہیں؟ بس آخری بات عرض کر رہا ہوں میں۔ آج فضائل کی زیادہ گنجائش نہیں ہے. تو اللہ نے ارشاد فرمایا جبرئیل سے کہ ھُمْ فَاطِمَۃُ وَاَبُوْھَا وَبَعْلُھَا وَبَنُوْھَا فاطمہؑ ہیں اور فاطمہؑ کے والد، فاطمہؑ ہیں اور فاطمہؑ کے شوہر، فاطمہؑ ہیں اور فاطمہؑ کے بچے۔ یہ کس نے کہا ہے؟ میں نے نہیں کہا، کسی راوی نے نہیں کہا، جبرئیلؑ نے نہیں کہا بلکہ خود اللہ نے فرمایا۔ جب جبرئیلؑ سوال کرتے ہیں کہ یہ اہل بیتؑ کون ہیں؟ تو ارشاد ہوتا ہے کہ یہ

اہل بیتؑ وہ ہیں کہ جس میں ایک فاطمہؑ کا باپ ہے، ایک فاطمہؑ کا شوہر ہے اور دو فاطمہؑ کے بچے ہیں۔ تو بھائی صاحب! جب جبرئیل پوچھ رہے تھے کہ اہلِ بیتؑ کون ہیں تو اللہ کو کہنا چاہیے تھا کہ یہ رسولؐ ہیں، رسولؐ کی بیٹی ہیں، رسولؐ کے داماد ہیں اور رسولؐ کے نواسے ہیں۔

بس یاد رکھیے ایک بات میرے ذہن میں آگئی جس کو میں آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں کہتا ہوں ایک مصلحت تو وہ تھی کہ جس کو میں نے آپ کی خدمت میں عرض کر دیا۔ دوسری اس سے زبردست مصلحت یہ تھی کہ اللہ چاہتا تھا کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بات کو ختم کر دے، جھگڑے کو مٹا دے۔ جب جبرئیل نے سوال کیا کہ پالنے والے! اہل بیتؑ کون ہیں؟ تو اللہ نے ارشاد فرمایا فاطمہؑ اور فاطمہؑ کے والد، فاطمہؑ اور فاطمہؑ کے شوہر، فاطمہؑ اور فاطمہؑ کے بچے۔ تاکہ دنیا سمجھ لے کہ اہلِ بیتؑ ایک TECHNICAL TERM ہے، تاکہ دنیا سمجھ لے کہ اہل بیتؑ ایک اصطلاح ہے۔ جب اہل بیتؑ کی لفظ بولی جائے گی تو رسولؐ کے رشتہ دار مراد نہ ہوں گے بلکہ فاطمہؑ کے رشتہ دار مراد ہوں گے۔ (صلوٰۃ) اللہ رشتہ داریاں فاطمہؑ سے بتا رہا ہے، رسولؐ سے نہیں بتا رہا ہے۔

بس برادرانِ عزیز! میں بہت سی باتیں آپ کے سامنے بیان کرنا نہیں چاہتا، مختصر یہ کہ اگر کسی کو RESEARCH کا شوق ہے تو وہ اپنی تاریخوں میں خود دیکھ لے، مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔ مجھے تو بس اتنا

کہنا ہے کہ جب تک رسولؐ زندہ تھے، فاطمہ زہراؑ کی زندگی آرام سے گزری اور جب رسولؐ دنیا سے رخصت ہو گئے تو کیا ہوا، کیوں ہوا، کیسے ہوا؟ وہ مجھے بیان نہیں کرنا ہے۔ وہ تو اس تاریخ اسلام کا ایک تاریک ترین باب ہے، جسے دیکھنا ہو وہ خود دیکھ لے۔ مجھے بس اتنا کہنا ہے کہ جب رسولؐ دنیا سے رخصت ہو گئے تو فاطمہ زہراؑ کے دل پر کچھ ایسی گزری کہ زبان پر مرثیہ آیا کہ ؎

صُبَّتْ عَلَیَّ مَصَائِبٌ لَوْ اَنَّھَا

صُبَّتْ علی الْاَیَّامِ صِرْنَ لَیَالِیَا

بابا! آپ کے بعد مجھ پر اتنی مصیبتیں پڑیں جو مصیبتیں اگر دنوں پر پڑتیں تو دن تاریک ہو جاتے اور اگر پہاڑوں پر پڑتی تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتے زخمی بھی ہو گئیں، کمزور بھی ہو گئیں، بیماری کی شدت بھی ہو گئی۔ یہ سارے تفصیلات، اسے اگر دیکھنا چاہیں تو تاریخ میں آپ ملاحظہ فرمائیں۔ اس مجلس کا تقاضہ نہیں ہے کہ میں ان تفصیلات کو عرض کروں۔ ہاں مجھے تو آخری منزل تک پہنچنا ہے جلد سے جلد۔

آخر وہ منزل بھی آ گئی کہ ایک روز علیؑ ابن ابی طالب گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ فاطمہؑ زہرا بہت سے کام ایک ساتھ انجام دے رہی ہیں۔ بچوں کے نہلانے کا بھی انتظام کر رہی ہیں، کپڑے بھی دھو رہی ہیں اور کھانا بھی تیار کر رہی ہیں۔ کہا رسولؐ کی بیٹی! میں نے آپ کی زندگی میں جو دیکھا ہمیشہ وہ یہ کہ آپ نے ہمیشہ ایک وقت

میں ایک کام کیا، یہ آپ اتنے کام ایک ساتھ کیوں انجام دے رہی ہیں؟ تو فاطمہ زہراؑ نے کہا کہ یا علیؑ! کل میں نے خواب میں اپنے بابا کو دیکھا تھا اور میرا بابا مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اے فاطمہؑ! تم گھبراؤ نہیں، تمھاری مصیبتوں کا دور ختم ہو گیا، کل شام ہونے سے پہلے پہلے تم میرے پاس چلی آؤ گی۔ اے علیؑ! میرا خواب غلط نہیں ہو سکتا۔ آج میری زندگی کا آخری دن ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ مجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں. مجھے معلوم ہے کہ میرا صدمہ آپ برداشت نہ کر سکیں گے۔ مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ میرے رنج و ماتم میں مبتلا ہو کر کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے بچے بھوکے رہ جائیں، ایسا نہ ہو کہ میرے بچے پیاسے رہ جائیں، ایسا نہ ہو کہ میرے بچے میلے رہ جائیں۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ اپنی زندگی میں اپنے سامنے بچوں کو صاف شفاف کر دوں، کپڑے ان کے دھو دوں، کھانا انھیں کھلا دوں۔

میں کہتا ہوں فاطمہ زہراؑ! مبارک ہو مبارک، آپ کی زندگی کا آخری دن ہے تو آپ اپنے بچوں کے لیے کھانے پینے کا انتظام کر سکتی ہیں، اس لیے کہ یہ مدینہ ہے کربلا نہیں ہے۔ مگر میری شاہزادی، میری بی بی! ذرا بتائیے کہ حسینؑ جب رخصتِ آخر کے بعد خیمے سے جا رہے ہیں تو کیسے اپنی سکینہؑ کے لیے پانی کا انتظام کریں؟

کہا بس یا علیؑ! میرے پاس بیٹھ جائیے، موقع غنیمت ہے، میری وصیتیں سن لیجیے۔

عزادارانِ حسینؑ! میں پھر آپ کے سامنے عرض کر دوں کہ میں کوئی روایت برائے روایت مجلس میں نہیں پڑھتا ہوں۔ یا تو کسی معتبر انسان سے سن لیتا ہوں یا کسی کتاب میں دیکھ لیتا ہوں تبھی جسارت کرتا ہوں کہ اسے آپ کی خدمت میں عرض کروں۔ کہا بیٹھ جائیے میرے پاس علیؑ بن ابی طالب فاطمہ زہرؑا کے پہلو میں بیٹھ گئے اور فاطمہ زہرؑا اب بسترِ علالت کے اوپر ہیں۔ کہا یا علیؑ! اب میری وصیتیں سن لیجیے۔ سب سے پہلے اللہ کی وحدانیت، رسولؐ کی رسالت و خاتمیت اور علیؑ کی ولایت و امامت کی شہادت دی اور اس کے بعد شاہزادی نے فرمایا کہ یا علیؑ! میں آپ کے گھر میں اکثر آپ کو آرام نہ پہنچا سکی، آپ کو سکون نہ پہنچا سکی، اگر مجھ سے نادانستگی میں (معاذ اللہ) کوئی غلطی ہو گئی ہو تو اُس رشتے کا لحاظ کر کے جو میرے بابا سے مجھے حاصل ہے، اسے نظر انداز کر دیجیے گا۔ یہ سننا تھا کہ علیؑ کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ کہا فاطمہ زہرؑا تم کیسی باتیں کر رہی ہو، تم نے تو جتنا آرام مجھے پہنچا سکتی تھیں اس سے زیادہ آرام مجھے پہنچایا۔ لیکن ہاں! علیؑ تم سے شرمندہ ہے۔ اس لیے کہ میرے گھر میں آنے کے بعد سوائے چکیاں پیسنے کے تمھیں کوئی آرام نہ مل سکا سوائے فاقوں پر فاقے کرنے کے تمھیں کوئی سکون نہ مل سکا۔ بس یہ کہتے کہتے ایک مرتبہ علیؑ نے باآوازِ بلند گریہ شروع کیا (خدا کی قسم میں نے تاریخ میں دیکھا ہے) تو فاطمہ زہرؑا نے علیؑ سے کہا کہ سنبھالیے اپنے آپ کو یا علیؑ! اپنے کو سنبھالیے، اس لیے کہ آپ کو اسلام کے لیے زندہ رہنا

ہے۔ بس عزادارانِ حسینؑ! اب علیؑ ابن ابی طالبؑ آ گئے مسجد میں اور مصروفِ عبادت ہو گئے اور ادھر فاطمہ زہراؑ نے حضرت اسماء کو بلایا اور کہا کہ اے اسماء! میں نے اپنے بچوں کے لیے کھانے پینے کا انتظام کر دیا ہے۔ بس اب میرا وقتِ آخر قریب آ رہا ہے۔ میں اپنے حجرۂ عبادت میں جا رہی ہوں، اس حجرے سے تھوڑی دیر تک آوازِ عبادت آتی رہی اچانک آواز آنا بند ہو گئی۔ اسماء کہتی ہیں کہ میں دوڑی ہوئی گئی۔ میں نے حجرے کا دروازہ کھولا تو دیکھا کہ رسولؐ کی بیٹی رسولؐ کے پاس جا چکی ہے۔ قریب تھا کہ باآوازِ بلند میں گریہ و زاری کرنے لگوں کہ فوراً فاطمہ زہراؑ کا حکم مجھے یاد آیا کہ مجھے آنسو پی لینا ہے، مجھے بچوں کا انتظار کرنا ہے، شاہزادی فرما گئی ہیں کہ جب بچے آ جائیں تو پہلے انھیں کھانا اور پانی دے دینا اور جب سیر و سیراب ہو جائیں تب انھیں میری وفات کی خبر سنانا۔ جلدی جلدی بہتے ہوئے آنسوؤں کو پوچھا، دروازہ حجرے کا بند کر دیا، باہر تشریف لے آئیں، آکر صحنِ خانہ میں بچوں کے آنے کا انتظار کرنے لگیں۔

تھوڑی دیر کے بعد بچے آئے بھولے بھالے اور آتے ہی حضرتِ اسماء سے سوال کیا کہ اسماء! یہ گھر میں سناٹا کیسا ہے؟ ہماری ماں کہاں ہے؟ جناب اسماء نے جواب دیا کہ شاہزادوں تمھاری ماں مصروفِ عبادت ہیں حجرے میں، یہ کہتے کہتے دستر خوان بچھا دیا۔ فاطمہ زہراؑ نے جو کھانا پکایا تھا وہ رکھ دیا بچوں کے سامنے اور کہا کہ بچوں آپ کھانا کھا

لیجیے، ابھی تھوڑی دیر میں آپ کی مادرِ گرامی تشریف لاتی ہوں گی۔ بس یہ سننا تھا کہ اسماء کہتی ہیں کہ ان دونوں بچوں نے حسرت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا اور کہا کہ اسماء! یہ آج آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں، کبھی آپ نے دیکھا ہے کہ ماں کے بغیر ہم نے کھانا کھایا ہو، جب تک ہماری ماں نہ آجائیں گی ہم اس کھانے میں ہاتھ نہ لگائیں گے۔

عزادارو! بس اب اسماء کو تابِ ضبط نہ رہی۔ آگے بڑھ کر بچوں کو سینے سے لگایا اور کہا کہ میرے بچوں اب اپنی ماں کا انتظار نہ کرو، اس لیے کہ ماں اس دنیا میں چلی گئی جہاں سے کوئی پلٹ کر نہیں آیا کرتا۔

بس عزادارانِ حسینؑ! ایک منزل تک پہنچانا ہے، جلدی جلدی ان منزلوں سے گزر جانا چاہتا ہوں۔ علیؑ ابن ابی طالب نے اپنے ہاتھوں سے غسل دیا، اپنے ہاتھ سے کفن پہنایا جب ایک زخم نظر آگیا تو چیخ مار کر روئے بھی، اب جنازہ تیار ہوگیا۔ مدینہ کا ایک ٹوٹا ہوا گھر (تصور کی نگاہ شرط ہے) اور اس ٹوٹے ہوئے گھر میں ایک چراغ جل رہا ہے اور اس چراغ کی روشنی میں فاطمہ زہراؑ کا جنازہ ایک تختے پر کفنایا ہوا رکھا ہوا ہے۔ اب علیؑ نے چاہا کہ اولادِ فاطمہؑ اپنی ماں سے رخصت ہولے (میں نے اس روایت کو جس انداز سے دیکھا ہے اسی انداز سے پیش کروں گا) سب سے پہلے زینبؑ کو آواز دی کہ میری بچی آ، اپنی ماں سے رخصت ہولے۔ ایک چھوٹی سی بچی آگے بڑھی، آگے بڑھنے کے بعد ماں کے گلے میں باہیں ڈال دیں، چیخ مار کر بچی روئی۔ لیکن علیؑ جیسا

شفیق باپ موجود تھا، تسلّی دے کر بچّی کو ماں کی لاش سے الگ کیا! اس کے بعد ام کلثومؑ کو آواز دی، آکر تو بھی اپنی ماں سے رخصت ہولے۔ وہ بچی بھی آئی اور آکر اپنی ماں سے لپٹ گئی اور پھر علیؑ ابن ابی طالب نے حضرت ام کلثومؑ کو بھی تسلّی دے کر چھڑا لیا اور پھر آواز دی کہ حسنؑ! تم اپنی ماں سے رخصت ہو لو، یہ شاہزادہ آگے بڑھا اور آگے بڑھ کر اپنی ماں کے گلے میں باہیں ڈال دیں، تڑپ کر شاہزادہ رویا مگر علیؑ نے تسلی اور دلاسہ دے کر بچے کو ماں کے جنازے سے چھڑا لیا۔ اس کے بعد کہتے کہ حسینؑ تو بھی آکر اپنی ماں سے رخصت ہولے۔

عزادارانِ حسینؑ! اب میں کیا کروں، زینبؑ آکر گلے سے لپٹ گئیں، ام کلثومؑ آکر گلے سے لپٹ گئیں، حسنؑ گلے سے لپٹ گئے۔ لیکن حسینؑ بڑھے تو حسینؑ سرہانے کی طرف نہیں آئے بلکہ ماں کے پاؤں کی طرف گئے۔ ماں کے قدموں کی طرف گئے اور اپنی آنکھوں کو فاطمہ زہراؑ کے قدموں سے مل مل کر کہنا شروع کیا کہ ماں حسینؑ آگیا، حسینؑ آگیا۔ یہ آج آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ میں روتا تھا تو آپ تڑپ کر اپنے سینے سے لگا لیا کرتی تھیں۔ اے ماں آج آپ کو کیا ہو گیا ہے کہ میں تڑپ رہا ہوں، میں فریاد کر رہا ہوں مگر آپ مجھے اپنے سینے سے نہیں لگاتی ہیں۔ روایت بتاتی ہے کہ بس حسینؑ کا اتنا کہنا غضب ہو گیا۔ ایک مرتبہ جنازہ تھرتھرایا، بندِ کفن ٹوٹ گئے اور فاطمہ زہراؑ کے ہاتھ کفن کے باہر آگئے آ بچے آ، آج بھی میں تجھے سینے سے لگا لینے کے لیے تیار ہوں۔ کیوں

عزادارو، یہ مدینہ ہے جہاں ایک چھوٹا سا بچہ اپنی ماں کے جنازے سے لپٹا ہوا ہے۔ مگر اسی سے ملتا جلتا ایک منظر مجھے ۱۰ محرم کو کربلا کے میدان میں دکھائی دے رہا ہے کہ جہاں ایک چھوٹی سی بچی اپنے بابا کے جنازے سے لپٹی ہوئی ہے مگر یہاں علیؑ موجود ہیں تسلی اور دلاسہ دے کر جنازے سے چھڑا لینے کے لیے۔ اور وہاں ایک مرتبہ شمر قریب آجاتا ہے اور سکینہؑ کے یوں تازیانے لگاتا ہے کہ بچی خاک کے اوپر تڑپنے لگتی ہے۔

بس عزادارانِ حسینؑ! آج محرم کی نویں تاریخ ہے اور میں نے فضائل کا حصہ اسی لیے کم کر دیا کہ آج مصائب کی رات ہے، آج رونے اور رُلانے کی رات ہے، آج محرم کی دسویں شب ہے، نویں تاریخ گزر چکی، یہ بڑی قیامت کی رات ہے، اس رات کو آپ کم نہ سمجھیں۔

عزادارانِ حسینؑ! محرم کا نواں دن ختم ہو گیا کربلا کے میدان میں اور نمازِ مغرب پڑھنے کے بعد حسینؑ خیمے کے در پہ ایک کرسی پر تشریف فرما ہیں، ایک ذرا آنکھ لگ گئی۔ آنکھ لگنا بھی حسینؑ کے اطمینانِ قلب کی دلیل ہے کہ چاروں طرف سے لشکر گھیرے ہوئے ہے مگر حسینؑ کے صبر و سکون میں کوئی فرق نہیں۔ بس آنکھ لگ گئی کہ ایک مرتبہ زینبؑ دوڑتی ہوئی آئیں خیمے کے در پہ اور آکر ایک مرتبہ بھائی کا شانہ ہلایا، کہا بھیّا، بھیّا! آپ سو گئے، دیکھیے لشکر بڑھتا چلا آرہا ہے۔ حسینؑ نے آنکھیں کھولیں دیکھا کہ لشکر حملہ کرنے کے ارادے سے بڑھتا چلا آرہا ہے۔ عباسؑ کو بلایا اور کہا عباسؑ! جاؤ اور جاکر پوچھو ان سے کہ یہ کیوں بڑھتے چلے آرہے

ہیں ؟ اُدھر سے پورا لشکر آرہا تھا، اِدھر سے عباسؑ صرف چند سپاہیوں کو لے کر آگے بڑھے اور آگے بڑھ کر ڈپٹ کر کہا کہ آگے نہ بڑھو اور علیؑ کے شیر کی ہیبت کا عالم یہ تھا کہ ایک آواز پر لشکر بہتے ہوئے سمندر کی طرح رُک گیا جیسے کسی نے دیوار بنا دی ہو اس کے سامنے۔ کہا کہ کیوں بڑھتے چلے آرہے ہو ؟ لشکر کے COMMANDER نے کہا کہ جاکر اپنے بھائی سے کہہ دیجیے کہ یا بیعت کریں یا جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔ عباسؑ فرماتے ہیں کہ خبردار ! جب تک میں پلٹ کر آنہ جاؤں ایک سپاہی اپنی جگہ سے آگے نہ بڑھنے پائے اور آنے کے بعد کہا کہ آقا ! میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کیا کہا گیا، آپ نے خود ہی سماعت فرما لیا ہو گا۔

بس عزاداران حسینؑ ! آپ کو عباسؑ سے بڑی محبت ہے، باب المراد ہیں عباسؑ ! اب ذرا یہ دیکھیے کہ حسینؑ عباسؑ سے کیا کہتے ہیں۔ جب عباسؑ نے فرمایا کہ آقا، ارشاد ہو جو آپ فرمائیں میں ان سے جاکر کہہ دوں۔ تو حسینؑ فرماتے ہیں فِدَاكَ نَفْسِي يَا عَبَّاسُ اے عباسؑ تجھ پر سے میری جان نثار ہو جائے۔ اے عباسؑ تجھ پر سے میں قربان ہو جاؤں۔ اگر ممکن ہو تو ان لوگوں سے ایک رات کی مہلت لے لے۔ تو جانتا ہے کہ مجھے اللہ کی عبادت سے کتنی محبت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ عبادت خدا کو رخصت کر لوں۔

عباسؑ ابن علیؑ آئے اور آکر امامؑ کا پیغام پہنچایا، اختلاف ہوا، لیکن بہر حال طے ہوا کہ ٹھیک ہے، ایک رات کی مہلت ہم دے دیں۔

کے پاس گذریں تو کیا حسینؑ کے دل کی تمنا نہ ہو گی اور اب وہی حسینؑ نانا کے مزار پر آیا ہے مگر اس لیے کہ زندگی کی آخری زیارت کر لے۔ آئے اور آکر قبر کو سینے سے لگا کر رونا شروع کر دیا۔ روئے اور اتنا روئے کہ غش آگیا یا جیسا کہ بعض روایات بتاتی ہیں کہ ہلکی سی آنکھ لگ گئی تو یہ آنکھ لگی نہیں ہے بلکہ یہ ایک طرح کا خواب ہے جو اللہ کی طرف سے حقیقتوں کے اظہار کے لیے طاری کر دیا جاتا ہے۔ آنکھ لگ گئی، دیکھا کہ حضورؐ کھڑے ہوئے ہیں سامنے، کہا کہ اے نانا اب مجھ سے مظالم برداشت نہیں ہوتے ہیں، اپنی قبر میں لے لیجیے۔ رسولؐ نے ارشاد فرمایا کہ نہیں حسینؑ تمھیں کربلا کے میدان میں جانا ہے وہ شرف جو اللہ نے تمھارے لیے معین کر رکھا ہے وہ اس وقت تک نہیں مل سکتا جب تک تم شہادت کو اپنے گلے سے نہیں لگا لیتے۔ اس کے بعد ماں کے مزار پر آئے، وہاں سے رخصت ہے اور اب سفر کی تیاری ہے۔

عزادارانِ حسینؑ! آپ جانتے ہیں کہ حسینؑ سب کو لے کر جا رہے ہیں مگر ایک بیمار بیٹی جس کا نام فاطمہ صغریٰ ہے اس کو بیماری کے سبب سے چھوڑ کر جا رہے تھے۔ یہ چھوٹی سی بچی آٹھ سات برس کا اس کا سن، یہ ماں سے چھوٹ رہی ہے، باپ سے چھوٹ رہی ہے، سارے کنبے سے چھوٹ رہی ہے، اس کے دل کے اوپر کیا گذر رہی ہو گی! فاطمہ صغریٰ برابر خوشامد کر رہی ہیں کہ بابا مجھے بھی لیتے چلیے۔ عزادارانِ حسینؑ! روایت بتاتی ہے کہ جب فاطمہ صغریٰ مایوس ہو گئیں تو کہا ٹھیک ہے میں نہ جاؤں گی بابا آپ کے ساتھ جو آپ کا حکم ہے اس کی تعمیل کروں گی۔ اچھا مجھے رخصت تو ہو لینے دیجیے۔

یہی رات ہے جو حسینؑ کو مہلت مانگنے کے بعد ملی ہے اور امامؑ نے فرمادیا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ عبادتِ خدا کو رخصت کر دوں اور یہ پوری رات حسینؑ اور اصحاب حسینؑ نے یوں گزاری کہ تاریخ کی آواز ہے کہ لَهُمْ دَوِیٌّ كَدَوِيِّ النَّحْلِ پوری رات حسینؑ کے خیموں سے تسبیح و تہلیل کی اور عبادتوں کی آوازیں ایسی آتی رہیں جیسے شہد کی مکھی کے چھتے سے بھنبھناتی ہوئی آوازیں آتی رہیں۔

بس عزادارانِ حسینؑ! ظاہر ہے کہ اس رات کے چند واقعات مجھے آپ کی خدمت میں عرض کرنا ہے اور اس کے بعد شہادت کے کچھ واقعات عرض کرکے آپ کی زحمتوں کو ختم کر دینا ہے۔ یہ پوری رات حسینؑ نے عبادتوں میں گزاری۔ ہاں اسی رات کے بارے میں مجھے ایک روایت یہ ملتی ہے کہ جب تھوڑا حصّہ شب کا گزر گیا تو حسینؑ خیمے کے باہر نکلے، چلے میدانِ کربلا کی طرف اور امامؑ کا ایک نوجوان سپاہی جس کا نام تھا ہلال ابن نافع، اس کی نظر پڑ گئی کہ فاطمہؑ کا لال کربلا کے میدان میں جہاں دشمنوں کا ہجوم ہے تنہا جا رہا ہے۔ اب یہ عجب تذبذب کا شکار ہے۔ امامؑ سے اجازت نہیں لی، ساتھ چل نہیں سکتے۔ دل کی تڑپ کہتی ہے کہ امامؑ کو تنہا نہ جانے دو، تو تھوڑے فاصلے پر امامؑ کے پیچھے پیچھے چلنے لگے مگر حسینؑ نے آواز محسوس کر لی پیروں کی، پلٹ کر دیکھا، کہا کون؟ کہا میں ہوں خادم آپ کا۔ کہا کیوں آ گئے؟ کہا کہ آپ تنہا جا رہے تھے، دشمنوں کا مجمع تھا، میرے دل نے

گوارا نہ کیا کہ رات کی تاریکی میں آپ کو تنہا جانے دوں۔ کہا اچھا ہلال! آگئے ہو تو پھر اب چلے آؤ۔ اب ہلال کی ہمت ہوئی تو آگے بڑھے، ہلال کہتے ہیں کہ امامؑ نے میرے گلے میں یوں باہیں ڈال دیں کہ جیسے دوستو کے گلے میں باہیں ڈالی جاتی ہیں اور کہا ہلال، ہلال! تم جوان ہو، نوجوان ہو، میں بوڑھا ہو چکا ہوں، اپنی جوانی پر ترس کھاؤ۔ دیکھو یہ شب کا سناٹا ہے، تمھارا راستہ کوئی روکنے والا نہیں ہے، چلے جاؤ مجھے چھوڑ کر اپنی جان بچالو، اس لیے کہ تم رہو گے بھی تب بھی میں بچ نہ سکوں گا۔ جیسے ہی امامؑ نے فرمایا ایک مرتبہ ہلال کا جوڑ جوڑ، بند بند کانپنے لگا۔ کہا اے فاطمہؑ کے لال! جنگل کے بھیڑیے مجھے پھاڑ کھائیں اگر میں یہ تصور بھی کروں کہ آپ کو تنہا چھوڑ کر چلا جاؤں۔

بس اب آگے آگے امامؑ اور پیچھے پیچھے ہلال۔ روایت ہے کہ خود حضرت ہلال فرماتے ہیں کہ کربلا کے میدان میں آنے کے بعد فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا اللہ اکبر! امامؑ کہیں سے جھاڑیاں صاف کر رہے ہیں، کہیں سے کانٹے صاف کر رہے ہیں، کہیں پتھروں کو ہٹا رہے ہیں۔ میں نے کہا یہ کیا کر رہے ہیں فرزند رسولؐ! یہ رات کا سناٹا یہ پتھر کیوں ہٹا رہے ہیں، یہ سنگ ریزے کیوں ہٹا رہے ہیں، یہ کانٹے کیوں ہٹا رہے ہیں؟ کہا کہ تم نہیں جانتے مگر میں جانتا ہوں کہ تم میں سے کون کہاں پر گرے گا۔ تو جہاں جہاں پر تم گرنے والے ہو، وہاں وہاں سے پتھر صاف کیے دے رہا ہوں، وہاں وہاں کے کانٹے صاف کیے دے

رہا ہوں، وہاں وہاں کی جھاڑیاں صاف کیے دے رہا ہوں کہ گھوڑوں سے گرو تو کوئی کانٹا تمھارے چبھنے نہ پائے۔ اللہ اکبر! حسینؑ کو اپنے سپاہیوں کا اتنا خیال کہ گھوڑے سے گریں تو کانٹے نہ چُبھنے پائیں اور جب حسینؑ گھوڑے کی بلندی سے زمین پر آئے ہیں تو اتنے تیر لگے ہوئے تھے کہ حسینؑ کا لاشہ زمین و آسمان کے درمیان معلق ہوگیا تھا۔

بس عزادارانِ حسینؑ! اسی شب کا ایک واقعہ اور سن لیجیے اور بس آگے چل کر چند جملے مصائب کے عرض کرکے آپ کی زحمتیں ختم کردوں گا۔ اسی روایت کا یہ واقعہ بھی ہے کہ حضرت ہلال ابن نافع بھی یہ فرماتے ہیں کہ یہ سارے کام انجام دینے کے بعد حسینؑ تشریف لائے اور اس خیمے میں گئے کہ جہاں زینبِ کبریٰؑ کا قیام تھا۔ میں دروازے پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک بھائی اور بہن میں آہستہ آہستہ باتیں ہوتی رہیں۔ میں سمجھ نہ سکا کہ کیا بات ہو رہی ہے۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد ایک مرتبہ حسینؑ کی بہن کی آواز بلند ہوئی کہ بھیّا بھیّا! لشکر اتنا زبردست ہے دشمن کا۔ آپ کے ساتھ کل بہتّر سپاہی ہیں، آپ نے ان بہتّر سپاہیوں کو آزما لیا ہے، کہیں ایسا تو نہ ہوگا کہ جس وقت سخت وقت پڑے تو یہ بھی آپ کا ساتھ چھوڑ دیں۔ بس یہ آواز ہلال کے کان سے ٹکرائی، بجلی بن کر دل پر گری، اٹھے اور اس بڑے خیمے کے سامنے آئے جہاں اصحابِ حسینی بیٹھے ہوئے تلواروں پر صیقل کر رہے تھے یا عبادتوں میں مصروف تھے اور آنے کے بعد دروازے پر بیٹھ کے چیخ مار کر روئے۔

جب رونے کی آواز خیمے کے اندر گئی، حبیب و زہیر دوڑ کر خیمے سے باہر نکلے۔ خیریت تو ہے، کوئی حادثہ ہو گیا؟ کہا کہ اس سے بڑا حادثہ کیا ہو گا کہ زینبِ کبریٰ کو ہماری وفاؤں پر اطمینان نہیں ہے۔ کہا کیا واقعہ ہے؟ پورا واقعہ بیان کیا کہ میں یوں خیمے کے در پر بیٹھا ہوا تھا۔ یوں شاہزادی نے اپنے بھائی سے کہا جس کو میں نے خود سنا، کہ آپ نے اپنے سپاہیوں کو آزما لیا ہے، چھوڑ کر تو نہیں چلے جائیں گے؟ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اس خیمے میں عباسؑ و علی اکبرؑ و قاسمؑ بھی موجود تھے، اٹھے یہ شاہزادے۔ بس جیسے ہی یہ اٹھے حسینؑ کے انصار نے یہ کہا، آپ سے کیا تعلق! آپ تو جگر کے ٹکڑے ہیں، آپ پر اعتبار نہ ہو گا تو کس پر ہو گا۔ ہاں ہم غیر ہیں، ہم پر اعتبار نہیں ہے تو ہم جا کر جیسے بن پڑتا ہے اعتبار دلانے کی کوشش کرتے ہیں۔

چنانچہ آگے آگے سعید، حبیب اور زہیر اور پیچھے پیچھے انصار و اصحاب اس خیمے کے در کے پاس آئے کہ جس خیمے میں زینبؑ کبریٰ کا قیام تھا اور آنے کے بعد کہا کہ شاہزادی یہ غلام حاضر ہیں جس طرح سے کہیے اپنی وفاؤں کا یقین دلا دیں۔ مرتے مر جائیں گے مگر آپ کے بھائی کا دامن نہیں چھوڑیں گے۔

بس عزادارو! یہ سننا تھا کہ زینبؑ خیمے کے در تک آگئیں اور کہا کہ بھائی کے سپاہیوں میرا اسلام قبول کرو اور دیکھو ہماری عزتیں تمہارے ہاتھوں میں ہیں، ہمارے بھائی کی جان کے تم ہی محافظ ہو۔ بس

یہ سننا تھا کہ ایک مرتبہ حسینؑ کے سپاہیوں نے تلواریں نکال نکال کر گردنوں پر رکھیں اور کہا شاہزادی خیمے کے اندر پلٹ جائیے ورنہ اپنے ہاتھ سے اپنی گردنیں کاٹ لیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ بس انصار حسینی بس۔ ارے زینبؑ درِ خیمہ تک آگئی تو تم گردنیں کاٹنے پر تیار ہو گئے ذرا آکر بعدِ عصرِ عاشور دیکھو، یہی زینبؑ میدان کربلا میں نکل رہی ہے، سر سے چادر چھن رہی ہے، خیموں سے دھواں بلند ہو رہا ہے۔

بس عزاداران حسینؑ! کل ایک نوجوان نے مجھ سے ایک فرمائش کر دی اور میں چاہتا ہوں کہ جیسا کہ میں نے ہر فرمائش کا پورا پورا خیال رکھا، میں چاہتا ہوں کہ کراچی کے اس نوجوان کی اس فرمائش کو بھی منزلِ مصائب میں پورا کر دوں اور اسی پر آپ کی زحمتیں ختم کر دینے کا ارادہ ہے۔ عزادارانِ حسینؑ! صبحِ عاشور نمودار ہو گئی۔ حسینؑ کا دفترِ قربانی کھل گیا۔ ایک مجاہد کے بعد دوسرا مجاہد میدانِ کربلا میں جاتا رہا۔ حسینؑ ایک ایک کی لاش اٹھا کے لاتے رہے۔ گنج شہیداں کی تعمیر ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ جب اصحاب شہید ہو گئے، انصار شہید ہو گئے تو پھر بنی ہاشم کی باری آئی۔ کبھی عباسؑ بڑھے شہید ہوئے، کبھی قاسمؑ آگے بڑھے اور شہید ہوئے، کبھی اولاد جعفر آگے بڑھی اور شہید ہوئی کبھی اولادِ عقیل آگے بڑھی اور شہید ہوئی، یہاں تک کہ سب کے آخر میں اٹھارہ برس کا نوجوان علی اکبرؑ اس نے بھی حسینؑ کی نظروں کے سامنے دم توڑ دیا۔ بس اب حسینؑ کا خزانہ خالی ہو چکا تھا۔ ایک مرتبہ

امام نے درِ خیمہ پر آکر آواز دی کہ السّلام علیکِ یا زینبؑ کبریٰ، السّلام علیکِ یا زینبؑ صغریٰ، بڑی بہن زینبؑ تم پر میرا اسلام! اے چھوٹی بہن اُمِ کلثوم، تم پر بھی میرا اسلام۔ اور یہ فرمانے کے بعد امامؑ اتمام حجت کے لیے میدان کربلا میں تشریف لائے اور فرمایا کہ اَمَا مِنْ نَاصِرٍ یَّنْصُرُنَا اَمَا مِنْ مُغِیْثٍ یُّغِیْثُنَا ہے کوئی ہمارا مددگار کہ جو اس عالم بے کسی میں ہماری مدد کرے، ہے کوئی ہماری فریاد سننے والا کہ جو اس عالم مصیبت میں ہماری فریاد سنے۔ ابھی حسینؑ یہ فرما رہے تھے کہ ایک مرتبہ خیمے سے سیدانیوں کے رونے کی آواز آئی۔ حسینؑ پلٹ کر آئے، کہا بیبیوں میں نے کہا تھا کہ میری زندگی میں نہ رونا، تم لوگ کیوں روئے۔ کہا کہ ہم تو اس دردناک خطبے کے بعد بھی اپنے دل کو سنبھالے بیٹھے تھے، لیکن ہم کیا کریں کہ آپ کی آواز سننے کے بعد اس چھ مہینے کے بچے نے اپنے کو جھولے سے گرا دیا۔

بس عزادارانِ حسینؑ! میں شہادتِ علی اصغرؑ پڑھ کر آپ کی زحمتیں ختم کر دوں گا لیکن میں چاہتا ہوں کہ مصائب میں بھی آپ کے لیے ایک لمحۂ فکریہ رہے۔ میں اپنے شاہزادے سے کہنا چاہتا ہوں کہ میرے بے شیر! شبِ عاشور حسینؑ نے فرمادیا تھا کہ آپ کا نام دفترِ شہداء میں شامل ہے اور آپ شہداء میں شامل ہیں تو حسینؑ خود ہی آپ کو لے کر آجاتے کربلا کے میدان میں اور آپ شہید ہو جاتے، یہ آپ نے اپنے کو کیوں جھولے سے گرا دیا، کیوں گرایا! تو میں سمجھتا ہوں

کہ میرا شاہزادہ مجھے جواب دے گا کہ اسلام میں دو چیزیں ہیں، ایک ہے مظلومیت کے عالم میں قتل ہو جانا اور ایک ہے شہید ہو جانا۔ مقتول ہونا دوسری شے ہے اور شہید ہونا دوسری شے ہے۔ میں نے کہا شاہزادے کیا فرق ہے دونوں میں، تو شاہزادے کا جواب ہو گا فرق یہ ہے کہ اگر کوئی انسان بیٹھا ہوا ہے، اس کی کوئی خطا نہیں ہے اس کا کوئی جرم نہیں ہے، کوئی آئے اور آکر اسے خنجر مار دے تو وہ مظلوم ہے، مقتول ہے مگر شہید نہیں ہے۔ شہید وہ ہوتا ہے کہ جو اپنی مرضی سے موت کی طرف بڑھتا ہے۔ تو اگر میرا بابا مجھے آکر اٹھا لے جاتا تو میں مظلوم تو ہوتا مگر مقتول رہ جاتا۔ شہید نہ ہوتا۔ اس لیے اپنے کو گہوارے سے زمین پر گرا دیا کہ بابا آئیے، تمنائے شہادت میرے دل میں کروٹیں لے رہی ہے۔ حسینؑ آئے اور آکر بہن سے کہا کہ لاؤ اور لاکر میرے بچے کو میری گود میں دے دو میں اسے لے کر کربلا کے میدان میں جاتا ہوں۔ پھر میں عرض کر دوں، میں نے روایت میں دیکھا ہے کہ زینبؑ نے اس چھ مہینے کے بچے کو حسینؑ کی گود میں دیا تو رباب آگے بڑھیں کہا مولا، مولا! میرے بچے کو آپ لے جائیے کربلا کے میدان میں لیکن بس دو منٹ کے لیے مجھے دے دیجیے۔ حسینؑ نے بچے کو ماں کی گود میں دے دیا۔ رباب ایک گوشے میں لے گئیں بچے کو، لے جا کر جلدی جلدی پرانا لباس اتار کر نیا لباس پہنا دیا، بالوں میں کنگھی کر دی۔ ماں کی ممتا ہے کہ پہلی مرتبہ میرا بچہ کربلا کے میدان میں جا رہا ہے، بن سنور کر جائے۔

صاف ستھرا ہو کر جائے۔ لا کر ماں نے بچے کو دے دیا حسینؑ کی گود میں اور حسینؑ کربلا کے میدان میں چلے مگر عبا کا سایہ کیے ہوئے۔ اب کسی کو نہیں معلوم کہ حسینؑ کیا لا رہے ہیں۔

پسرِ سعد کے سپاہیوں میں اختلاف ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ حسینؑ تبرکاتِ انبیاء میں سے کوئی شے لا رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ حسینؑ قرآن لا رہے ہیں۔ حسینؑ ایک بلندی پر آئے اور آنے کے بعد جب عبا کا دامن ہٹایا تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ پھول سا بچہ حسین کے ہاتھوں پر پیاس کی شدت سے کروٹیں بدل رہا ہے۔ حسینؑ نے کہا کہ میرے نانا کا کلمہ پڑھنے والو! میں تم سے اپنے لیے سوالِ آب کرنے نہیں آیا ہوں۔ یہ میرا بچہ تین دن سے پیاسا ہے، اگر اس کے حلق میں دو تین قطرے پانی کے ٹپکا دو گے آکر تو اس بہتے ہوئے دریا میں کوئی کمی نہ ہو جائے گی۔ کوئی جواب نہ ملا تو حسینؑ نے کہا اچھا شاید تم یہ سمجھتے ہو کہ تم جب پانی لے کر آؤ گے تو میں تمھارے ہاتھ سے پانی لے کر پینے لگوں گا تو لو، لو میں بات کو ختم کیے دیتا ہوں۔ اللہ رے! حسینؑ کی مظلومی تو دیکھیے۔ ارے وہ تین دن کا پیاسا بچہ، وہ کربلا کی جھلستی ہوئی زمین، مگر حسینؑ نے اپنے بچے کو کربلا کی جھلستی ہوئی زمین پر ڈال دیا اور خود پیچھے ہٹ گئے کہ لو آؤ اور خود اپنے ہاتھ سے آکر اس بچے کو پانی پلا دو۔ روایت بتاتی ہے کہ اس بھوبھل میں بچہ مچھلی کی طرح تڑپنے لگا اور حسینؑ اس منظر کو بھی دیکھتے رہے لیکن کوئی آگے نہ بڑھا

روایت بتاتی ہے کہ جب کوئی آگے نہیں بڑھا تو آگے بڑھ کر حسینؑ نے اپنے بچے کو گود میں اٹھالیا اور کہا کہ میرے لال، میرے لال میں جو کچھ کہہ سکتا تھا میں نے کہہ دیا۔ اب اگر تیرے امکان میں ہو تو تو ہی بتا دے کہ تو کتنا پیاسا ہے۔ روایت آپ سنا کرتے ہیں کہ بس جیسے ہی حسینؑ نے یہ کہا، اس معصوم سے بچے نے دھیرے دھیرے اپنا پھول سا چہرہ لشکر کی طرف موڑا اور سوکھی ہوئی زبان خشک ہونٹوں پر پھرانا شروع کی۔

بس عزادارانِ حسینؑ! خدا کی قسم، اس منبر کی قسم، اس ذکر کی قسم کہ میری زندگی کا ایک تجربہ یہ بھی ہے کہ میں نے اپنی نظروں اپنی نگاہوں سے خود دیکھا کہ جو مسلمان نہیں ہیں، جن کا اسلام سے کچھ تعلق نہیں ہے، وہ ہر ایک کی شہادت کا ذکر سنتے ہیں متاثر ہوتے ہیں، مگر علی اصغرؑ کا ذکر سن کر جو بے چینی، جو تڑپ ان میں پیدا ہوتی ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے۔ عزادارانِ حسینؑ! یہ واقعہ میں نے کراچی کی ایک مجلس میں پڑھا تھا اور کل مجھ سے ایک نوجوان نے کہا کہ اس واقعہ کو آپ پڑھ دیجیے اور اسی نوجوان کی فرمائش پر میں اُسی واقعہ کو آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

تقریباً دس برس ہو گئے ہوں گے اس واقعے کو جب میں لکھنؤ سے ٹرین کے ذریعے ایک دوسرے شہر جا رہا تھا رائے بریلی۔ تھوڑی ہی دور کے اوپر ہے، کوئی پچاس میل کے فاصلے پر ہے۔ تقریباً ایک

گھنٹہ میں ٹرین وہاں پہنچا دیا کرتی ہے۔ میں آکر سوار ہو گیا، تھوڑی ہی دور گاڑی آگے بڑھی تھی کہ دوسرے CABIN سے میرے ایک دوست جو ہندو تھے Mr. SHARMA وہ اس ٹرین سے سفر کرتے ہوئے آرہے تھے، وہ میرے پاس آئے اور آنے کے بعد صاحب سلامت ہوئی اور انھوں نے کہا کہ آپ یہاں اکیلے بیٹھے ہیں، اگر آپ مناسب سمجھیں تو اٹھ کر میرے CABIN میں آجائیں۔ چنانچہ میں اٹھ کر دوسرے CABIN میں چلا گیا۔ وہاں اور بھی کچھ ہندو بیٹھے ہوئے تھے کہنے لگے کہ ہم نے آپ کو اس لیے تکلیف دی کہ ہماری گاڑی لکھنؤ سے پاس ہو رہی تھی تو ان لوگوں سے لکھنؤ کی تہذیب اور یہاں کی ثقافت و تمدن اور CIVILIZATION کا تذکرہ ہوا اور اسی ذیل میں یہاں کی عزاداری کا ذکر ہوا۔ کس طرح سے یہاں عزاداری ہوا کرتی ہے، کس طرح سے یہاں ماتم ہوتا ہے، کس طرح سے یہاں حسینؑ کا غم منایا جاتا ہے۔ تو انھوں نے پوچھا، حسینؑ کون؟ تو ان کے بارے میں مجھے تھوڑا بہت معلوم تھا وہ میں نے ان کو بتا دیا کہ اتنے میں میں نے دیکھا کہ لکھنؤ اسٹیشن سے آپ سوار ہو رہے ہیں، تو ظاہر ہے کہ میں کربلا کے واقعات اتنی DETAIL میں نہیں بتا سکتا جتنی آپ بتا سکتے ہیں۔ لہٰذا میں نے اس لیے آپ کو تکلیف دی ہے کہ آپ ان کے سامنے کربلا کی داستان بتائیں۔ میں نے کہا میرے دوست شرما صاحب! گاڑی کو اسٹیشن سے روانہ ہوئے آدھا گھنٹہ ہو چکا ہے، آدھے گھنٹے میں رائے بریلی

ایک ایک بی بی سے ۔ یہ بچی گلے ملنے لگی رونے لگی یہاں تک کہ آگے بڑھتے بڑھتے اپنی ماں کی خدمت میں آگئی، جناب رباب کی خدمت میں آکر گلے ملی ۔ جب گلے یہ بچی مل رہی تھی تو ایک بچے نے مسکرا کر بہن کو دیکھا اور فاطمہ صغریٰ نے کہا مادرِ گرامی! اچھا آپ جا رہی ہیں لیکن اس بچہ کو میرے سپرد کرتی جائیے، میں گھر کی تنہائیوں میں اُس سے دل بہلاؤں گی اور اس کے بعد یہ کہتے کہتے فاطمہ صغریٰ نے گود پھیلا دی اور ایک بار بچہ ہمک کر بہن کی آغوش میں آگیا اور بس اب فاطمہ صغریٰ نے کہا ٹھیک ہے آپ اس بچے کو بھی لے جائیے مگر کوئی اسے چھین کر میری آغوش سے نہ لے جائے۔ ہر بی بی آگے بڑھے اور جس کی گود میں یہ خوشی سے چلا جائے میں حوالے کرنے کو راضی ہوں ۔

عزادارانِ حسین! روایت بتاتی ہے کہ رباب آگے بڑھیں مگر بچہ گود میں نہ آیا، سکینہؑ آگے بڑھی ننھی سی گود پھیلا دی مگر بچہ گود میں نہ آیا، زینبؑ آگے بڑھیں شہزادہ گود میں نہ آیا یہاں تک کہ یہ منزل آگئی کہ حسین آگے بڑھے اور حسینؑ نے اپنی گود نہیں پھیلائی بلکہ جھک کر کچھ علی اصغرؑ کے کان میں کہا بچہ ہُمک کر بابا کی گود میں آگیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ امامؑ نے کیا فرمایا ہوگا مگر بعد کے واقعہ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ امامؑ نے کہا ہوگا بیٹا اگر تم کربلا میں نہ ہوئے تو میری مظلومیت پر آخری مہر نہ لگ سکے گی ۔ اے میرے لال! اگر تم کربلا میں نہ ہوئے تو میری شہادت پایہ تکمیل تک نہ پہنچے گی ۔ میرے لال! میری گود میں آجاؤ۔ بس عزادارانِ حسینؑ! اب قافلہ روانہ ہو رہا تھا، چند منٹ میں آپ

اسٹیشن آجائے گا میں وہاں اتر جاؤں گا۔ آدھے گھنٹے میں میں کیا بیان کروں۔ کہا کہ نہیں جو کچھ آپ سے ہو سکے آپ بیان کریں۔ میں نے کربلا کی داستان کی BACK GROUND، اس کا پس منظر جلدی جلدی بتایا۔ اس کے بعد وقت چونکہ کم تھا اس لیے میں نے صبحِ عاشور سے داستان کربلا شروع کر دی۔ کیونکر اصحاب نے اپنی قربانیاں پیش کیں، کیونکر حُر کے بیٹے نے جان دی، کیونکر حُر نے جان دی، کیونکر انصار نے اپنی قربانیاں پیش کیں۔ کیونکر عباسؑ نے جنگ کی، علی اکبرؑ کیسے شہید ہوئے، قاسمؑ کا واقعۂ شہادت۔

عزادارانِ حسینؑ! میں ہر ایک کا واقعۂ شہادت بیان کرتا جا رہا تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ وہ ہندو جو کربلا کی داستان سے واقفیت نہیں رکھتے تھے، ان کے چہروں کے اوپر زبردست تاثرات کی پرچھائیاں آرہی تھیں۔ کبھی کبھی ان کی آنکھوں میں آنسو بھی جھلکنے لگتے تھے۔ یہاں تک کہ میں نے کہا کہ جب حسینؑ اپنے اٹھارہ برس کے کڑیل جوان کی لاش بھی لاکر خیمے کے در پر رکھ چکے تو اب خیمے سے ایک چھوٹے سے بچے کو لے کر چلے، وہی واقعہ جو ابھی میں نے آپ کے سامنے پیش کیا اسی کو پیش کرنا شروع کیا کہ عبا کے دامن سے ڈھانکے ہوئے کربلا کے میدان میں لے کر آئے اور آنے کے بعد جب ایک بلندی پر آگئے تو پھر اپنی چادر ہٹائی، اپنی عبا کا دامن ہٹایا تو لوگوں نے دیکھا کہ ایک پھول سا بچہ حسینؑ کے ہاتھوں پر مرجھایا ہوا پیاس کی شدت سے

تو میں نے کہا کہ میرے دوستوں حسینؑ نے اس بچے کو دکھا کر کہا کہ اگر تھوڑا سا پانی اس بچے کو پلا دو گے تو اس بہتے ہوئے دریا میں کوئی کمی نہ ہو جائے گی۔ جب اس کا کوئی جواب نہ ملا تو حسینؑ نے اپنے بچے کو زمین پر ڈال دیا کہ اب آکر اسے پانی پلا دو۔ جب اس پر بھی کسی کو ترس نہ آیا تو حسینؑ نے بچے کو اپنی گود میں پھر اٹھا لیا اور اٹھا کر کہا کہ میرے لال، اگر ہو سکے تو تو خود بتا دے کہ تو کتنا پیاسا ہے۔ میں نے کہا کہ میرے دوستوں! حسینؑ کا یہ کہنا تھا کہ اس بچے نے اپنی چھوٹی سی گردن دھیرے دھیرے لشکر کی طرف موڑی اور سوکھی ہوئی زبان سوکھے ہوئے ہونٹوں پر پھرانا شروع کر دی۔ تو مجھ سے پوچھا کہ مولانا صاحب پھر کیا ہوا؟ تو میں نے کہا کہ پھر یہ ہوا کہ یہ بچہ جب اپنی سوکھی ہوئی زبان اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر پھرا رہا تھا تو سپاہی جو دشمن کے تھے وہ بھی تڑپنے لگے اور وہ بھی بے چین ہونے لگے کہ ہم سے یہ منظر نہیں دیکھا جاتا۔ ہم جا کر اس بچے کو پانی پلائے دیتے ہیں۔ جب یہ حالت ہوئی تو لشکر کا COMMANDER ایک مرتبہ دوڑتا ہوا ایک زبردست تیر انداز کے پاس آیا جس سے بڑا تیر انداز اس لشکر میں کوئی نہ تھا، جس کا نام تھا حُرملہ اور اس کے پاس آنے کے بعد کہا کہ حُرملہ تیری وفاؤں کے امتحان کا یہی وقت ہے، اس بچے نے تو غضب کر دیا، ہمارے لشکر میں بغاوت ہوئی جاتی ہے۔ بس جیسے ہی اس COMMANDER نے یہ کہا حرملہ آگے بڑھا اور آگے بڑھنے کے بعد اپنے دوش سے، کاندھے سے کمان اتاری اور

ترکش سے تین پھل کا تیر لیا اور تین پھل کا تیر لے کر کمان میں جوڑا اور کمان میں جوڑنے کے بعد اس بچّے کی گردن کا نشانہ لیا۔۔۔

میں ذکرِ حسینؑ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ بس میں یہاں تک پہنچا تھا کہ وہ جو ہندو، برتھ کے اوپر بیٹھے ہوئے تھے ٹرین کی، وہ ایک مرتبہ تڑپ کر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ اس کے بعد نہ کہیے گا کہ کیا ہوا؟ اس لیے کہ ہم میں سننے کی طاقت نہیں ہے کہ ایک چھ مہینے کا بچہ پانی کے سوال کے اوپر تیرِ ظلم کا نشانہ بنا دیا جائے۔ میں نے کہا واہ میرے بے شیر واہ! ارے تیری داستانِ ظلم کو ہندو سننے کے لیے تیار نہ ہوں، مگر خدا معلوم کربلا کے میدان میں وہ کیسے مسلمان تھے کہ جنھوں نے تمھیں تیرِ ظلم کا نشانہ بنا دیا۔

بس عزادارانِ حسینؑ! حسینؑ نے علی اصغرؑ کی گردن سے تیر کھینچا، خون کا فوارہ بہنا شروع ہوا، حسینؑ نے چلّو لگا دیا، جب چلّو خون سے بھر گیا تو اپنے چہرے پر مل لیا اور کہا کہ اسی شان سے نانا رسالت مآبؐ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ بچے کی لاش کو حسینؑ نے پھر عبا کے دامن سے ڈھانکا اور لے کر خیمے کی طرف چلے آئے۔ خیمے کے در کے اوپر عزادارانِ حسینؑ، حسینؑ قاسمؑ کی لاش لے آئے لاکر خیمے کے در کے اوپر رکھ دی کوئی بے چینی نہ ہوئی۔ علی اکبرؑ کی لاش لاکر خیمے کے در پر رکھ دی کوئی بے چینی نہ ہوئی۔ لیکن نہ معلوم اس چھ مہینے کے لال میں کیا بات تھی کہ حسینؑ کبھی آگے بڑھتے ہیں کبھی پیچھے

ہٹتے ہیں فرماتے ہیں اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ۔ رِضًا بِقَضَاۗئِہٖ وَتَسۡلِیۡمًا لِاَمۡرِہٖ۔

سات مرتبہ امام آگے بڑھے اور سات مرتبہ پیچھے ہٹے۔ ساتویں مرتبہ آکر آواز دیتے ہیں۔ علّامہ شہرستانی جو عراق کے ایک بہت زبردست عالم ہیں، "نہضۃ الحسینؑ" میں لکھتے ہیں کہ ساتویں مرتبہ آکر حسینؑ نے آواز دی کہ اے رباب! اپنے بچے کو لے جا۔ حسینؑ کی یہ آواز خیمے کے اندر پہنچی تو رباب سے پہلے سکینہؑ دوڑتی ہوئی آگئی، آکر بابا کا دامن پکڑا، بابا، میں تو پہلے ہی سمجھتی تھی کہ علی اصغرؑ زیادہ پیارا ہے۔ آپ نے اسے پانی پلا دیا اور میری پیاس کا لحاظ نہ رکھا۔ بس حسینؑ نے عبا کا دامن ہٹایا تو سکینہؑ غش کھاکر زمین پر گری۔ ماں نے صرف آکر اتنا کہا کہ اَمِثۡلُکَ یُنۡحَرُ کیوں بچے، کیا تیری عمر کے جانور بھی ذبح کیے جاتے ہیں؟ یعنی اس عمر کے تو جانوروں تک کی قربانی نہیں ہوتی۔ ہائے میرے لال! تجھ پر کسی نے رحم نہ کیا۔

دسویں مجلس

اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیطَانِ الرَّجِیمِ، بِسمِ اللّٰهِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ ٥
وَمَن یَّبتَغِ غَیرَ الاِسلَامِ دِینًا فَلَن یُّقبَلَ مِنهُ وَھُوَ فِی الاٰخِرَۃِ مِنَ
الخٰسِرِینَ ٥ (آل عمران آیت ۸۵)

حضرات! چوں کہ ساری مجلسیں میں نے اسی آیۂ کریمہ کو سرنامۂ کلام قرار دے کر آپ کی خدمت میں پیش کی ہیں، اس لیے اس وقت بھی میں نے آپ کے سامنے اسی آیۂ کریمہ کو پیش کیا ہے جس میں ارشاد الٰہی ہو رہا ہے کہ اسلام کو چھوڑ کر اگر کوئی انسان دوسرے دین کو اختیار کرے گا تو وہ دین ہم اس سے قبول نہیں کریں گے اور آخرت کی زندگی میں جب وہ داخل ہو گا تو اس کو خود اس بات کا پتہ چل جائے گا کہ اس نے اسلام کو چھوڑ کر اپنا نقصان کیا تھا۔

آیت آپ کے سامنے میں نے ضرور پڑھی ہے لیکن اس وقت میں کوشش کروں گا کہ کم سے کم وقت لوں، اس لیے کہ یہاں پر نوجوان اور بچے ماتم کرنے کے لیے بے چین ہو رہے ہیں۔ میں نے گذارش کی تھی کہ

مجلس کی اس وقت ضرورت نہیں ہے خالی ماتم ہو جائے۔ بہر حال حکم ہوا کہ اس وقت مجھ کو کچھ پڑھنا ہے تو بس چند جملے آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

برادران عزیز! حسینؑ نے اسلام کے لیے جان دی، حسینؑ نے اپنے گھر کو اسلام کے لیے قربان کر دیا اور اسی لیے ہم حسینؑ کی یادگار کو قائم کرتے ہیں۔ بے شک میں نے ہر تقریر میں آپ کے سامنے پیش کیا ہے کہ حسینی عزاداروں کا فریضہ ہے کہ وہ حسینیت کو اپنائیں، حسینؑ کے اصولوں پر چلیں، حسینؑ نے جن اصولوں کے لیے جان دی انھیں اصولوں کو اپنے سینے سے لگائے رہیں مگر اسی کے ساتھ مجھے یہ بھی کہنا ہے کہ آپ عزائے حسینؑ کی اہمیت کو بھی سمجھیں۔ اس لیے کہ بنی امیہؓ اور بنی عباس کے دورِ استبداد اور دورِ ظلم میں اور ان کے DICTATOR SHIP کے زمانہ میں جب کہ سادات کے خون کا گارا بن رہا تھا، سیکڑوں برس تک دنیا کی حکومتیں ہمارے خلاف رہیں۔ اگر کسی شے نے ہم کو بحیثیت قوم کے بچایا ہے تو یہ بہتے ہوئے آنسو ہیں، یہی مجلسیں ہیں جنھوں نے ہم کو بچایا ہے یہی ذکر حسینؑ ہے جس نے ہم کو بچایا ہے۔

عزادارانِ حسینؑ! قرآن مجید نے شہدا کے لیے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ جو اللہ کی راہ میں اپنی جان دے دیں ان کے بارے میں تم یہ نہ سوچنا کہ وہ مر گئے بلکہ وہ زندہ ہیں۔۔۔

عزیزان گرامی! جب ہر شہید زندہ ہے تو کربلا میں آنے والا شہید نہیں تھا، کربلا میں آنے والا سید الشہداء تھا اس لیے اس کی شہادت کا اثر بھی دوسرا ہوگا۔ بس میں اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہر شہید وہ ہے جو اپنی جگہ پر زندہ ہے اور سید الشہداء وہ ہیں کہ جن کے در سے زندگی بٹا کرتی ہے، جن کے در سے زندگی تقسیم ہوا کرتی ہے، ان کا نام لے لے کر قوموں کو زندگی مل گئی ہے، ان کا نام لے لے کر قوموں کو حیات مل گئی ہے۔ اسی ذکر نے اور اسی غم نے ہم کو بھی زندہ رکھا ہے اور سیکڑوں برس سے زندہ رکھا ہے۔ دنیا چاہ رہی تھی کہ ہمارا نام فنا ہو جائے مگر یہ وہ آنسو ہیں جنھوں نے ہماری زندگی کو حیاتِ جاودانی بخشی اور جنھوں نے ہماری زندگی کو بقا دی۔

آج میں چاہتا ہوں کہ اس موضوع پر آپ کے سامنے صرف اور صرف ACADEMIC طریقہ سے جو میرا طرزِ بیان ہے، آپ کی خدمت میں کچھ باتیں عرض کروں تاکہ آپ کسی غلط پروپیگنڈے کا شکار نہ ہوں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں جن کو خود معلومات نہیں ہے اور جن کا علم محدود ہے وہ کہتے ہیں کہ حسینؑ کی مجلس اور حسینؑ پر ماتم اور حسینؑ کا غم اور حسینؑ پر بہتے ہوئے آنسو یہ سب بدعت ہیں۔ میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ بدعت کیا ہے۔ بدعت وہ شے ہے جس کو دین میں داخل کر دیا گیا ہو۔ جس کو رسولؐ نے دین میں داخل نہ کیا ہو اور اسے آپ دین میں داخل کر دیں تو یہ ہے بدعت۔

اب آئیں اور دیکھیں کہ رسولؐ حسینؑ پر ماتم نہیں کر رہے ہیں، رسولؐ حسینؑ پر گریہ و زاری نہیں کر رہے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ حسینؑ پر گریہ بدعت

قرار پائے لیکن برادرانِ عزیز، آپ ساری شیعہ اور سنّی تاریخوں کو اٹھا کر ملاحظہ فرمائیں، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی جن سے بڑا عالم اہل سنت کا شاید ہندوستان کی سرزمین پر اور کوئی نہ گزرا ہو، وہ تحریر فرماتے ہیں کہ جس وقت حسینؑ ابن علیؑ پیدا ہوئے اور رسولؐ کو خبر ہوئی تو رسولؐ گھر میں تشریف لائے تو بچے کو نانا کی گود میں دے دیا گیا۔ رسولؐ بچے کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے، خوش ہو رہے تھے کہ ازواج نے اور اہل بیتؑ نے اور ماں نے دیکھا کہ ایک مرتبہ رسولؐ کے ہونٹوں سے مسکراہٹ رخصت ہوگئی۔ لوگ گھبرا گئے اور گھبرا کر کہا۔ اے خدا کے رسولؐ! ابھی تو بچہ کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے یہ کیا ہوا کہ آپ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہوگیا۔ کہا کہ میں اپنے بچے کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا کہ جبرئیل آئے اور آنے کے بعد کہا، یہی معصوم بچہ جو آپ کی گود میں مسکرا رہا ہے یہی بچہ ایک دن کربلا کے میدان میں تین دن کا بھوکا پیاسا ذبح کیا جا رہا ہوگا۔ اے خدا کے رسولؐ! آپ کا یہ بچہ بہت مصائب اٹھانے والا ہے، اے خدا کے رسولؐ! آپ کا یہ بچہ بہت مظلوم ہے۔ حضورؐ نے فرمایا، جبرئیل نے مجھ سے داستان کربلا ایسے انداز میں بیان کی کہ میں اپنے آنسوؤں کو روک نہ سکا۔

آپ ابھی روئیں گے، منزل مصائب نظروں کے سامنے ہے، لیکن میں اس منزل پر آپ کے لیے ایک لمحۂ فکریہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ حسینؑ رسولؐ کی گود میں ہیں اور حسینؑ کو دیکھ دیکھ کر رسولؐ رو رہے ہیں۔ میں

دنیا سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ حسینؑ رسولؐ کے ہاتھوں پر زندہ ہیں یا مردہ ہیں؟ ظاہر ہے کہ دنیا کا جواب ہوگا کہ بچہ رسولؐ کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا ہے، بچہ زندہ ہے۔ مگر زندہ بچے کو ہاتھوں میں لے کر رسولؐ آنکھوں سے آنسو بہا بہا کر مسلمانوں کو بتا رہے ہیں کہ زندہ کا ماتم کیا جا سکتا ہے، زندہ پر بھی رویا جا سکتا ہے، زندہ پر آنسو بہائے جا سکتے ہیں۔

برادرانِ عزیز! آپ اس مسئلہ پر بھی غور فرمالیں کہ لوگ کہتے ہیں کہ حسینؑ کی شہادت کے بعد حسینؑ کی مجلس منعقد نہ کرو۔ مگر میں کہتا ہوں کہ حسینؑ کی شہادت کے بعد مجلس حسینؑ کیسے نہ منعقد کریں جب کہ رسولؐ نے حسین کی زندگی میں مجلس حسینؑ منعقد کر دی۔

عزادارانِ حسینؑ! حسینؑ پیدا ہوئے ہیں اور رسولؐ کی آغوش میں ہیں۔ اب جیسا کہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں اور قرین قیاس بھی ہے اور بالکل صحیح بھی ہے کہ اہل بیتؑ بھی موجود ہیں، ازواج بھی موجود ہیں، ظاہر ہے کہ نبیؐ کے گھر میں خوشی ہوئی ہے تو اصحاب کی عورتیں بھی آگئی ہوں گی، باہر مردوں کا ہجوم ہوگا اور اس منزل پر رسولؐ نے داستان مصائبِ حسینی بیان کرنا شروع کر دی۔ میں مسلمانوں سے عشق رسولؐ اور محبت رسولؐ کے ناطے یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ اپنی جگہ پر آپ خود غور کر کے بتائیں کہ اگر رسولؐ آنکھوں سے آنسو بہا بہا کر اور رو رو کر اور گریہ و زاری کر کر کے مصائب حسینی بیان کر رہے ہوں گے تو ازواج نبیؐ اور اہلِ بیتؑ اور صحابہ کرام اور صحابہ کرام کی عورتیں رو رہی ہوں گی یا نہیں؟ ظاہر

ہے کہ فطرت کا تقاضہ یہ ہے کہ رسولؐ کو روتا دیکھ کر ہر ایک رو رہا ہوگا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ پہلی مجلس ہے جو حسینؑ کی ولادت کے ساتھ ہی مدینہ کی سرزمین پر منعقد ہو رہی ہے جس میں سامعین کی جگہ پر، سننے والوں کی جگہ پر صحابہ کرام ہیں اور ان کی عورتیں ہیں، اہل بیتؑ رسولؐ ہیں اور ازواجِ نبیؐ ہیں۔ لیکن میں آپ کی توجہ کو آگے بڑھانا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ یہ پہلی مجلس ہے۔ نہیں، یہ پہلی مجلس نہیں ہے، اس کے پہلے ایک مجلس اور ہو چکی ہے۔ یہ مجلس وہ ہے کہ جس میں رسولؐ پڑھنے والے اور سننے والے ازواجِ نبیؐ اور اہل بیتؑ اور صحابہ کرام کی عورتیں۔ مگر ایک مجلس اس سے پہلے ہو چکی ہے وہ مجلس جس میں مصائبِ حسینؑ بیان کیے جبرئیلؑ نے اور سننے والے رسولؐ۔ اس لیے کہ جب جبرئیل نے بیان کیا تو رسولؐ نے سنا اور تبھی تو ازواج سے بیان کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مجلس سے پہلے ایک مجلس اور ہو چکی ہے جس میں سننے والے تھے رسولؐ اور بیان کرنے والے تھے جبرئیلؑ۔ اور صاحبان فکر یہاں بیٹھے ہوئے ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ اس مجلس سے پہلے بھی ایک مجلس اور ہو چکی ہے جس میں مصائبِ حسینؑ بیان کرنے والا ہوگا خدا اور سننے والے ہوں گے جبرئیلؑ۔ خدا نے جبرئیلؑ سے بیان کیا، جبرئیلؑ نے رسولؐ سے بیان کیا اور رسولؐ نے اہل بیتؑ اور ازواج کے سامنے مصائب حسینؑ بیان کیے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ذکر حسینؑ بدعت نہیں ہے، ذکر حسینؑ سنتِ ازواج بھی ہے، سنت اہل بیت بھی ہے، سنت صحابہ بھی ہے، سنت رسولؐ

کی زحمت ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ اب روانگی کا وقت آرہا تھا، سپیدۂ سحر نمودار ہونے والا تھا کہ ایک مرتبہ حسینؑ نے دیکھا کہ ایک بوڑھی خاتون عصا کا سہارا لیے ہوئے تھرتھراتی ہوئی لڑکھڑاتی ہوئی چلی آرہی ہیں۔ آنکھوں میں آنسو ایک مرتبہ نظر اٹھا کر حسینؑ کو دیکھا کہا میرے لال کہاں جا رہے ہو، عزادارانِ حسینؑ! یہ ام المومنین جناب ام سلمہؓ رسولؐ کی محترم و مقدس بیوی جنھوں نے حسینؑ کو اپنی اولاد کی طرح پالا تھا۔ آئیں اور آنے کے بعد کہا میرے لال کہاں جا رہے ہو؟ حسینؑ نے کہا سفر درپیش ہے بس ایک مرتبہ سفر کا نام سنا، کہا میرے لال سفر پر جا رہے ہو تو ہر طرف جانا مگر عراق نہ جانا۔ اس لیے کہ تمھارے نانا مجھ سے بتا چکے ہیں کہ میرا بچہ عراق کا ایک شہر ہے جس کا نام ہے کربلا وہاں شہید کیا جائے گا بس سب طرف جانا عراق کا رُخ نہ کرنا۔ کہا نانی آپ سمجھتی ہیں کہ مجھے نہیں معلوم ہے کہ میں کہاں جا رہا ہوں، مجھے معلوم ہے کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔

اللہ اکبر، ہماری جانیں اس مظلوم پہ فدا ہو جائیں۔ ذرا عزمِ حسینؑ دیکھیے، ولولۂ حسینؑ دیکھیے، جذبۂ حسینؑ دیکھیے۔ فرماتے ہیں اے نانی! جب آپ نے یہ بات چھیڑی ہے تو سُن لیجیے۔ آپ کو تو صرف ہماری شہادت کی خبر ملی تھی اے نانی یہ آپ ہیں۔ لیکن اے نانی سُن لیجیے کہ علی اکبرؑ کو میں اسی لیے جا رہا ہوں کہ اس کے سینہ پہ برچھی لگے گی۔ عباسؑ کو اس لیے لے کر جا رہا ہوں کہ اسے شہید ہونا ہے۔ یہ قاسمؑ نونہال میرا اسی لیے جا رہا ہے کہ اسے کربلا میں شہید ہونا ہے۔ یہ چند دن کا بچہ میری گود میں اس لیے

بھی ہے، سنتِ جبرئیل بھی ہے اور سنتِ خدا بھی ہے اور یہی امانت آج ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

کل رات سے آپ حسینؑ کا ماتم کر رہے ہیں۔ یہاں ہماری بہنیں ہیں۔ میں آپ سے صحیح عرض کرتا ہوں کہ آپ کی رات بھر کی جاگ سے میں اتنا متاثر نہیں ہوا جتنا ان بیبیوں اور عورتوں کے کردار نے مجھے متاثر کیا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں نے یہ رات جاگ کر گزاری ہے حسینؑ کا ماتم کر کر کے، ابھی یہ بچے ماتم کریں گے آپ کے سامنے، پیارے پیارے معصوم بچے، کھلتے ہوئے پھول، یہی ہمارا چمن ہیں، یہی ہماری کلیاں ہیں۔ اب دیکھیے گا کہ تھوڑی دیر کے بعد ان کے سینے ماتم کرنے سے لال ہو جاتے ہیں، سرخ ہو جاتے ہیں اپنے ہاتھوں سے ماتم کرنے کی وجہ سے اور حسینؑ کے بچوں کے رخسار سرخ ہیں طمانچے کھانے کی وجہ سے۔

بس عزادارانِ حسینؑ! میں پھر آپ سے ایک مرتبہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کو راہِ نجات دکھانے کے لیے حسینؑ نے کس شے کو آپ سے بچایا، حسینؑ نے کاہے کے لیے جان دی؟ کیا دولت کے لیے جان دی، کیا حکومت کے لیے جان دی، کیا تخت کے لیے جان دی، کیا جاہ و منصب کے لیے جان دی؟ کسی شیعہ بچے کو سوتے میں شانہ ہلا کر پوچھیے کہ حسینؑ نے کس لیے جان دی، تو وہ کہے گا کہ نہ دولت کے لیے نہ زر و جواہر کے لیے جان دی نہ تخت و تاج کے لیے جان دی نہ حکومت کے لیے جان دی صرف اسلام کو بچانے کے لیے اور ہم کو راہِ نجات دکھانے کے لیے۔

تو برادرانِ عزیز! آپ کو راہِ نجات دکھانے کے لیے حسینؑ نے کس شے کا دھیان کیا۔ اگر مطالبہ ہوا کہ مدینہ چھوڑ دو حسینؑ نے مدینہ چھوڑ دیا، مطالبہ ہوا کہ مکہ چھوڑ دو حسینؑ نے مکہ چھوڑ دیا، مطالبہ ہوا کربلا آجاؤ حسینؑ کربلا میں آگئے۔ کہا پانی چھوڑ دو، چھوڑ دیا، کہا کہ غذا چھوڑ دو، چھوڑ دی اور اس کے بعد صبح عاشور سے حسینؑ سے مطالبہ شروع ہوا حُرؓ کے بیٹے کو دے دو، حسینؑ نے کہا لے جاؤ۔ حُر کو دے دو، حسینؑ نے کہا لے جاؤ میں کریم ابنِ کریم ہوں۔ حبیبؓ کو دے دو، لے جاؤ۔ جونؓ چاہیے ہے، لے جاؤ۔ مسلمؓ ابن عوسجہ چاہیے ہے، لے جاؤ۔ پسرِ مسلم چاہیے ہے، لے جاؤ۔ اب جب انصار و اصحاب ختم ہو گئے تو زمانہ کا تقاضہ ہوا کہ دنیا کو راہِ نجات نہیں مل سکتی، اسلام کے اصول نہیں بچ سکتے جب تک عباسؑ کا خون بھی اس میں شامل نہ ہو جائے۔ حسینؑ نے کہا دل چاہتا ہو تو میرے بھائیؑ کو بھی لے جاؤ، میرے بیٹے علی اکبرؑ کو بھی لے جاؤ، میرے بھتیجے قاسمؑ کو بھی لے جاؤ، میرے بھانجوں عونؑ و محمدؑ کو بھی لے جاؤ اور اب بھی کسی شے کی تمنا ہے تو آؤ میری گود میں ایک چھ مہینے کا بچہ بھی مسکرا مسکرا کر خون اُگل رہا ہے۔ اگر تمھیں اس خون کی تمنا ہے تو اسے بھی تم لے جاؤ اور اس کے بعد مزید تمنا ہے تو آؤ، حسینؑ نے آخری خطبہ کے بعد شعر پڑھا تھا جیسا کہ روایت میں ہے

ان کان دین محمد لا یستقم
اِلاَّ بِقتلِی یَاسیوفُ خُذِ ینِی

جب کہ یہ بات طے ہو گئی ہے کہ عباسؑ کا شباب دے دینے کے بعد بھی، علی اکبرؑ کی جان دے دینے کے بعد، اصغرؑ کی مسکراہٹ کے بعد بھی میرے نانا کا دین قیام قیامت تک باقی نہیں رہ سکتا جب تک میرا خون بھی اس کی رگوں میں دوڑنے نہ لگے تو یہ تلواریں کا ہے کا انتظار کر رہی ہیں، آئیں آگے بڑھیں، میرے جسم کے ٹکڑے اڑا دیں اور حسینؑ نے کہا آؤ میرا خون لے لو۔ نیزو! آگے بڑھو جتنا خون لے سکتے ہو لے لو۔ تیرو! آگے بڑھو جتنا خون تم کو چاہیے لے لو۔ تو اب سب کچھ نثار کر دیا حسینؑ نے۔ حسینؑ کریم ابنِ کریم ہیں۔ اگر حسینؑ سخی اور کریم ابن کریم ہیں تو حسینؑ جن کو لے کر آئے ہیں وہ بھی سخی ہیں۔ اب حسینؑ کی منزل ختم ہو گئی تو زینبؑ سخاوت کا دریا بہانے کے لیے آگے بڑھیں۔ اے اسلام اگر تجھے سر کی چادر چاہیے تو لے جا۔ سکینہؑ آگے بڑھیں اے اسلام اگر تجھ کو کان کے گوشوارے چاہیے تو لے جا۔

میں اس مجلس میں جو تقریباً عصر عاشور کے وقت ہو رہی ہے آپ سے یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ ایک بات آپ مجھے بتا دیں۔ حسینؑ نے آپ سے کوئی شے بچائی، حسینؑ نے آپ سے کس شے کا سیان کیا، جو شے چاہیے تھی آپ کی نجات کے لیے وہ سب کچھ دے دی۔ اب حسینؑ کے پاس کچھ نہیں رہ گیا، جو حسینؑ کی کائنات تھی وہ سب لٹا دی اور سب کچھ لٹانے کے بعد آپ سے صرف ایک بات کا مطالبہ کیا ہے اور وہ مطالبہ

یہ کیا ہے کہ میرے ذکر کو قائم رکھنا، میری یاد کو قائم رکھنا، میرے غم میں آنسو بہاتے رہنا، ٹھنڈا پانی پینا تو مجھ کو یاد کر لینا۔ کوئی لاش نظروں کے سامنے آجائے تو میری لاش کا تصور کر لینا، کوئی گھر اُجڑ رہا ہو تو میرے جلتے خیموں کی آگ کو نظروں کے سامنے لے آنا، اس میں خود میری مرضی کا دخل نہیں ہے۔ یہی خیموں سے نکلتے ہوئے آگ کے دھویں کا تصور، یہی میری لاش کا تصور، یہی میری پیاس کا تصور تم کو دین سے وابستہ رکھے گا، شریعت سے وابستہ رکھے گا، اسلام سے وابستہ رکھے گا، جنت کی منزل تک پہنچا دے گا۔

بس برادرانِ عزیز! اب مجھے آپ کی محبت اور آپ کی عزت اور آپ کی الفت کا امتحان لینا ہے۔ یہ امام حسینؑ کا عزاخانہ ہے۔ اگر آپ یہ مجلس خلوص سے منعقد کر رہے ہیں۔ میں اس جملہ کو نہیں کہنا چاہتا تھا کہ جب مجھے یہ تصور ہو جاتا ہے تو میری زبان لڑکھڑانے لگتی ہے میں پڑھتے پڑھتے بھولنے لگتا ہوں، جب مجھے یہ تصور ہو جاتا ہے کہ میرے سامنے یہ مومنین ہی نہیں بیٹھے ہوئے ہیں بلکہ ایک خاتون بھی بیٹھی ہوئی ہیں بس میری زبان کو لکنت ہونے لگتی ہے۔ خدا شاہد ہے کہ جب مجھ کو یہ تصوّر آتا ہے کہ یہاں رسولؐ بھی بیٹھے ہوئے ہیں اور جب مجھے یہ تصور آتا ہے کہ یہاں علیؑ بھی بیٹھے ہوئے ہیں، جب مجھے یہ تصور آجاتا ہے کہ ہماری اس گناہ گاروں سے بھری ہوئی بزم میں یہ معصومینؑ بھی آگئے ہیں، یہ اہلِ بیتؑ طیبین و طاہرینؑ بھی آگئے ہیں تو میرا دل دھڑکنے

لگتا ہے، مجھے بیان کرنے میں دشواریاں محسوس ہونے لگتی ہیں۔ اس لیے کہ مجھے اپنی جہالت اور اپنی بے سوادی، اپنے گناہوں، اپنی خطاؤں اور اپنی سیاہ کاریوں کی فہرست میرے سامنے آنا شروع ہو جاتی ہے اور میں شرم سے پسینے پسینے ہونے لگتا ہوں کہ یہ معصوم چہرے اور یہ معصوم نگاہیں اور اس کے سامنے یہ میرا انجس چہرہ اور میں منبر پر بیٹھا ہوا ہوں۔ لیکن اہلِ بیت شاہد ہیں کہ اس منبر پر آتا ہوں تو صرف اس لیے آتا ہوں کہ ممکن ہے کہ میری زبان سے نکلا ہوا کوئی جملہ بی بی کے بچے کی یاد میں میرے لیے بھی حشر میں شفیع بن جائے، میرے گناہوں کی بخشش کا سہارا بن جائے۔

بس میں آپ سے اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کیا چاہتے ہیں. آپ یہ چاہتے ہیں کہ عزائے حسینؑ باقی رہے یا آپ یہ چاہتے ہیں کہ عزائے حسینؑ مٹ جائے۔ ابھی میرے عزیز دوست محترم جناب حسن رضا صاحب ارشاد فرما رہے تھے کہ دس سال پہلے جب مجلس منعقد ہوئی تھی تو دس آدمی کُل یہاں پر تھے اور آج کا مجمع آپ دیکھیں۔ اس منبر پہ بیٹھ کر جو پیش گوئی لندن میں کی تھی، جو پیش گوئی میں نے نیویارک میں کی تھی، وہی پیش گوئی میں یہاں کرتا ہوں کہ اللہ نے ہر جگہ میری پیش گوئی کو صحیح ثابت کیا اور مجھے امید ہے کہ یہاں بھی میری پیش گوئی صحیح ثابت ہوگی۔ آپ یاد رکھیے کہ کچھ ہی عرصہ کے بعد یہ امام بارگاہ آپ کے لیے چھوٹا ہو جائے گا، یہ ہال آپ کے لیے چھوٹا ہو جائے گا۔ آپ کو اس میں EXPAMTION

کرنا پڑے گا، ممکن ہے کہ دوسری منزل بھی بنانا پڑے۔ یہ بالکل طے شدہ بات ہے، اس پر آپ یقین کرلیں۔

یہ میری بات نہیں ہے بلکہ مجھے خالقِ کائنات کے اس وعدہ پر اعتبار ہے جو ایک دکھیاری ماں سے کیا گیا تھا کہ دنیا کی ہر چیز مٹ جائے گی مگر میں غمِ حسینؑ کو بچاؤں گا، میں غم حسینؑ کو مٹنے نہ دوں گا۔ مجھ میں کیا طاقت ہے، میں کس گنتی میں شمار ہوں، میری کیا حیثیت ہے۔ مگر وہ وعدہ جو ایک خاتون سے، ایک دل جلی ماں سے، جس نے اپنے بچے کی خبرِ شہادت سن کر اس وقت کسی شے کا سوال نہیں کیا اور کہا اے بابا! یہ میرا بچہ قتل ہوگا تو آپ ہوں گے اس وقت؟ رسولؐ نے کہا نہیں بیٹی، میں اس وقت نہیں ہوں گا۔ کہا علیؑ ہوں گے، کہا علیؑ بھی نہیں ہوں گے۔ کہا اس کا بھائی حسنؑ ہوگا، کہا حسنؑ بھی نہیں ہوں گے۔ کہا کہ میں ہوں گی، کہا بیٹی تم بھی نہیں ہوگی۔ تو فاطمہؑ نے تڑپ کر ایک سوال کیا کہ اے بابا! اتنا بتا دیجیے، جب کوئی نہ ہوگا تو میرے بچے پر ماتم کون کرے گا، کیا میرے بچے کی صفِ عزا بچھانے والا کوئی نہ ہوگا۔ رسولؐ نے ارشاد فرمایا، میری بیٹی تو اطمینان رکھ، اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ وقتاً فوقتاً ایسے افراد کو پیدا کرتا رہے گا جو تیرے بچہ کی صفِ عزا کو بچھاتے رہیں گے۔

عزادارانِ حسینؑ! ابھی مجھ ایسے گناہ گار نے، مجھ ایسے خطا کار نے مجھ ایسے سیاہ کار نے جو نماز پڑھانے کی کسی حیثیت سے صلاحیت نہیں رکھتا، آپ کو نماز پڑھائی۔ نماز ظہر آپ نے پڑھی اور نماز ظہر میں نے بھی

پڑھی لیکن میں نے اور آپ نے بہت ہی راحت و آرام سے نماز پڑھی۔ آپ راحت و اطمینان کے ساتھ نماز پڑھ رہے اور میں بھی راحت و آرام کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا۔ لیکن تصور کیجیے کربلا کے میدان میں حسینؑ نے نماز ظہر کیوں کر ادا کی۔

عزادارانِ حسینؑ! اللہ اکبر، اللہ اکبر، انصاف کی بات ہے وہ جنگِ صفین کا منظر کہ جہاں علیؑ ابن ابی طالب فرماتے ہیں ابن عباس سے جنگ روک دو، میرے لیے مصلّیٰ بچھا دو میں نماز پڑھوں گا تو ابن عباسؓ کہتے ہیں یا علیؑ! یہ نماز کا وقت نہیں ہے۔ ابن عباس بہت عظیم المرتبت ساتھی ہیں علیؑ ابن ابی طالب کے۔ لیکن آپ ملاحظہ فرمائیں کہ ابن عباس وہاں کہہ رہے ہیں کہ یہ نماز کا وقت نہیں ہے۔ جنگ ہو رہی ہے اور علیؑ کو یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ اسی نماز کے لیے تو ہم جنگ کر رہے ہیں۔ مگر کربلا کے میدان میں حسینؑ کے سپاہی کا کردار آپ دیکھیں، جنگ صفین سے بہت سخت تھی جنگ کربلا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ حسینؑ کے سپاہیوں کی ایک نظر تھی دشمن کے اوپر اور دوسری نظر تھی امامؑ کے اوپر اور تیسری نظر تھی گردش کرتے ہوئے آفتاب کے اوپر۔ اسی لیے آفتاب جیسے ہی نقطۂ اعتدال سے گزرا ویسے ہی ابو ثمامہ صیداوی نے کہا فرزندِ رسولؐ! مرنا تو ہے، جان تو آپ کے ساتھ دینا ہے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ آخری مرتبہ آپ کے پیچھے نماز پڑھنے کا شرف اور حاصل کر لیں تو آپ کے نانا کی خدمت میں حاضر ہوں۔

بس عزادارانِ حسینؑ! دو منٹ میں آپ کی زحمت کو ختم کر رہا ہوں۔

حسینؑ نے کہا، اچھا ان سے کہو کہ جنگ روک دیں۔ حسینؑ کا ایک سپاہی آگے بڑھا اور آگے بڑھنے کے بعد کہا، کیوں پسر سعدؔ! کیا تمام تعلیمات اسلامی بھول گیا؟ کہا کیوں، کیا کہنا چاہتے ہو۔ کہا دیکھتا نہیں کہ نماز کا وقت آگیا ہے، جنگ روک دے، تو بھی نماز پڑھ لے اور ہم بھی نماز پڑھ لیں۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ نماز پڑھنے کی مہلت نہ دی گئی حسینؑ کو تو حسینؑ نے دکھا دیا کہ ہماری نماز تمھاری اجازت کی محتاج نہیں ہے۔ ہم تو دنیا کو دکھانا چاہتے تھے کہ تم نماز کے لیے بھی جنگ روکنے کے لیے تیار نہیں ہو۔ تو یہی سہی۔ تیر چلتے رہیں اور نماز ہو، تلواریں برستی رہیں اور نماز ہو، نیزے چلتے رہیں اور نماز ہو۔ جب حسینؑ نے دیکھا کہ نماز کی اجازت نہیں ملتی تو آپ نے حضرت زہیر بن قین اور حضرت سعید بن عبد اللہ سے فرمایا کہ تم میرے سامنے کھڑے ہو جاؤ تاکہ میں خالق کی نماز ادا کر لوں۔

عزاداران حسینؑ! میں اس منزل پر آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں کہ حسینؑ کے ہر صحابی کے دل میں تمنا تھی کہ حسینؑ کے پیچھے نماز پڑھ لیں مگر اللہ رے اطاعتِ امام کی حد۔ کہ اگر سعیدؓ و زہیرؓ سے امامؑ نے فرمایا تھا کہ تم میرے سامنے کھڑے ہو جاؤ تو ان دونوں نے عذر نہ کیا یہ دونوں امامؑ کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ امامؑ کے سامنے ہیں سعید و زہیر اور سعید و زہیر کے پیچھے ہیں امامؑ اور امامؑ کے پیچھے ہے بچے ہوئے سپاہیوں کی صف۔ میں کہتا ہوں سعید و زہیر، تم کو تمھارا مرتبہ مبارک وہ اصحاب حسینی کی منزل ہے کہ جن کو حسینؑ نماز پڑھا رہے ہے اور یہ تمھاری منزل ہے

کہ تم حسینؑ کو نماز پڑھا رہے ہو۔

عزادارانِ حسینؑ! میں نے روایت میں دیکھا ہے خاص طور پر حضرت سعید بن عبداللہؑ کے لیے۔ آپ کو معلوم ہے کہ نماز ہو رہی تھی تیر چل رہے تھے، نیزے چل رہے تھے، تلواریں چل رہی تھیں۔ تاریخ نے جو منظر کشی کی ہے حضرت سعید کی وہ یہ کہ حضرت سعید کا یہ عالم تھا برستے ہوئے تیروں کو اپنے سینے پر روک رہے تھے۔ اگر کوئی تیر بچ کر نکل جاتا تھا تو ہاتھ پر روکتے تھے اور کوئی تیر اونچا ہو کر جاتا تھا تو چہرے پر روکتے تھے۔ حسینؑ کی طرف آنے والے سارے تیروں کو سعید اپنے جسم پر روک رہے تھے۔

عزادارانِ حسینؑ! ذرا انصاف سے بتانا، حسینؑ کا وہ تین دن کا بھوکا پیاسا سپاہی کتنے تیر برداشت کر سکتا تھا تو میں سمجھتا ہوں کہ سعید کی روح کو بہت پہلے جسم کو چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ واقعیت ہوتی لیکن میں سمجھتا ہوں، میرا تصور ساتھ دے رہا ہے کہ ہر مرتبہ اپنی روح کو خطاب کر کے سعید کہتے ہوں گے جو جسم کو چھوڑنے کی تیاری کر رہی ہوگی کہ اے میری روح! میرے جسم کو چھوڑنا نہیں اس لیے کہ تو نے سنا نہیں کہ میرے مولا نے کیا کہا ہے؟ میرے مولا نے کہا ہے کہ جب تک میری نماز ختم نہ ہو جائے تم میرے سامنے کھڑے رہنا تو حکمِ امامؑ کی اطاعت میں میرے جسم کو چھوڑنا نہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جیسے ہی حسینؑ نے کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ویسے ہی سعید نے کہا السلام علیک

یا اَبا عبداللہ! بس فرزند رسولؐ! آپ کی نماز تمام ہوگئی، میرا فریضہ پورا ہوگیا۔ حسین آگے بڑھے اور آگے بڑھنے کے بعد آپ سجدۂ شکر بجالاتے ہیں سجدہ گاہ کے اوپر۔ مگر سعید کا مرتبہ یہ تھا کہ حسینؑ کا سجدۂ شکر اس سجدہ گاہ پر ہو رہا تھا کہ جو سعید کے رخسار نے بنائی تھی، منھ پر منھ حسینؑ کا رکھا ہوا ہے، سعید نے غش سے آنکھ کھولی۔ بس عزاداران حسینؑ! آخری جملہ، آخری منزل آنکھ کھولنے کے بعد کہا، اللہ رے امامؑ کی منزل، ایک مرتبہ کہا کیوں فرزند رسولؐ! آپ مجھ سے خوش ہو گئے، فرزند رسولؐ! آپ مجھ سے راضی ہو گئے، فرزند رسولؐ! میں نے حق وفا ادا کر دیا؟ حسینؑ نے کہا ہاں، خوب تم نے حق وفا ادا کیا سعید، مگر تم جنت میں مجھ سے پہلے جارہے ہو، تم میری طرف سے نانا کو سلام کہہ دینا اور کہنا کہ نانا اب وہ وقت آگیا ہے کہ نماز تک پڑھنے کی مہلت نہیں ملتی۔

عزاداران حسینؑ! یہ نماز ظہر تھی جو حسینؑ نے اس شان سے ادا کی اور کربلا کے میدان کی وہ آخری نماز! عزاداران حسینؑ! نماز ظہر حسینؑ نے کسی صورت سے پایۂ تکمیل تک پہنچا دی، مگر وہ آخری نماز تھی کہ حسینؑ نے اپنی پیشانی اپنی مرضی سے سجدہ میں رکھی تو لیکن دوبارہ اٹھانا نصیب نہ ہوئی بلکہ سجدہ ہی میں سر حسین کٹا، نوک نیزہ پر بلند ہوا، فتح کے باجے بجنے لگے، آواز بلند ہوئی اَلَا قُتِلَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَا اَلَا ذُبِحَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَا۔

مسکرا رہا ہے کہ کربلا کے میدان میں اسے اسلام کے لیے اپنی قربانی پیش کرنا ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ اے نانی میں جانتا ہوں کہ یہ قافلہ اس لیے جا رہا ہے کہ کربلا کے میدان میں اُجڑ جائے گا۔ یہ حسین و جمیل چاند کے ٹکڑے، کربلا میں ان کی لاشیں بکھری پڑی ہوں گی۔ نانی یہ سارے مناظر میرے پیش نظر ہیں اور بس اب حسینؑ نے چاہا کہ اپنا اختیار دکھا دیں، ہاں ایک مرتبہ اُمِّ سلمہ نے کہا بیٹا! میں نے اس زمین کے بڑے فضائل سنے ہیں کہا تو کیا زیارت کرنا چاہتی ہیں۔ آپ نے کہا لیکن اے بیٹا زیارت کیسے کروں گی۔ کہا میں ابھی زیارت کراتا ہوں آپ کو۔ میرے پاس آئیے۔

بس عزادارانِ حسینؑ! ایک جملہ اور، آپ کی زحمت ختم۔ کہا نانی ذرا میرے قریب آئیے، قریب آئیں کہا ذرا ادھر سامنے کی طرف نظر اٹھا کر دیکھیے، نانی نے نظر اٹھائی حسینؑ کا ہاتھ اُٹھا۔ وہ علیؑ کے ہاتھ کی قوت تھی کہ آفتاب پلٹا دیا یہ علیؑ کے لال کی قوت تھی کہ اُنگلی سے اشارہ کیا زمین کے سارے طبقے پست ہو گئے اور زمین کربلا ابھر کر سامنے آ گئی۔ اب حسینؑ نے اشارہ کیا اے نانی دیکھیے وہ فرات چمکتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے آپ کو! اسی کے کنارے میرے بھائی کے ہاتھ کٹیں گے۔ اے نانی وہ جگہ جو آپ کو دکھائی دے رہی ہے یہیں علی اکبرؑ کے نیزہ لگے گا۔ اے نانی وہ جگہ جو دکھائی دے رہی ہے نا آپ کو، یہی وہ جگہ ہے جہاں قاسمؑ کے زندہ جسم کے اوپر گھوڑے دوڑ رہے ہوں گے۔ اے نانی یہ جو بلندی آپ کو دکھائی دے رہی ہے یہ وہ جگہ ہے جہاں چھ مہینے کا بچہ میری گود میں خون اُگل رہا ہو گا۔ اے نانی وہ

گیارھویں مجلس

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ہ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ہ وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ وَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ہ (سورہ آل عمران آیت ۸۵)

برادران عزیز! ارشاد ہو رہا ہے قرآن پاک میں کہ اسلام کے علاوہ اگر کوئی بھی انسان کوئی دوسرا دین اختیار کرے گا تو وہ دین ہم اس سے قبول نہیں کریں گے اور ایسا انسان جب آخرت کی حقیقی زندگی میں داخل ہو گا تو اسے خود اس بات کا پتہ چل جائے گا کہ اس نے اسلام کو چھوڑ کر خود اپنا ہی نقصان کیا تھا۔

سوال یہ ہے کہ اسلام ہی پر ہم کیوں چلیں؟ اور اسلام ہی ہماری نجات کا ضامن کیوں ہے؟ تو اصل میں اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کہتے ہیں اپنے کو مرضیٔ الٰہی کے سپرد کر دینے کو۔ یعنی ہم نہ کچھ سوچیں نہ کچھ زبان پر لائیں نہ کوئی کام انجام دیں مشیت الٰہی کے خلاف۔ اللہ نے جو لائن کھینچ دی ہے، اللہ نے جو نظام بنا دیا ہے، اسی نظام پر گامزن ہونے کا نام

ہے اسلام۔

برادرانِ عزیز! آپ ملاحظہ فرمالیں آج دنیا کی آبادی چار ارب سے زیادہ ہوچکی ہے۔ مگر جتنی انسان کی آبادی ہے اس سے کئی گنا زیادہ سیّارے اور ستارے آسمان کی بلندیوں پر پائے جاتے ہیں۔ مگر اللہ نے ہر سیّارے کے لیے ہر ستارے کے لیے ایک لائن کھینچ دی ہے، ایک خط معیّن کردیا ہے، ایک ORBIT بنادیا ہے، ایک مدار بنادیا ہے۔ خود اپنے SOLAR SYSTEM پر آپ نظر کرلیں، ہر سیّارے کا ہر PLANET کا ایک مدار ہے، ایک ORBIT ہے۔ لاکھوں اور کروڑوں برس سے ہر سیّارہ اور ہر ستارہ ایک مدار کے اوپر گردش کررہا ہے اور اس نے آج تک سرِ مو اس سے فرق نہیں کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کائنات میں اربوں سیّارے پائے جاتے ہیں، اربوں ستارے پائے جاتے ہیں، نہ معلوم کتنی GALAXIES پائی جاتی ہیں، نہ معلوم کتنے SOLAR SYSTEM پائے جاتے ہیں، مگر نہ کوئی سیّارہ سیّارے سے ٹکراتا ہے نہ کوئی ستارہ ستارے سے ٹکراتا ہے، اس میں ٹکراؤ اس لیے نہیں ہوتا کہ یہ اللہ کے بنائے ہوئے راستے پر چل رہے ہیں۔

تو ارشادِ الٰہی ہے کہ جس طرح سے کائنات کی ہر شے ہمارے بنائے ہوئے راستے پر چلتی ہے تو اس میں ٹکراؤ پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر تم ہمارے بنائے ہوئے راستے پر چلوگے تو یہ آپس کا ٹکراؤ ختم ہوجائے گا، آپس کا فساد ختم ہوجائے گا، آپس کے جھگڑے مٹ جائیں گے۔ اس لیے کہ ہمارے یہاں کے نظام کا اصول ہی یہ ہے کہ جو ہمارے راستے پر چلتا

ہے تو اس کا اختلاف ختم ہو جاتا ہے، اس کا ٹکراؤ ختم ہو جاتا ہے۔

برادرانِ عزیز! آپ غور فرمائیں، دنیا میں بڑے بڑے PHILOSOPHER گزرے ہیں، بڑے بڑے THINKERS گزرے ہیں اور مفکر گزرے ہیں جنھوں نے آپ کی زندگی کے لیے مختلف نظام ہائے حیات اور مختلف نظریات پیش کیے ہیں۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ ایک کچھ کہتا ہے ایک کچھ کہتا ہے، ایک زمین کی کہتا ہے ایک آسمان کی کہتا ہے۔ مگر اللہ نے اپنی طرف سے اپنے نظام کی تبلیغ کے لیے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے اور بارہ امامؑ بھیجے۔ جو آدمؑ نے کہا وہی نوحؑ نے کہا، جو نوحؑ نے کہا وہی ابراہیمؑ نے کہا وہی موسیٰؑ نے کہا، جو موسیٰؑ نے کہا وہی عیسیٰؑ نے کہا، جو عیسیٰؑ نے کہا وہی محمدِ عربیؐ نے کہا۔ (صلوٰۃ) جو محمدِ عربیؐ نے فرمایا وہی علیؑ مرتضیٰ نے فرمایا، جو علیِؑ مرتضیٰ نے فرمایا وہی ہر امام کہتا رہا۔ ہزاروں برس کے دور میں، لاکھوں پیغمبر معصوم اور امام آئے اور ان میں سے کبھی کسی کی بات نہ ٹکرائی۔ تو ان میں سے کسی کی بات کا نہ ٹکرانا اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ یہ حقیقت کی شہادت دے رہے تھے اور دنیا کے دوسرے ذہین مفکرین اور THINKERS اور صاحبانِ فکر کا آپس میں ٹکراتے رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ قیاس سے کام لے رہے تھے، حقیقت ان کی نظروں کے سامنے نہیں تھی تو اسی لیے ارشادِ الٰہی ہوتا ہے کہ اگر تم اللہ کے بنائے ہوئے راستے پر چلو گے تو کبھی ٹکراؤ گے نہیں۔ دیکھو آدمؑ آئیں گے اور چلے جائیں گے، نوحؑ آئیں گے، چلے جائیں گے، ابراہیمؑ آئیں گے اور چلے جائیں گے، موسیٰ

اور عیسیٰ آئیں گے اور چلے جائیں گے۔ ہزاروں پیغمبر آئیں گے اور چلے جائیں گے مگر کبھی کسی کی بات، کسی کی بات سے ٹکرائے گی نہیں جو ایک کہے گا وہی دوسرا کہے گا۔ جو دوسرا کہے گا وہی تیسرا کہے گا، جو ایک کرے گا وہی دوسرا کرے گا جو دوسرا کرے گا وہی تیسرا کرے گا۔

یہ اتنی سی بات میں نے آپ کی خدمت میں برادرانِ عزیز اس لیے پیش کی کہ ایک مرتبہ پھر میں آپ کی خدمت میں عرض کر دوں کہ معصومینؑ کی سیرت میں کبھی فرق نہیں پیدا ہوتا۔ جو آدمؑ نے کہا اور کیا وہی ہر پیغمبر کرتا اور کہتا رہا، نہ کسی کی سیرت بدلی نہ کسی کا قول بدلا اور خود ائمہ طاہرین میں ہمارے چھٹے امام جعفرِ صادق صلوٰۃ اللہ و سلامہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ جب تم تک ہم میں سے کسی کی بات پہنچے اور تمھیں یہ یاد نہ رہے کہ یہ بات کس نے کہی ہے تو جس کی طرف چاہنا منسوب کر دینا، اس لیے کہ یہاں ذاتیں بدلتی ہیں مگر زبانیں نہیں بدلا کرتیں، یہاں نام بدلتے ہیں مگر سیرتیں نہیں بدلا کرتیں۔

تو برادرانِ عزیز! جب یہ طے ہو گیا کہ معصومینؑ چاہے لاکھوں ہوں چاہے بارہ ہوں، ان سب کی سیرتیں ایک رہتی ہیں، ان سب کا طور ایک رہتا ہے، ان سب کا طریقہ ایک رہتا ہے۔ تو اب بعض ناسمجھ انسانوں کا یہ کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا کہ حسینؑ نے کربلا کے میدان میں بے جا ضد سے کام لیا۔ حسینؑ کو چاہیے تھا کہ معاذ اللہ یزیدؔ لعین کی بیعت کر لیتے، کربلا کے میدان میں حسینؑ یزیدؔ لعین کی حکومت کو تسلیم کر لیتے اور اپنے سر کو اس کی

نظروں کے سامنے جھکا دیتے۔

میں عرض کرتا ہوں کہ حسینؑ کربلا کے میدان میں تنہا نہیں تھے۔ ابھی آپ نے زیارتِ وارثہ پڑھی ہے اور اس زیارت میں آپ نے کیا کہہ کر حسینؑ کو سلام کیا؟ آپ نے حسینؑ کو سلام کیا یہ کہہ کے کہ اے آدمؑ کے وارث تجھ پر سلام۔ اے نوحؑ کے وارث، تجھ پر سلام۔ اے ابراہیمؑ کے وارث تجھ پر سلام۔ اے موسیٰؑ کے وارث تجھ پر سلام۔ اے عیسیٰؑ کے وارث تجھ پر سلام۔ اے محمدِؐ عربی کے وارث تجھ پر سلام۔ اے علیؑ مرتضیٰ کے وارث تجھ پر سلام۔ تو ایک سلسلہ ہے وراثت کا یہ، جو آدم سے لے کر علیؑ بن ابی طالب تک چلا آرہا ہے۔ اس سلسلۂ وراثت میں کہیں آپ مجھے یہ دکھا دیں کہ کسی نمائندۂ حق نے کبھی کسی نمائندۂ باطل کے آگے سر جھکایا ہو یا اس کی بیعت کی ہو تو حسینؑ سے بھی یہ مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ یزیدؑ کی بیعت کر لیں اور اگر کبھی نمائندگانِ حق میں سے کوئی باطل کی بیعت کرنے پر تیار نہ تھا تو پھر حسینؑ کربلا کے میدان میں کیسے یزید کی بیعت کر لیتے۔ اس لیے کہ حسینؑ جانتے تھے کہ کربلا کے میدان میں میرا ہاتھ اکیلا نہیں ہے، اس کے اوپر علیؑ کا ہاتھ ہے، علیؑ کے ہاتھ پر محمدؐ کا ہاتھ ہے، محمدؐ کے ہاتھ پر عیسیٰؑ کا ہاتھ ہے، عیسیٰؑ کے ہاتھ پر موسیٰؑ کا ہاتھ ہے، موسیٰؑ کے ہاتھ پر ابراہیمؑ کا ہاتھ ہے، ابراہیمؑ کے ہاتھ پر نوحؑ کا ہاتھ ہے اور نوحؑ کے ہاتھ پر آدمؑ کا ہاتھ ہے۔ اور اُدھر یزیدؑ کا ہاتھ بھی تنہا نہیں ہے، یزیدؑ کے ہاتھ پر معاویہ کا ہاتھ ہے، معاویہ کے ہاتھ پر ابوسفیان کا ہاتھ ہے، ابوسفیان کے

ہاتھ پر فرعون کا ہاتھ ہے، فرعون کے ہاتھ پر نمرود کا ہاتھ ہے، نمرود کے ہاتھ پر شدّاد کا ہاتھ ہے، شدّاد کے ہاتھ پر شیطان کا ہاتھ ہے۔

حسینؑ سمجھتے تھے کہ اگر آج میں نے اپنا یہ ہاتھ یزید کے ہاتھ میں دے دیا تو یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے علیؑ بن ابی طالب نے معاویہ کی بیعت کرلی، جس طرح محمد عربی نے ابولہب اور ابوجہل کی بیعتیں کرلیں، جس طرح موسیٰؑ نے فرعون کی بیعت کرلی، جس طرح عیسیٰؑ نے یہودیوں کی بیعت کرلی، جس طرح ابراہیمؑ نے نمرود کی بیعت کرلی اور جس طرح سے خدا نے شکست قبول کرلی شیطان کے مقابلے میں۔ تو حسینؑ اپنی منزل کو جانتے تھے اور اپنے مراتب کو پہچانتے تھے۔ تو حسینؑ نے کہا کہ میرا سر کٹ تو سکتا ہے مگر میرا سر باطل کے مقابلے میں جھک نہیں سکتا ہے۔

ایک اور حقیقت کی طرف اس مجلسِ شامِ غریباں میں صاحبانِ فکر کو متوجہ کر دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ حقیقت ہے کہ جس وقت اسلام کا پیغام بڑھتے بڑھتے حضورؐ ختمی مرتبتؐ، خاتم المرسلینؐ، رحمۃٌ للعالمینؐ تک پہنچا اور حضورؐ نے حجاز کی سرزمین پر یہ آواز بلند کی کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہو اور نجات پا جاؤ۔ پوری تاریخ کو سمیٹ کر میں آپ کے سامنے عرض کر رہا ہوں، صاحبانِ فکر توجہ فرمائیں گے، تو حضورؐ کا مقابلہ جن لوگوں سے ہوا ان پر تین طرح کے REACTIONS ہوئے، تین طرح کے ردِّ عمل ہوئے۔

ایک تو اس STEEL اور فولاد کے مانند تھے جو محمدؐ عربی کی قوت کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے، ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گئے مگر انھوں نے جھکنا

گوارا نہ کیا اور دوسرے وہ جو نرم لوہے کی حیثیت رکھتے تھے جو اسلام کے سانچے میں MOULD ہوتے چلے گئے، اس میں سے کوئی سلمانؓ بن گیا کوئی ابوذرؓ بن گیا کوئی مقدادؓ بن گیا کوئی عمارؓ یاسر بن گیا۔ (صلوٰۃ) اور ایک تیسرا طبقہ وہ تھا کہ جو نہ STEEL اور فولاد کی طرح سے مقابلہ کر رہا تھا نہ نرم لوہے کی طرح سے اسلام کے سانچے میں ڈھلتا چلا جا رہا تھا بلکہ یہ تیسرا طبقہ وہ تھا، یہ اس لوہے کی حیثیت رکھتا تھا کہ جس میں SPRING کی کیفیت ہوا کرتی ہے کہ جب تک رسالت کا دباؤ رہا یہ دبا رہا مگر دب کر یہ رسالت کے دباؤ کے ہٹنے کا انتظار کر رہا تھا۔ جیسے ہی رسالت کا دباؤ ہٹا، دھیرے دھیرے یہ پلٹ کر اپنی منزل پر آنے لگا۔ یہی SPRING رکھنے والا کردار، یہی SPRING رکھنے والا CHARACTER وہ تھا جو کربلا کے میدان میں حسینؑ کے سامنے آ گیا تھا۔ حسینؑ اپنی منزل کو سمجھ رہے تھے، حسینؑ جان رہے تھے کہ میرے نانا رسولؐ کا جہاد بہت مشکل تھا مگر میرے مقابلے میں پھر بھی آسان تھا اس لیے کہ کفر لباسِ کفر میں تھا اس لیے اس سے مقابلہ آسان تھا۔ اور کربلا کے میدان میں میرے سامنے جو لشکر آیا ہے وہ لشکر نفاق کا ہے۔ یہاں کفر لباس کفر میں نہیں ہے بلکہ کفر کے چہرے پر اسلام کی نقاب پڑی ہوئی ہے تو چونکہ باطل نے اپنی STRETGY بدل دی تھی، اپنے انداز کو بدل دیا تھا اس لیے وارثِ حق حسینؑ نے بھی اپنے انداز کو بدل دیا۔ رسولؐ دوسروں کو قتل کر کر کے فتح حاصل کر رہے تھے اور حسینؑ نے قتل ہو کر فتح حاصل کرنے کے راستے کو اپنایا۔ گویا رسولؐ

اپنی تلوار سے دشمنوں کی گردن کاٹ رہے تھے اور حسینؑ کربلا کے میدان میں آئے کہ میں اپنے خون کی دھار سے دشمن کے خنجر کی دھار کو کاٹ دوں۔ حسینؑ سمجھتے تھے کہ میرا مقابلہ کربلا کے میدان میں یزید سے نہیں ہے بلکہ میرا مقابلہ یزیدیت سے ہے۔ اگر یزیدؔ سے مقابلہ ہوتا تو شاید حسینؑ بھی طاقت کا مقابلہ طاقت سے کرتے۔ لیکن چونکہ یزیدیت سے مقابلہ ہو رہا تھا اس لیے حسینؑ نے اپنے خط کو بدل دیا، اپنی لائن کو بدل دیا اور ایک ایسے انداز سے جہاد کیا کہ تاریخِ بشر میں اور تاریخِ انسانیت میں کسی سپہ سالار نے اس انداز سے جہاد نہیں کیا جس انداز میں کربلا کے میدان میں میرے مولا حسینؑ نے جہاد کیا۔ اس لیے کہ حسینؑ سے پہلے اور حسینؑ کے بعد جب بھی کوئی سپہ سالار آیا میدان میں تو ہمیشہ طاقت اس نے بڑھانے کی کوشش کی۔ مگر حسینؑ یوں چلے کربلا کے میدان میں کہ جو آبھی گئے تھے حسینؑ کے ساتھ، ان کو قدم قدم پر اپنی شہادت کی خبر سنا سنا کر ہٹاتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ کربلاؔ کے میدان میں جب حسینؑ چاروں طرف سے دشمنوں میں گھر گئے تو اس وقت حسینؑ کے ساتھ کل بہتر ۷۲ سپاہی تھے۔

دوسری طرف لشکرِ یزیدی کی تعداد کم سے کم تیس ۳۰ ہزار تھی۔ لیکن میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کربلا کی جنگ کی اہمیت یہی تھی کہ یہ خصوصیت کسی اور جنگ کو حاصل نہیں۔ نہ کسی نبی کی جنگ کو حاصل ہے نہ کسی رسول کی جنگ کو حاصل ہے، یہاں تک کہ خود حضورؐ کی جنگیں بہت

خصوصیت رکھتی ہیں۔ مگر وہ اہمیت جو کربلا کی جنگ کو حاصل ہے نہ اُحد کو حاصل ہے نہ خندق کو حاصل ہے نہ خیبر کو حاصل ہے نہ حُنین کو حاصل ہے، نہ امیر المومنین کی لڑائیوں جمل کو حاصل ہے نہ صفین کو حاصل ہے نہ نہروان کو۔ اور وہ خصوصیت یہ ہے کہ رسولؐ ہوں یا علیؑ جو بھی آیا میدانِ جنگ میں وہ اپنے ساتھ سپاہیوں کو لے کر آیا۔ مگر حسینؑ کربلا کے میدان میں اپنے ساتھ بہتر سپاہیوں کو لے کر نہیں آئے تھے، اپنے ساتھ بہتر حسینؑ لے کے آئے تھے۔ حسینؑ کا ہر سپاہی میدان کربلا میں اپنی جگہ پر حسینؑ بنا ہوا تھا۔ آپ اپنی جگہ کے اوپر یہ نہ سوچیں کہ میں نے مجلسِ شامِ غریباں میں بڑی جسارت سے کام لیا کہ معصوم کو غیر معصوم سے ملا دیا۔ نہیں میرے پاس اگر مثال نہ ہوتی تو میں اتنی بڑی جسارت نہ کرتا۔

اگر ایک آئینہ خانہ ہو، اگر ایک شیش محل ہو، اگر ایک ایسا روم یا کمرہ ہو کہ جس میں چاروں طرف آئینے ہی آئینے لگے ہوئے ہوں شیشے ہی شیشے لگے ہوں۔ اگر آپ اس کے اندر بیچ میں ایک شمع روشن کر دیں تو شمع ایک روشن ہوگی مگر ہر چھوٹے بڑے آئینے میں وہی لو آپ کو دمکتی ہوئی دکھائی دے گی۔ تو کربلا کا میدان بھی روحانیت کا وہ آئینہ خانہ تھا کہ جہاں بیچ میں ایک حسینیت کی شمع جل رہی تھی اور جس چہرے میں بھی آپ نے دیکھا وہی لو چمکتی ہوئی دکھائی دی۔ آپ نے حبیب کے چہرے کو دیکھا تو حسینؑ دکھائی دے رہے تھے، زہیر کے چہرے کو دیکھا

توحسینؑ دکھائی دے رہے تھے۔ مسلم کے چہرے کو دیکھا توحسینؑ دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ آئینہ چھوٹا ہو یا بڑا لو ویسے ہی چمکتی دکھائی دی۔ قاسمؑ کے چہرے کو دیکھا تب بھی حسینؑ ہی دکھائی دے رہے تھے۔ عبداللہ بن حسنؑ کے چہرے کو دیکھا تب بھی حسینؑ ہی دکھائی دے رہے تھے اور علی اصغرؑ نے تیر کھا کر مسکرا کر بتا دیا کہ میرے سینے میں میرے بابا ہی کا دل دھڑک رہا ہے۔

بہر حال یہ تھے وہ انصارِ حسینؑ کہ جن کو لے کر حسینؑ کربلا کے میدان میں آگئے اور صبح عاشور جیسے کہ آج کی مجلس میں میں آپ کے سامنے عرض کر چکا ہوں کہ امامؑ نے علی اکبرؑ سے فرمایا کہ بیٹا تم آگے بڑھ کر اذان دو اور علی اکبرؑ نے لہجۂ نبوی میں اور لہجۂ پیغمبری میں اذان دی۔ اور اس منزل پر بس مصائب پیش کرنے سے پہلے یہ بات میں آپ کے سامنے اور عرض کر دوں کہ کربلا کی جنگ کی یہ خصوصیت میں آپ کے سامنے پیش کر چکا کہ کربلا سے پہلے کوئی سپہ سالار چاہے مذہبی ہو چاہے غیر مذہبی، ایسے چیدہ افراد کو لے کر نہیں آیا جیسے چیدہ افراد کو حسینؑ لے کر آگئے۔ یہ ایک خصوصیت تھی اور دوسری خصوصیت کربلا کی جنگ کو، وہ جو نہ بدر کو حاصل ہے نہ احد کو حاصل ہے نہ خیبر کو حاصل ہے نہ حنین کو حاصل ہے وہ یہ، میں کسی جنگ کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا مگر تاریخ بشر میں کربلا سے پہلے اور کربلا کے بعد کوئی جنگ ایسی نہیں بتا سکتے ہیں کہ جس کی ابتدا اذان سے ہوئی ہو اور جس کا خاتمہ سجدے کے اوپر ہوا ہو۔

جو نشیب وہ پست زمین آپ کو دکھائی دے رہی ہے یہ وہی زمین ہے جہاں سجدہ میں میرا سر ہو گا، شمر کا خنجر ہو گا اور تھوڑی دیر بعد اَلَا قُتِلَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَا کی صدا گونجے گی۔

بس ایک جملہ اور سن لیجیے عزاداران حسین! میری سمجھ میں نہیں آتا یہ ہماری زیارت کا طریقہ کیا ہے؟ ابھی یہاں نماز جماعت ہوئی تھی، نماز جماعت کے بعد میں نے زیارت پڑھائی تھی اور آپ حضرات نے زیارت پڑھی تھی۔ مجلس کے خاتمہ کے بعد بھی آپ زیارت پڑھیں گے۔ تو زیارت آپ کیسے پڑھتے ہیں؟ آپ جب نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو کعبہ کی طرف آپ کا رُخ ہوتا ہے مگر کعبہ کی طرف آپ انگلی سے اشارہ نہیں کرتے۔ خالی چہرہ ہمارا کعبہ کی طرف ہوتا ہے اور نیت ہم کر لیتے ہیں، نماز شروع ہو جاتی ہے۔ زیارت بھی یوں ہی پڑھ سکتے تھے کہ کربلا کا رُخ کر لیتے، کربلا کی طرف ہمارا چہرہ ہو جاتا زیارت ہم پڑھنا شروع کر دیتے۔ مگر نہیں معصومؑ نے فرمایا ہے کہ تم جب نماز پڑھو تو تمھارا چہرہ کعبہ کی طرف ہونا چاہیے اور زیارت پڑھو تو انگلی سے اشارہ بھی کرو روضہ کی طرف۔ تو میں سوچا کرتا تھا کہ اس کی تہ میں کیا بات ہے؟ ارے یہ حسینؑ کی پیروی ہے اس لیے کہ حسینؑ نے اپنی زندگی میں جب علی اکبرؑ کی قتل گاہ کی زیارت کرائی، عباسؑ کے مقتل کی زیارت کرائی اور اپنی قتل گاہ کی زیارت کرائی تو انگلی سے اشارہ کر رہے ہیں نانی دیکھیے وہ جگہ ہے جہاں عباسؑ کے شانے کٹیں گے وہ جگہ وہ جگہ ہے کہ جہاں علی اکبرؑ کے نیزہ لگے گا۔ نانی وہ جگہ وہ ہے جہاں میری گود

بس یہ کربلا کی جنگ تھی کہ جس کی ابتدا ہو رہی ہے اذانِ علی اکبرؑ سے اور جس کا خاتمہ ہو رہا ہو سجدۂ حسینی پر اور سجدے اور اذان کے درمیان میں پوری کربلا کی جنگ لڑی جا رہی ہے۔

عزادارانِ حسینؑ! علی اکبرؑ نے اذان دی اور نمازیوں نے خاکِ کربلا پر تیمم کر کر کے نمازِ صبح کو ادا کیا اور اس کے بعد حسینؑ نے اپنے چھوٹے سے لشکر کی صف بندی کی اور تھوڑی دیر کے بعد جنگ شروع ہو گئی۔ تفصیلات میں مجھے جانا نہیں ہے، حسینؑ کا دفترِ قربانی کھل گیا، ایک کے بعد دوسرا مجاہد کربلا کے میدان میں جاتا رہا اپنی شہادت پیش کرتا رہا۔ حسینؑ ایک ایک کی لاش اٹھا اٹھا کر لاتے رہے اور گنجِ شہیداں کی تعمیر ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ انصار شہید ہو گئے، اصحاب شہید ہو گئے تو اب جگر کے ٹکڑوں کی باری آئی۔ کبھی اولادِ جعفرؑ آگے بڑھی، کبھی اولادِ عقیل آگے بڑھی، کبھی قاسمؑ آگے بڑھے اور حسینؑ نوشاہ قاسمؑ کے لاشے کے ٹکڑے اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے لائے اور لا کر خیمے کے سامنے قاسمؑ کی لاش بھی رکھ دی۔ اس کے بعد علی اکبرؑ آگے بڑھے اور یہ بچہ بھی حسینؑ کا شہید ہوا اور حسینؑ نے اس بچے کی لاش بھی کسی نہ کسی طرح سے لا کر درِ خیمہ پر رکھ دی اب دنیا سمجھ رہی تھی کہ حسینؑ کا خزانہ خالی ہو گیا مگر حسینؑ نے ڈھونڈ لیا رباب کی گود میں ایک اور گوہر آبدار کو اور اس بچے کو بھی لے کر میدانِ قربانی میں آئے اور اس بچے کی بھی قربانی بارگاہ الٰہی میں پیش کر دی۔

عزادارانِ حسینؑ! ہر ایک کی لاش کو حسینؑ نے لاکر خیمے کے در پر رکھا مگر میں نے نہیں دیکھا کہ کسی لاش کو حسینؑ نے کربلا کے میدان میں دفن کیا ہو۔ لیکن بس یہ چھ مہینے کا بچہ وہ تھا کہ ماں کو دیدار کرانے کے بعد، سکینہ کو دیدار کرانے کے بعد، زینبؑ کو صورت دکھانے کے بعد، حسینؑ خیموں کی پشت پر گئے اور ذوالفقار سے علی اصغرؑ کی قبر کھودنا شروع کر دی۔ قبر کھُد گئی، گڈھا تیار ہو گیا، اپنے بچے کو حسینؑ نے قبر کے اندر رکھا اور جیسا کہ اس منزل پر کسی شاعر نے کہا ہے حسینؑ کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے، میں سمجھتا ہوں کہ بالکل صحیح کہا ہے کہ حسینؑ نے علی اصغرؑ کو قبر میں رکھنے کے بعد جیسے یہ ارشاد فرمایا ؎

قبر میں اصغرؑ کو رکھ کے رو کے فرماتے تھے شاہ
یہ تو آغوشِ لحد میں اور پیارا ہو گیا

عزادارانِ حسینؑ! آپ جانتے ہیں اسلام کا دستور ہے، اسلام کا حکم ہے کہ جب ہم میّت کو قبر میں لٹاتے ہیں تو کچھ ایسی صورت کر دیتے ہیں کہ میت کے جسم کے اوپر مٹی نہ گرنے پائے مگر کربلا کے میدان میں یہ انتظام کہاں ممکن تھا! حسینؑ نے اپنے چاند کو آغوشِ لحد میں رکھا اور اس کے بعد کربلا کی جلتی ہوئی بھوبھل اسی انداز سے اس بچے کی لاش کے اوپر ڈالنا شروع کر دی یہاں تک کہ اس بچے کی قبر تیار ہوئی تو روایت بتاتی ہے کہ حسینؑ قبر سے لپٹ گئے اور لپٹنے کے بعد چیخ مار کر رونا شروع کیا۔

عزادارانِ حسینؑ! آپ میں سے کوئی انسان ایسا نہ ہوگا کہ جو کسی نہ کسی کے دفن میں شریک نہ ہوا ہو، مگر ہوتا یہی ہے کہ اگر کوئی چاہنے والا اپنے کسی عزیز کی قبر سے لپٹ جاتا ہے تو چاہنے والے آگے بڑھ کر اس کا بازو تھام کر قبر سے اٹھا لیا کرتے ہیں۔ آگے بڑھیے اور آگے بڑھ کر اپنے امام کو بچے کی قبر پر سے اٹھا لیجیے۔ مگر کربلا کے میدان میں سنّاٹا ہے۔ کون ہے کہ جو بڑھ کر حسینؑ کو بچے کی قبر پر سے اٹھائے۔ مگر روایت بتاتی ہے کہ ایک مرتبہ فلک سے آواز آئی کہ دَعْهُ یَا حُسَیْنُ فَاِنَّ لَهٗ مُرْضِعَةٌ فِی الْجَنَّةِ اے میرے حسینؑ! بس اب بچے کی قبر چھوڑ دیجیے، اس لیے کہ ہم نے جنّت میں اس کے لیے ایک پالنے والی کا انتظام کر رکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ پالنے والی سوائے فاطمہ زہراؑ کے اور کون ہو سکتی ہے؟

حسینؑ نے بچے کی قبر چھوڑ دی اس کے بعد درِ خیمہ پر آئے اور آنے کے بعد آواز دی کہ السَّلام علیکِ یا زینب الکبریٰؑ، السَّلام علیک یا زینب الصغریٰؑ۔ بڑی بہن زینبؑ تم پر میرا سلام، چھوٹی بہن ام کلثوم تم پر میرا سلام۔ میرے سینے پر سونے والی سکینہ اپنے بابا کا سلام قبول کر لے، اے میری ماں کی کنیز فضہ تجھ پر بھی یہ حسینؑ سلام کر رہا ہے۔ حسینؑ تو رخصت ہو جانا چاہتے تھے مگر ایک مرتبہ یہ بیبیاں درِ خیمہ پر آگئیں اور آکر حسینؑ کو لے گئیں خیمے کے اندر۔ بس عزادارانِ حسینؑ! معلوم ہوتا ہے کہ اب تک زینبؑ کے سر کے اوپر چادر موجود تھی لہٰذا خیمے کے اندر پہنچنے کے بعد اپنے بھائی کے لیے وہ چادر بچھا دی اور حسینؑ چادرِ زینبؑ پر

بیٹھ گئے اور شاہزادی سے گفتگو شروع ہوگئی۔ روایت بتاتی ہے کہ تھوڑی دیر کے بعد امامؑ نے کنیز خاص اپنی ماں کی کنیز حضرت فضہؓ کو قریب بلایا اور بلانے کے بعد چپکے چپکے کچھ کان میں کہا تو فضہ آہستہ آہستہ بڑھتی ہوئی ایک کونے کی طرف خیمے کے جانے لگیں۔ جناب زینبؑ کی نظر پڑ گئی پوچھا فضہؓ کہاں جاتی ہے؟ کہا شاہزادی نہ پوچھیے، آپ کے بھائی نے منع کیا ہے۔ کہا کہ فضہؓ تجھے میری ماں کے حق کی قسم، بتادے کہاں جاتی ہے۔ کہا کہ شاہزادی آپ کے بھائی نے فلاں فلاں لباس طلب کیا ہے۔ بس یہ سننا تھا کہ ایک مرتبہ نعرہ مار کر روئیں۔ کہا کہ فضہ یہ نہیں کہتی کہ میرے بھائی کا کفن لینے جا رہی ہے۔ اس لیے کہ میری ماں نے مجھے بتا دیا تھا کہ زینبؑ جب حسینؑ یہ لباس پہن لے تو یہ سمجھنا کہ تو حسینؑ کو پھر اس کے بعد دوبارہ زندہ نہ دیکھ سکے گی۔

عزادارانِ حسینؑ! وہ لباس آیا، حسینؑ نے وہ لباس پہنا اور جگہ جگہ سے تار تار کیا۔ بس اب نگاہِ حسرت سے بہن کو دیکھا، ایک مرتبہ زینبؑ آگے بڑھی اور آگے بڑھنے کے بعد کہا بھیّا جائیے خدا حافظ ہیں آپ کو روکوں گی نہیں۔ لیکن ماں کی ایک وصیت ہے اسے پورا کرنے کی اجازت دے دیجیے۔ حسینؑ نے پوچھا کیسی وصیت! کہا بھیّا بھیّا ذرا اپنے گلے پر سے یہ اپنا کرتا ہٹا لیجیے۔ حسینؑ نے کرتا ہٹایا تو زینبؑ نے لپٹ کر بھائی کے گلے کو چومنا شروع کیا۔ حسینؑ نے تڑپ کر پوچھا، بہن میرا گلا کیوں چوم رہی ہو؟ کہا کہ ماں نے کہہ دیا تھا کہ جب حسینؑ رخصتِ آخر

کے بعد جانے لگے تو اس گلے کو چوم لینا جہاں تھوڑی دیر کے بعد خنجر کی روانی ہوگی۔ بس یہ سننا تھا کہ حسینؑ نے کہا کہ زینبؑ پھر مجھے بھی ماں کی وصیّت یاد آرہی ہے۔ شاہزادی نے کہا کہ ارشاد ہو۔ آپ کیا عمل کرنا چاہتے ہیں۔ کہا کہ ذرا اپنے بازو پر سے ردا ہٹادو۔ زینبؑ نے ردا ہٹائی حسینؑ نے جھٹ جھپٹ کر بہن کے بازوؤں کو چومنا شروع کیا۔ زینبؑ نے گھبرا کر سوال کیا بھیّا یہ میرے بازو کیوں چوم رہے ہیں؟ کہا کہ تم نے اس گلے کو چوما کہ جہاں خنجر چلے گا۔ میں اس بازو کو چوم رہا ہوں جہاں رسّیاں باندھی جائیں گی۔

بس برادرانِ عزیز! آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ حسینؑ رخصت آخر کے وقت سب کو سلام کر رہے ہیں یہاں تک کہ اپنی کنیز کو بھی سلام کیا۔ بس اب یہاں سے اٹھے تو آگے آگے زینبؑ پیچھے پیچھے حسینؑ، اس خیمے میں تشریف لائے کہ جہاں ایک بیمار بیٹا غش کے عالم میں پڑا ہوا تھا۔ سید سجّادؑ کو غش اس وقت آیا تھا کہ جب خیمے میں ہجوم تھا۔ عباسؑ بھی موجود تھے، علی اکبرؑ بھی موجود تھے، قاسمؑ بھی موجود تھے، عونؑ و محمدؑ بھی موجود تھے۔ اور اب حسینؑ جب رخصتِ آخر کے لیے آرہے ہیں تو زینبؑ نے آگے بڑھ کر سید سجّادؑ کا شانہ ہلایا اور کہا کہ بیٹا غش سے آنکھیں کھولو بابا تمھارا ملنے کے لیے آیا ہے۔

عزادارانِ حسینؑ! ابھی حسینؑ نے جہاد نہیں کیا، ابھی حسینؑ نے تلوار نہیں چلائی، مگر امام زین العابدین علیہ السلام کا ارشاد ہے فرماتے ہیں

کہ پھوپھی کے شانہ ہلانے سے جب میں نے غش سے آنکھ کھول کر اپنے بابا کو دیکھا تو میں اپنے بابا کو پہچان نہ سکا، اس لیے کہ جسم پر اتنے تیر لگے ہوئے تھے کہ پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔ بس اس عالم کو دیکھ کر سید سجادؑ نے گھبرا کر سوال کیا کہ بابا بنی امیہ سے کیا ٹھہری؟ امامؑ نے فرمایا کہ بیٹا صبح سے جنگ ہو رہی ہے۔ بس جنگ کا نام سننا تھا کہ سید سجاد گھبرائے اور کہا بابا صبح سے جنگ ہو رہی ہے تو پھر آپ تنہا کیسے خیمے میں ہیں۔ میرا چچا عباسؑ کہاں ہے، میرا بھائی علیؑ اکبر کہاں ہے، میرا بھائی قاسمؑ کہاں ہے، عونؑ و محمدؑ کہاں ہیں؟ حسینؑ نے کہا بیٹا کس کو کس کو پوچھو گے، اب کہاں تک ایک ایک کو پوچھتے رہو گے، بس یہ سمجھ لو کہ سب ختم ہو گئے، حد یہ ہے کہ ابھی ابھی میں علی اصغرؑ کو دفن کر کے پلٹ کے آ رہا ہوں۔

بس عزاداران حسینؑ! یہ سننا تھا کہ سید سجاد نے کہا کہ پھوپھی ذرا مجھے سہارا دے کر بٹھا دیجیے اور ایک عصا اور ایک تلوار دے دیجیے۔ امامؑ نے سینے سے لگا کر کہا کہ بیٹا کیا کرو گے عصا اور تلوار۔ کہا بابا کمزوری سے سنبھلا نہیں جاتا اس لیے عصا پر تکیہ کروں گا اور تلوار سے آپ کی مدد کروں گا۔

عزادارانِ حسینؑ! روایت بتاتی ہے کہ حسینؑ آگے بڑھے اور آگے بڑھ کر بیٹے کو سینے سے لگایا کہا بیٹا! جہاد تمھیں بھی کرنا ہے جہاد ہمیں بھی کرنا ہے مگر ہمارا جہاد ہو گا تلواروں سے، ہمارا جہاد ہو گا نیزوں سے، ہمارا جہاد ہو گا برچھیوں سے۔ اور تمھارا جہاد یہ ہو گا کہ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ہوں گی، پیروں میں بیڑیاں ہوں گی، گلے میں طوقِ خاردار ہو گا اور زینبؑ

کی ایسی پھوپھی اور ام کلثوم کی ایسی پھوپھی اور سکینہ کی ایسی بہن بازارِ کوفہ وشام میں نامحرموں کے مجمع میں تشہیر کی جارہی ہوں گی اور تم کو یہ سارے منظر اپنی آنکھوں سے دیکھنا ہوں گے۔ سید سجادؑ! امت کے لیے کسی منزل پر بد دعا نہ کرنا۔

عزاداران حسینؑ! مجھے اگرچہ کوئی حق نہیں ہے آپ کا شکریہ ادا کرنے کا، اس لیے کہ آپ کا شکریہ فاطمہ زہراؑ ادا کر رہی ہوں گی، آپ کا شکریہ رسولؐ ادا کر رہے ہوں گے، آپ کا شکریہ علیؑ ابن ابی طالب ادا کر رہے ہوں گے۔ لیکن پھر بھی میں ان کی آواز میں آواز ملا کر آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ بہت زحمتیں آپ نے گوارہ کیں۔ بہت تھک گئے آپ، بہت آپ نے ماتم کیا، بہت حسینؑ پر گریہ وزاری کی۔ لیکن حسینؑ کے عزادارو ں چاہے جتنا بھی حسینؑ پر گریہ کرنا، چاہے جتنا بھی حسینؑ کا ماتم کرنا، چاہے جتنا بھی حسینؑ کے غم میں آنسو بہانا، کبھی ناز نہ پیدا ہونے دینا، کبھی فخر نہ کرنا کہ ہم نے حسینؑ کو بہت یاد کیا۔ اس لیے کہ تم نے اگرچہ حسینؑ کو بہت یاد کیا مگر خدا کی قسم! جس منزل پر تم کو حسینؑ نے یاد کیا اس منزل پر دنیا میں کوئی کسی کو یاد نہیں کرتا۔

اب خیمے کے اندر کا منظر یہ ہے کہ سید سجادؑ حسینؑ کے سینے سے لپٹے ہوئے ہیں، چھوٹے چھوٹے بچے حسینؑ کے دامن سے لپٹے ہوئے ہیں، کہرام بپا ہے اور اس عالم میں حسینؑ فرما رہے ہیں کہ بیٹا! ایک بات میری یاد رکھنا اور وہ بات یہ ہے کہ میں تو شہید ہو جاؤں گا، تم میرے بعد زندہ رہو گے تو میرے شیعوں کو میرا اسلام پہنچا دینا اور کہنا کہ میرے دوستوں

شرطِ محبت یہ ہے کہ جب کبھی ٹھنڈا پانی پینا میری پیاس کو یاد کر لینا۔

بس عزادارانِ حسینؑ! بیبیوں سے رخصت ہونے کے بعد حسینؑ خیمے سے باہر نکلے، گھوڑے پر سوار ہوئے، میدانِ کربلا کا رُخ کیا۔ عزادارو! حسینؑ آئے اور آنے کے بعد چاروں طرف دشمنوں کا ہجوم ہے، تلواریں چل رہی ہیں، نیزے برس رہے ہیں، مگر حسینؑ نے ارشاد فرمایا کہ میں جنگ کے ارادے سے نہیں آیا، میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں اور اس کے بعد حسینؑ نے خطبہ دینا شروع کیا، تقریر کرنا شروع کی۔ اپنا نام و نسب بتایا، اپنا موقف بتایا، کہا مجھے کیوں قتل کرتے ہو؟ اللہ اکبر! کیا دل تھا حسینؑ کے پاس، کیا جگر تھا حسینؑ کے پاس کہ علی اصغرؑ کو دفن کر دیا ہے، عباسؑ کی لاش کو دیکھ لیا ہے، علی اکبرؑ کی لاش اٹھالی ہے، قاسمؑ کی لاش اٹھالی ہے۔ میں کہتا ہوں دنیا میں کسی کریم اور کسی رحیم کا وہ دل نہیں ہو سکتا جو دل تھا حسینؑ کے پاس۔ فرماتے ہیں کہ دیکھو اب بھی اگر تم توبہ کر لو تو میں تمھیں معاف کر دینے کے لیے تیار ہوں۔

اللہ اکبر! ابھی حسینؑ یہ خطبہ دے رہے تھے کہ ایک شخص آیا حسینؑ کے پاس پوچھا کہ کیا آپ ہی حسینؑ ہیں؟ کہا کہ ہاں، میں ہی حسینؑ ہوں۔ کہا کہ ہاں مجھ سے لوگوں نے بتایا کہ آپ حسینؑ ہیں لیکن آپ کے جسم پر اتنے زخم ہیں کہ میں آپ کو پہچان نہیں پا رہا تھا اس لیے میں نے آپ سے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ حسینؑ نے کہا کہ ہاں مجھے پہچان لے، میں فاطمہؑ کا لال حسینؑ، میں علیؑ کا بیٹا حسینؑ، میں رسولؐ کا نواسہ حسینؑ۔ یہ بتا بتا تجھے

کیا کام ہے؟ کہا کہ مولا! مجھے آپ سے یہ عرض کرنا ہے کہ میں مدینے سے کوفہ کے لیے روانہ ہو رہا تھا اور جب محلہ بنی ہاشم سے میرا گزر ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک چھوٹی سی بچی اپنے گھر کا دروازہ کھولے ہوئے بیٹھی ہوئی ہے اور اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں جاتا ہوں، تو میں نے کہا کہ میں کوفہ جا رہا ہوں۔ کہا کہ اے جانے والے! اپنے سفر کو چند منٹ کے لیے ملتوی کر دے میرا بابا بھی کوفہ گیا ہوا ہے، میرا خط میرے بابا کے نام لیتا جا۔ میں آپ کی بچی کا خط لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے بچی کا خط حسینؑ کی خدمت میں پیش کیا۔ حسینؑ نے نامے کو چاک کیا تو اس میں یہ لکھا ہوا تھا کہ بابا! سلام کے بعد عرض ہے کہ آپ نے فرمایا تھا کہ میں بہت جلد تم کو بلا لوں گا فاطمہ صغریٰ! بابا میں آپ کا انتظار کر رہی ہوں، ابھی تک آپ کی طرف سے نہ کوئی خط آیا ہے اور نہ کوئی پیام آیا ہے۔

اس کے بعد کیا لکھا ہوا تھا، اس کے بعد جو لکھا تھا وہ حسینؑ کے عمل سے ظاہر ہوا۔ حسینؑ اس خط کو لیے ہوئے بڑھے، آئے گنج شہیداں میں اور آ کر علی اکبرؑ کے سرہانے بیٹھے۔ بیٹا علی اکبرؑ! تمھاری بہن نے تمھیں سلام کہلوایا ہے، کہو کیا جواب دوں؟ کبھی قاسمؑ کے سرہانے بیٹھے، قاسمؑ تمھاری بہن نے تمھیں سلام کہلوایا ہے، بیٹا جو کہو وہ جواب دے دوں۔ کبھی قبرِ علی اصغرؑ پہ آ کر بیٹھے، میرے لال! علی اصغرؑ! صغریٰ نے تمھیں پیار کے لیے کہا ہے، بیٹا بتاؤ میں تمھاری بہن کو کیا جواب دوں۔

بس عزادارانِ حسینؑ! اس کے بعد حسینؑ پھر گھوڑے پر سوار ہوئے

اور آکر کربلا کے میدان میں جہاد آخر شروع کر دیا۔ خدا شاہد ہے کہ حسینؑ نے اس انداز سے جنگ کی کہ لوگ علیؑ کی جنگ کو بھول گئے، جعفرؑ کی جنگ کو بھول گئے، حمزہؑ کی جنگ کو بھول گئے۔ حسینؑ اسی عالم میں جہاد کر رہے تھے اور بار بار حسینؑ کے سامنے سے لشکر بھاگ کر جا رہا تھا۔ سات حملے امامؑ نے فرمائے اور ہر حملے میں میدان کربلا دشمنوں سے صاف ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ساتویں حملے کے بعد جب پلٹ کر آئے تو ایک مرتبہ فلک سے آواز آئی کہ بس میرے حسینؑ بس! دنیا نے تیری شجاعت کے جوہر دیکھ لیے، اب ذرا یہ بھی دکھا دے کہ تو صبر کی کس منزل پر ہے۔

بس عزادارانِ حسینؑ! حسینؑ نے تلوار نیام میں رکھی اور لشکر والے یہ سمجھ گئے کہ اب حسینؑ جہاد نہیں کریں گے۔ لشکر بھاگا ہوا پلٹ کر آیا۔ چاروں طرف سے حسینؑ پر حملے شروع ہو گئے یہاں تلک کہ تھوڑی دیر کے بعد حسینؑ زینِ فرس کے اوپر ڈگمگانے لگے۔

عزادارانِ حسینؑ! آپ کی اکثریت وہ ہے جو ہندوستان اور پاکستان میں سے آئی ہوئی ہے۔ ایک منظر میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں میں نے بھی دیکھا ہے اور آپ نے بھی دیکھا ہو گا کہ جب جلوس میں علم نکلتا ہے، ضریح نکلتی ہے تو کبھی نہ کبھی خدا نخواستہ ایسا ہوتا ہے کہ جو شخص علم لیے ہوئے جا رہا ہے اس کو ٹھوکر لگ گئی اور علم ڈگمگانے لگا، ضریح سنبھل نہ پائی تو لوگ ماتم بھول کر آگے بڑھتے ہیں علم کو سنبھال لیتے ہیں ضریح کو سنبھال لیتے ہیں، تعزیے کو سنبھال لیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ آپ کے

میں چھ مہینے کا بچہ خون اگل رہا ہو گا۔ نانی وہ پست جگہ وہ جگہ ہے جہاں عالم سجدہ میں میری گردن کے اوپر خنجر شمر چل رہا ہو گا اور تھوڑی دیر کے بعد آواز آئے گی،

"اَلَا قُتِلَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَا اَلَا ذُبِحَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَا

جذبات کا عالم یہ ہے کہ آپ ضریح کو گرنے دینا نہیں چاہتے، آپ تعزیے کو گرنے دینا نہیں چاہتے، آپ علم کو زمیں بوس ہونے دینا نہیں چاہتے آیئے کربلا کے میدان میں ذرا حسینؑ کو سنبھال لیجیے، اس لیے کہ حسینؑ سے زینِ فرس پر سنبھلا نہیں جا رہا ہے۔

آخر حسینؑ زینِ فرس سے زمین کے اوپر تشریف لائے۔ لیکن تاریخ نے تصریح کر دی ہے کہ حسینؑ کی شجاعت اور بہادری کا عالم یہ تھا کہ جب تک کھڑے رہنے کی طاقت رہی بیٹھے نہیں اور جب تک بیٹھنے کی طاقت رہی لیٹے نہیں۔ لیکن جب کھڑے رہنے اور بیٹھے رہنے کی طاقت نہ رہ گئی تو حسینؑ نے سر سجدے میں رکھا اور کربلا کے میدان میں زلزلہ آ گیا جب شمرلعؑ نے سجدے کے عالم میں حسینؑ کے سر کو حسینؑ کے جسم سے جدا کر دیا، آواز بلند ہونے لگی کہ اَلَا قُتِلَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَا اَلَا ذُبِحَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَا اور حسینؑ کے گھوڑے نے دوڑتے ہوئے جا کر سیدانیوں کو خبر دے دی کہ حسینؑ زندہ نہیں ہیں۔

عزادارانِ حسینؑ! تھوڑی دیر کے بعد خیموں سے دھواں بلند ہوا۔

عزادارانِ حسینؑ! میں نے خود یہ روایت دیکھی ہے اور بغیر روایت دیکھے تو میں کوئی بات عرض نہیں کیا کرتا۔ روایت بتاتی ہے کہ جب سے حسینؑ روانہ ہوئے تھے حسینؑ کی ننھی بچی سکینہ حسینؑ کا مصلّیٰ بچھا کر بیٹھ گئی تھی، اس لیے کہ عصر کا وقت آ گیا تھا اور سکینہ کا دستور یہ تھا کہ جب نماز کا وقت آتا تھا تو یہ بچی حسینؑ کے لیے مصلّیٰ بچھا کر بیٹھ جایا کرتی تھی۔ عصر

کی ساعت آئی تو سکینہ نے خیمہ کے اندر مصلیٰ بچھایا۔ مصلیٰ تو بچھ گیا مگر حسینؑ نماز پڑھنے نہ آئے۔ ایک مرتبہ سکینہ آگے بڑھی اور آگے بڑھنے کے بعد مصلیٰ پر بیٹھ گئی، آنکھیں بند، بال سر کے کھلے ہوئے، فرماتی ہیں اے پالنے والے! یہ مصلیٰ کبھی میں نے بچھایا ہو اور یہ مصلیٰ خالی رہ گیا ہو ایسا نہیں ہوا۔ کیا آج میرا بابا نماز پڑھنے کے لیے نہ آئے گا۔

عزادارو! اِدھر سکینہ دعائیں کر رہی تھیں اُدھر حسینؑ کا سر کربلا کے میدان میں کٹ گیا اور ایک مرتبہ سکینہ نے محسوس کیا کہ جیسے کوئی آرہا ہے، سکینہ سمجھی کہ شاید حسینؑ آرہے ہیں۔ لیکن ایک مرتبہ گھبرا کر آنکھ جو کھولی تو دیکھا کہ ایک خونخوار شخص سامنے کھڑا ہوا ہے اور کہہ رہا ہے، سکینہ! سکینہ! تم کیا دعا کر رہی تھیں؟ یہی تو دعا کر رہی تھیں کہ تمھارا بابا مصلے پر آجائے، لو تمھارا بابا آگیا۔ یہ کہہ کر حسینؑ کا کٹا ہوا سر سکینہؑ کی گود میں ڈال دیا۔ بچی نے حسینؑ کے منہ پر منہ رکھا۔ بابا آج آپ اس شان سے تشریف لائے ہیں۔

بہر حال عزاداران حسینؑ! سیدانیوں کے سروں سے چادریں چھننے لگیں، زیور لٹنے لگا، خیموں سے دھواں بلند ہونے لگا۔ عالم یہ کہ سیدانیاں ایک خیمے سے گھبرا کر دوسرے خیمے میں اور دوسرے خیمے سے گھبرا کر تیسرے خیمے میں، یہاں تک کہ شمرؑ نے کہا کہ سارے خیموں میں ایک ساتھ آگ لگا دی جائے۔ عزادارو! جب سارے خیموں میں ایک ساتھ آگ لگا دی گئی تو زینبؑ اس خیمہ میں آئیں جہاں بیمار بھتیجا غش کے عالم میں تھا۔ آکر شانہ ہلایا، بیٹا کب تک بے ہوش رہو گے، آنکھ کھولو۔ اب تم یتیم بھی

ہو امامِ وقت بھی، گھر جل رہا ہے، بتاؤ کیا کریں۔ سر سے چادر چھن چکی ہے نامحرم گھیرے ہوئے ہیں۔ بتاؤ شریعت کیا کہتی ہے، گھر میں جل کر مر جائیں یا گھر کے باہر نکلیں؟ امامؑ نے فرمایا کہ پھوپھی جلدی جلتے خیمہ کے باہر نکل جائیے۔

عزادارو! آنکھیں بند کرلو، علیؑ کی بیٹی، فاطمہؑ کی دلاری سر برہنہ جلتے خیمہ سے باہر نکل رہی ہے۔ وامحمدؐاہ۔ واعلیاہ۔

میرا دل کہتا ہے کہ شاہزادی نے مدینہ کا رخ کیا ہوگا، ماں! آپ کا جنازہ تک پردۂ شب میں تابوت کے اندر اٹھا تھا، آکر اپنی بیٹی کو دیکھیے نامحرموں کا مجمع، سر پر چادر نہیں، چہرہ پر نقاب نہیں۔ ماں! ابھی تو ابتدا ہے، اسی شان سے کوفہ جانا ہوگا اسی شان سے شام جانا ہوگا۔ اسی شان سے دربارِ یزیدؔ میں یزیدؔ کا سامنا ہوگا۔

بارھویں مجلس

اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیْم ؕ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ؕ
وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ وَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنَ
الْخٰسِرِیْنَ ٥ (سورہ آل عمران آیت ۸۵)

برادران عزیز! گیارھویں محرم کی آخری مجلس میں بھی میں نے آپ کے سامنے اُس آیہ کریمہ کی تلاوت کی ہے جسے اب تک مسلسل پیش کرتا چلا آرہا تھا۔ ارشادِ خالق کائنات ہے کہ اسلام کے علاوہ کسی بھی دین کو اختیار کرنے والے کو انجام کار، دنیا میں نہ سہی آخرت کے آتے آتے، اس بات کا خود ہی پتہ چل جائے گا کہ اُس نے وہ دین اختیار کیا جو بارگاہِ الٰہی میں قابل قبول نہ تھا اور اس لیے اس نے اپنے آپ کو اس گروہ میں شامل کر لیا جو نقصان اٹھانے والا تھا۔

گزشتہ مجلسوں میں، قرآن مجید کی اعجاز نما شان اور اس کے کلام الٰہی ہونے کے بارے میں برابر معروضات پیش کرتا رہا اور آپ نے ملاحظہ فرمایا ہو گا کہ قرآن مجید میں اکثر وہ مقامات بھی ہیں جن میں (PHYSICAL SCIENCE) یا طبعیاتی سائنس سے متعلق حقائق بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن قرآن مجید جس دور میں نازل ہوا تھا چونکہ

وہ جہالت کی تاریکی کا دور تھا اس لیے اس زمانہ کے لوگ نہ صرف یہ کہ ان کے ادراک و فہم سے قاصر رہے بلکہ ان حقائق کے بارے میں اٹکل پچو باتیں کر کر کے عصر جدید کے لوگوں کو قرآن و اسلام کے بارے میں تمسخر اور استہزار اور ہنسی اڑانے کا موقع بھی فراہم کر دیا۔

لیکن کل اس دور جہالت میں جو حقائق لوگوں کی سمجھ میں نہ آسکے تھے آج ان کا سمجھ لینا نہایت آسان ہو گیا ہے اور اسی لیے میں عرض کرتا رہتا ہوں اور آج پھر عرض کر رہا ہوں کہ اسلام عقل و علم کا دین ہے، اس لیے کسی بھی دین کو علم و عقل سے خطرہ ہو اسلام کو نہیں ہے۔ اسلام کو جہالت کی تاریکی سے اندیشہ ہے علم کی روشنی سے نہیں۔

عزیزان گرامی! اب تک کی مجالس میں میں نے (PHYSICAL SCIENCE) (طبعیاتی سائنس) سے متعلق وہ حقائق بیان کیے جن پر قرآن مجید نے ۱۴سو سال قبل روشنی ڈالی تھی اور شاید آج بھی ویسی ہی کوئی بات پیش کرتا۔ لیکن آج کی اس سال کی آخری مجلس میں آپ کے منھ کا مزا بدلنے کے لیے قرآن مجید کی شان اعجاز کو ایک دوسرے انداز سے پیش کر رہا ہوں۔ اس بات کا تعلق اگرچہ (PHYSICAL SCIENCE) سے نہیں مگر طریقہ استدلال سائنٹفک ضرور ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل ایک مجلس میں مَیں عرض کر چکا۔ طاقت کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے۔ طاقت، اس کی طاقت ہے، قوت اس کی قوت ہے۔ آج کے انسان کو اپنی طاقت اور قوت پر ناز ہے اس نے ایٹم کے ذرّوں کے اندر جھانک کر دیکھا ہے اور دوسری طرف اس کی نظریں کہکشاں کو کھنگال رہی ہیں۔ اس نے چاند کو اپنے قدموں سے روندا ہے اور اس کے خلائی جہاز آسمانوں میں تیرتے پھر رہے ہیں۔ مگر یہ ساری قوت یہ ساری طاقت

اور ایسی قوت و طاقت کیا اگر یہ قوت و طاقت کروروں گنا اور بڑھ جائے جب بھی اس کی حیثیت ایک بھیک سے زاید نہیں جسے قادر مطلق نے اس عاجز و بے بس انسان کی جھولی میں ڈال دیا ہے۔ اسی بات کو اصطلاحی انداز میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ صرف ذاتِ خالق اور اس کے صفات (ABSOLUTE) (مطلق) ہیں۔ اس کے علاوہ کائنات میں جو کچھ ہے وہ صرف نسبی یا اضافی یا (RELATIVE) ہے۔ حد یہ ہے کہ جن چیزوں کو انسان ابھی چند روز قبل تک مطلق یا (ABSOLUTE) سمجھتا تھا ان کا بھی نسبی اور (RELATIVE) ہونا' علم میں اضافہ کے ساتھ روشن ہو گیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ میں اس تقریر میں آگے کہیں اس پر روشنی ڈالوں۔ اس وقت تو یہ عرض کرنا ہے کہ جب ذات خالق مطلق ہے تو پھر اس کی قدرت بھی مطلق ہے اور جب قدرت مطلق ہے تو کوئی شئے اس کے دائرہ اختیار و اقتدار سے باہر نہیں۔ وہ ہر شئے پر قادر ہے۔ اس کے برخلاف انسان کا دائرہ اقتدار و اختیار بہت محدود ہے اس لیے کہ قدرت کا تعلق علم سے ہے، جتنا کسی کا علم ہوتا ہے اسی قدر اس کی قدرت و طاقت ہوتی ہے اور قرآن نے انسان سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا اے انسانو! تم کو بہت تھوڑا سا علم دیا گیا ہے۔ جب علم بہت کم ہے تو قدرت و قوت و طاقت بھی بہت کم ہوگی۔ اور اللہ کا علم لا محدود تو اس کی قدرت و طاقت بھی لا محدود ہے۔

بات، بات کرنے والے کا، کلام متکلم کا آئینہ ہوتا ہے۔ جیسی ذات ہوتی ہے ویسا ہی اس کا کلام ہوتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ ہے۔ عرض کر چکا کہ اللہ قادر مطلق ہے، ہر شئے پہ قدرت رکھتا ہے۔ انسان بے بس و عاجز ہے اس کے اختیارات نہ ہونے کے برابر ہیں۔

قرآن مجید کلام الٰہی ہے کہ نہیں؟ اس بات کی پرکھ کا آسان علاج یہ ہے کہ یہ دیکھیں کہ اس میں اختیار و اقتدار، قدرت و طاقت کی جھلک ہے یا بے بسی و عاجزی اور ناطاقتی و ناتوانی کی۔ قرآن کہے کچھ اور ہو جائے کچھ تو سمجھ لیں کہ بے بس انسان کا کلام ہے۔ اور قرآن جو کہہ دے، خواہ حالات کیسے ہی مخالف ہوں، ہوا کیسی ہی خلاف چل رہی ہو مگر ہو کر وہی رہے جو قرآن نے کہہ دیا تو پھر یقین کر لیں کہ بے بس و ناتواں انسان کا کلام نہیں قادر و توانا اللہ کا کلام ہے۔ رسولؐ نے قرآن کے بارے میں فرمایا کہ یہ انسان کا کلام نہیں خدا کا کلام ہے، بشر کی بات نہیں خالق بشر کی بات ہے۔ جس قرآن کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا کہ یہ کلام خالق ہے اس قرآن نے کہا کہ پرکھے بغیر کوئی بات نہ مانو، عقل کو آگے بڑھاؤ عقل تمھاری ہادی اور رہبر ہے۔

عزیزو! جب کوئی انسان کسی دوسرے کی طرف کوئی بات منسوب کرتا ہے تو اس نسبت کی صحت کی پرکھ کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ آپ دیکھیں جس کی طرف یہ بات منسوب کی جا رہی ہے یہ بات اس کے بس میں ہے بھی کہ نہیں؟

میں ایک معمولی انسان، میرے پاس نہ خزانہ ہے نہ سرمایہ، نہ میں تاجر ہوں نہ انڈسٹریلیسٹ و صنعت کار۔ اگر میرے جانے کے بعد کوئی شخص میری طرف یہ بات منسوب کرے کہ میں لاس اینجلیس سے جاتے جاتے ادارہ جعفریہ کے لیے دس لاکھ ڈالرز کے عطیہ کا اعلان کر گیا ہوں تو کوئی سمجھ دار انسان اس بات کی صداقت کو قبول نہ کرے گا۔ اس لیے کہ اس کو میرے حدود اور میری مالی حالت سے آگاہی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اتنا بڑا سرمایہ فراہم کرنا میرے اختیار ہی میں نہیں ہے۔

البتہ اگر یہی بات کوئی ذمہ دار کوئی سچا، کوئی معتبر انسان کسی بڑی (FOUNDATION)

فاونڈیشن کی طرف منسوب کرے تو پھر اس پر اعتبار کیا جائے گا اور پھر چند ہی روز بعد جب یہ عطیہ آجائے تو بات کی صداقت مسلّم ہو جائے گی۔

آیئے اب قرآن کو دیکھیں۔ قرآن مجید کا سب سے چھوٹا سورہ سورۂ کوثر ہے۔ بسم اللہ سمیت چار آیتوں کا سورہ جو ایک ہی سانس میں ختم ہو جائے۔ اس سورہ کی ابتدائی آیت میں حضورؐ سے متعلق ایک بات کہی گئی ہے اور آخری آیت میں حضورؐ کے ایک کٹر دشمن کے متعلق ایک بات کہی گئی ہے۔ حضورؐ سے کہا گیا ہے کہ ہم نے آپ کو "کوثر" دیا اور حضورؐ کے دشمن کے بارے میں فیصلہ کیا گیا ہے کہ ہم نے اسے "ابتر" کر دیا۔

عربی زبان میں کوثر کا جو مادہ، جو (ROOT) روٹ ہے اس کے معنی ہوتے ہیں چھا جانا، غالب ہو جانا، پھیل جانا، زیادہ ہونا اور ابتر کا مادہ (ROOT) روٹ ہے 'بتر' اس کے معنی ہوتے ہیں کٹ جانا، بے والی و وارث ہو جانا، گمنام ہو جانا، مقطوع النسل ہو جانا۔

اس سورہ نے بتایا کہ اللہ نے پیغمبرؐ کے مقدر میں کامیابی، عزت، غلبہ، کثرت نسل اور اقتدار رکھا ہے اور پیغمبرؐ کے دشمن کے لیے ذلت، رسوائی، تنہائی بے وارثی اور گمنامی مقدر کر دی ہے۔

بات اس وقت روشن ہوگی جب سورہ کی شان نزول سامنے رکھی جائے۔ یہ سورہ اس وقت نازل ہوا جب پیغمبرؐ کے فرزند حضرت ابراہیم کی بھی وفات ہو گئی۔ اس سے قبل بھی حضور کے جس قدر بچے پیدا ہوئے تھے قضائے الٰہی سے سب فوت ہو گئے تھے۔ جب یہ بچہ بھی فوت ہوا تو قریش کا ایک چودھری، سرمایہ دار، پونجی پت، ۱۸ بچوں کا باپ آگے بڑھا اور اس نے صور پھونکنا شروع کیا، دیکھا تم نے ہمارے خداؤں کو برا

کہنے کا انجام۔ ہو گئے نا سارے دیوتا ناراض، دیکھو محمدؐ پر عذاب ٹوٹ پڑا کہ نہیں؟ ماں باپ پہلے مر چکے تھے، اپنے غیر ہو گئے تھے، دوست دشمن ہو گئے تھے، ایک لے دے کر سہارا رہ گیا تھا اولاد کا کہ اولاد سے نام چلے گا مگر بھلا دیوتاؤں کو برا بھلا کہنے والا بھی دنیا میں کہیں کا رہ سکتا ہے۔ ادھیڑ عمر ہے، اب بچہ کیا پیدا ہو گا، جو تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔ یہ ابتر ہو گئے، اب گمنامی ان کا مقدر، بے وارثی ان کا نصیب، ذلت و رسوائی ان کا انجام۔ حد ہو گئی کہ اس بدنصیب نے حضور کے منہ در منہ یہ گستاخیاں کیں۔

بچہ کا غم، آنکھوں میں آنسو پہلے ہی سے تھے۔ دل پہلے ہی سے ٹوٹا ہوا تھا مگر عین اسی وقت ظالم کے یہ نشتر، یہ کچوکے یہ طنز، زبان پر تو صرف شکر خدا تھا مگر دل کے نقش پڑھ لینے والے نے کرب والم کی لہروں کو دیکھ لیا۔ جبریلؑ نازل ہوئے۔ اللہ کا سلام پہنچایا اور کہا آپ گھبرائیں نہیں، پریشان نہ ہوں حال کو نہ دیکھیں مستقبل سے مطمئن رہیں۔ پھر سورہ کوثر کی تلاوت کی جس نے قدرت کا فیصلہ سنایا۔ یہ ملعون جسے آج ابتر کہہ رہا ہے، عزت اس کے مقدر میں ہے اقتدار اس کے قدموں میں ہو گا۔ آج اس کی اولاد نہیں، ضعیفی دستک دے رہی ہے مگر ہم اس کی نسل کو کثیر قرار دیں گے۔ اور اے دولت والے، عزت والے، ۸ ! بچوں کے باپ والے سن لے، تیرا مقدر بھی ہم نے طے کر دیا ہے۔ ذلت تیرا مقدر ہو گی، بے وارث تو ہو جائے گا، نسل تیری کٹ جائے گی، گمنام تو ہو جائے گا۔

ملاحظہ کریں کلام کا زور، اقتدار کی قوت، عزت دینے والا خدا، ذلیل کرنے والا خدا، جسے چاہے حکومت دے جس سے چاہے چھین لے۔ موت اس کے ہاتھ میں زندگی اس کے ہاتھ میں۔ اولاد دینا اس کے اختیار میں اولاد کا چھین لینا اس کے بس میں۔

یہ اختیارات سوائے خدا کسی کے نہیں، سوائے معبود کسی کے نہیں۔

قرآن کلام خدا ہے کہ نہیں؟ یہ اب رسولؐ سے نہ پوچھیے، تاریخ سے معلوم کیجیے دوستوں کی لکھی ہوئی نہیں دشمن کی تحریر کردہ تاریخ سے پوچھیے۔ اور پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں گردوپیش پر نظر ڈالیے۔ مکہ میں جو گمنام تھا، ذرّہ ذرّہ جس کا دشمن تھا، بچے جس کے مر گئے تھے، جسے لوگ گالیاں دیتے تھے، دنیا کا کوئی کونہ ایسا ہے جہاں اس کی اولاد نہ ہو؟ اس کا نام محبوب، اس کا روضہ محبوب، اس کا شہر محبوب، وہ گلیاں آج کروروں انسانوں کے دلوں کی دھڑکن جہاں حضورؐ کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی تھی۔ دنیا کے ۵۶ اسلامی ملک حضورؐ کے نام کا صدقہ، بڑے بڑے بادشاہ اس کے دربار کے بھکاری، دن و رات کے چوبیس گھنٹے، ہر گھنٹہ کے ۶۰ منٹ اور ہر منٹ کے ۶۰ سکنڈ اور ہر سکنڈ پر دنیا کے کسی نہ کسی کونہ، کسی نہ کسی گوشہ سے اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کی آواز۔

یہ تھی عزت، رہ گئی حکومت تو اس وقت دنیا کے ۵۶ اسلامی ممالک کس کی دین، کس کا صدقہ وہ الگ بات ہے کہ جس کے صدقہ میں یہ حکومت ملی، اسی کے دین کو یہ بادشاہ یہ سربراہان مملکت پامال کریں، یہ کوئی نئی بات نہیں بہت پرانی بات ہے مگر تاہم اتنی ہمت کسی کی نہیں جو محمدؐ کی غلامی سے انکار کر سکے۔ یہ شاہی، یہ حکومت اسی یتیم عبداللہ کی اقرار غلامی کا صدقہ ہے۔ اب اس سے بڑھ کر اقتدار کیا ہوگا، حکومت کیا ہوگی کہ بڑے بڑے صاحبان اقتدار و حکومت اس بوریہ نشین کی اقرار غلامی کے لیے مجبور۔

معلوم ہوا کہ نام ایسا کہ چار دانگ عالم میں ہر ہر لمحہ محمدؐ محمدؐ کی آواز، حکومت ایسی کہ سربراہان مملکت کی زبانوں پر اقرار غلامی، رہ گئی اولاد، تو جس کی صرف ایک بیٹی تھی آج دنیا کا وہ کون سا گوشہ ہے، وہ کون سا حصہ ہے، مشرق میں، مغرب میں، جنوب میں،

دوسری مجلس

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۞ وَمَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡہُ ج وَھُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ۞ (آل عمران: ۸۵)

برادران عزیز! کل بھی اسی آیۂ کریمہ کی تلاوت آپ کے سامنے کی تھی اور آج بھی اسی آیۂ کریمہ کو سرنامۂ کلام کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس کائنات کا پیدا کرنے والا، انسان کو اس دنیا میں بھیجنے والا ارشاد فرما رہا ہے کہ ہم نے تم کو بنایا ہے، ہم ہی نے تم کو پیدا کیا ہے، اس لیے یہ حق ہمارا ہے کہ ہم بتائیں کہ ہم نے تمھارے لیے ایک دین چن لیا ہے اور پسند کر لیا ہے، جس کا نام اسلام ہے۔ اگر کوئی شخص اسلام کو چھوڑ کر کسی دوسری راہ پر چلتا ہے تو ہمارے بتانے کی ضرورت نہیں ہوگی ایک دن خود بخود اسے اس بات کا احساس ہو جائے گا کہ اس نے اسلام کو چھوڑ کر اپنا ہی نقصان کیا تھا۔

برادران عزیز! کل میں نے آپ کے سامنے عرض کیا تھا کہ تمہید میں قرآن مجید کی عظمت اور جلالت اور اس کی الہامی شان کے بارے میں کچھ

شمال میں جہاں نسل رسولؐ موجود نہ ہو، جہاں سادات کی آبادی نہ ہو۔

آئیے اب اس کا حشر دیکھیں جو حضورؐ کو ابتر کہہ رہا تھا۔ وہ چودھراہٹ خاک میں مل گئی، وہ دولت فنا ہوگئی، عزت ذلت میں تبدیل ہوگئی، مقدر میں صرف پھٹکار اور لعنت رہ گئی۔ جس کی ۱۸ اولادیں تھیں آج اس کی نسل کا پتہ نہیں۔ اب یا تو واقعی نسل منقطع ہو گئی یا دادا اتنا ذلیل و خوار ہے کہ اولاد نام لینے پر تیار نہیں۔

فیصلہ آپ کریں کہ حضورؐ نے کہا کہ قرآن انسان کا نہیں خدا کا کلام اور صرف شان خدا یہ کہ جو کہہ دے وہ ہو کر رہے۔ اب دیکھیے کہ جو قرآن نے کہا وہ ہو کر رہا کہ نہیں۔ اب اس کے بعد کون سا انصاف پسند وہ انسان ہے جو قرآن کے کلام خدا ہونے میں شک کر سکے۔

اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ اِنَّآ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ ہم نے آپ کو ہر شے کثرت سے دی، اور میں عرض کر چکا کہ اس کثرت میں کثرت اولاد بھی شامل ہے۔

میرے علم میں سنسکرت اور عربی زبانیں وہ ہیں جن میں صرف واحد اور جمع نہیں ہوتا۔ یعنی ایک ہو تو واحد (SINGULAR) اور دو ہو تو جمع (PLURAL) جیسے اردو، فارسی، انگریزی وغیرہ میں ہوتا ہے۔ جی نہیں عربی و سنسکرت زبانوں میں ایک کے لیے واحد، دو کے لیے تثنیہ اور دو سے زاید کے لیے جمع کا صیغہ آتا ہے۔ یعنی عربی زبان میں جب تک کم از کم تین کی تعداد نہ ہو جائے اسے (PLURAL) یا جمع نہیں کہا جا سکتا ہے۔ یعنی عربی زبان میں کثرت کے لیے کم از کم تین کا ہونا ضروری ہے۔

یعنی عربی زبان کے اعتبار سے نسل رسولؐ پر کثرت کا اطلاق اس وقت تک نہیں

ہو سکتا جب تک اولاد کی تعداد کم سے کم تین نہ ہو جائے۔

حضورؐ کے یہاں بیٹی پیدا ہوئی اور فاطمہؑ کی سی، مبارک ہو رسولؐ، مگر ہم صرف رسولؐ کو مبارک باد دے سکتے ہیں قرآن کو نہیں اس لیے کہ قرآن کی پیشین گوئی کثرت نسل کی اور ابھی صرف ایک ہی بیٹی ہے۔ لیجیے اب رسولؐ نانا ہو گئے۔ اللہ نے رسولؐ کی بیٹی کو چاند سا بیٹا دیا حسنؑ کی شکل میں، دیجیے مبارک باد مگر رسولؐ کو، علیؑ کو، صدیقہ طاہرہؑ کو، مگر ابھی قرآن کو نہیں، اس لیے کہ ابھی نسل رسولؐ منحصر ہے صرف دو میں۔

اب ولادت حسنؑ کے بعد صداقت قرآن کو ولادت حسینؑ کا انتظار ہے اور جب شعبان کی تیسری کو تیسرے امام کی ولادت ہوئی تو قرآن کو بوسہ دیجیے کہ کلام خدا تیری بات سچ ہو کر رہی، تیری پیشین گوئی پوری ہو کر رہی۔

اجازت دیں کہ بات کو مزید آگے بڑھاؤں۔ ادھر قرآن مجید نے کہا کہ رسولؐ کی نسل میں کثرت ہوگی۔ اُدھر حدیث ثقلین میں رسولؐ نے فرمایا کہ مسلمانو! میں تمھاری ہدایت کے لیے قرآن اور عترت چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ یہ دونوں قیامت تک باقی رہیں گے تمھاری ہدایت کے لیے۔ تو دونوں باتوں کا نتیجہ ایک ہی نکلا کہ نسل رسولؐ باقی رہے گی قیامت تک۔

منزل مصائب ابھی دور ہے مگر اتنا سن لیں کہ کربلا کی جنگ کا عنوان بتا رہا ہے کہ یہ جنگ دراصل تکذیب قرآن اور تکذیب رسولؐ کے لیے تھی۔ ان دونوں نے کہا تھا کہ نسل باقی رہے گی۔ شامیوں نے کہا ہم مٹا کر دم لیں گے

اسی لیے کربلا میں وہ لوگ آگئے جن کے سینوں میں بدر و احد کے کینے بھرے ہوئے تھے اور یہ طے کر کے کہ نسل حسنؑ و نسل حسینؑ کو دنیا سے مٹا کر بدر و احد کا بدلہ بھی لے لیں اور قرآن و حدیث کی تکذیب بھی کر دیں۔

مگر نظامِ قدرت سے کون ٹکرا سکتا ہے۔ محافظ بن گیا خدا نسل حسنؑ کا بھی اور نسلِ حسینؑ کا بھی۔ امام حسنؑ کی ساری نسل کربلا میں شہید ہوگئی، یہاں تک کہ سب سے چھوٹا شاہزادہ عبداللہ بن حسن جس کی عمر صرف ۱۱ سال تھی وہ بھی عصر عاشور کے وقت چچا کی گود میں تیر کا نشانہ بنا دیا گیا۔

مگر حسن مثنیٰ کو خدا نے بچا لیا۔ یہ صرف نظام قدرت تھا کہ یہ میدان کربلا میں تشریف لائے شدت سے جنگ کی، زخموں سے چور چور ہو گئے، گھوڑے سے گرے اور خدا نے کچھ ایسی حالت طاری کر دی کہ دشمن کو یقین ہو گیا کہ شہید ہو گئے۔ پھر کیا حالات اس قادر مطلق نے پیدا کیے کہ سارے شہدا کے سر کٹے مگر کوئی دشمن اس ارادہ سے ان کے قریب نہ آسکا۔ یہ سب قدرت الٰہی کے ناقابل تردید مناظر ہیں۔ یہ اسی صورت سے میدان میں پڑے رہے۔ یہاں تک کہ لشکر یزیدؑ کے کربلا سے جانے کے بعد جب بنی اسد کربلا آئے تو انھوں نے ان کی سانس آتے جاتے دیکھی اور وہ اپنی بستی میں اٹھالے گئے اور اللہ نے علاج معالجہ کے بعد ان کو شفا دی اور پھر انھیں سے سادات حسنؑ کی نسل چلی۔

اُدھر نسل حسینؑ میں چھ ماہ کے بے شیر تک کو نہ چھوڑا گیا مگر کوئی زین العابدینؑ اور ان کے فرزند محمد باقرؑ پہ ہاتھ نہ اٹھا سکا۔

اس حقیقت کو ماتی جائسی مرحوم نے کیا اچھے انداز میں اپنے اس قصیدہ میں نظم کیا ہے جسے مدح امام زین العابدین میں قلم بند کیا ہے۔ اس قصیدہ کا مطلع اور بعد کا شعر ہے۔

چُھٹے بھی قید ستم سے اگر قفس کے اسیر — تو سوگ اجڑے نشیمن کا بن گیا تقدیر
بھری بہار میں لٹے ہوئے چمن کا خیال — نظر میں پھنکتے ہوئے آشیانہ کی تصویر

اور اس میں آگے چل کر کہتے ہیں

وہ کربلا کہ تھا بازار موت گرم جہاں | جہاں شہید ہوا چھ مہینہ کا بے شیر
وہیں ترا بھی ترے جانشیں کا بھی بچنا | تھی حفظ نسل امامت کی قدرتی تدبیر

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح قرآن مجید نے اپنے کلام الٰہی ہونے کے ثبوت میں یہ بات کہی تھی، یہ چیلنج کیا تھا کہ اگر یہ کلام انسانی ہے تو تم بھی اس کے ۱۱۴ سوروں میں سے ایک ہی سورے کا جواب یا سورہ گڑھ کر لے آؤ۔ عرب کے شعراء، ادیب سر جوڑ کر بیٹھے کوشش کی مگر تھک ہار کر ہاتھ جھاڑ کر کھڑے ہو گئے مگر قرآن کے چیلنج کو توڑ نہ سکے۔ اسی طرح جب قرآن نے پیشین گوئی کی کہ حضورؐ کو ہر شے کی کثرت کے ساتھ اولاد کی کثرت بھی دی گئی تو لوگوں نے نسل رسولؐ کو دنیا سے ناپید کر دینے کے لیے کربلا میں امکانی طاقتیں صرف کر دیں۔ مگر نہ نسل حسنؑ کو مٹا سکے نہ نسل حسینؑ کو فنا کر سکے۔ خود فنا ہو گئے، نسلیں گمنام ہو گئیں مگر نسل رسولؐ نہ صرف آج تک باقی بلکہ دنیا کا کوئی کونہ کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں سادات پائے نہ جاتے ہوں، نسل فاطمہؑ موجود نہ ہو۔

اور برادران عزیز! بقا کبھی کوانٹٹی، تعداد و مقدار کے لحاظ سے ہوتی ہے اور کبھی کوالٹی اور معیار کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ معبود نے نسل محمدؐ کی کوانٹٹی اتنی رکھی کہ زمین کا کوئی ایسا کونہ نہیں جہاں سادات کی بستی نہ ہو۔ امریکا سے لے کر آسٹریلیا تک دنیا کے ہر ہر علاقہ میں نسل محمدؐ موجود۔ یہ ہے کوانٹٹی اور بہتات۔ اور کوالٹی یوں برقرار رکھی کہ اپنے وقت کا ایک محمدؐ، ہم نام محمد، ہم صورت محمد، ہم سیرت محمد آج بھی قائم ہے۔

دنیا کی کوئی نسل ایسی نہیں جس میں زوال نہ ہوا ہو۔ (DEGENERATION) نہ ہوا ہو سوائے نسل رسولؐ کے۔ حضورؐ کے انتقال کو ۱۴۰۰ سال ہو گئے مگر نسل کی کوالٹی برقرار۔

اور اس دنیا کے آخری دن تک برقرار رہے گی۔

رسول کریمؐ مسجد میں تشریف فرما ہیں۔ ایک صحابی نے حضرت موسیٰ کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے۔ آخر حضورؐ نے فرمایا کہ موسیٰؑ کی جو بھی فضیلت ہو اپنی جگہ لیکن اس کے باوجود اگر زندہ ہو جائیں تو نبی بن کر زندہ نہیں ہوں گے وہ بھی میری امت میں ہوں گے، میرے امام نہ ہوں گے ماموم ہوں گے، مجھ سے آگے نہ ہوں گے میرے پیچھے پیچھے رہیں گے۔

دیکھ لیجیے، یہ ہے مدینہ کے محمدؐ کی کوالٹی کہ موسیٰ آئیں تو ماموم بنیں امام نہیں، حضورؐ کے پیچھے نماز پڑھیں نماز پڑھائیں نہیں۔ اب اس کے سیکڑوں برس یا ہزاروں برس کے بعد سامرا کے محمدؑ پر نظر ڈالیے۔ دیکھیے صدیاں بیت گئیں، نسلیں گزر گئیں مگر کوالٹی کہیں سے نہیں گری، معیار وہی برقرار۔ وہ کہتے ہیں کہ موسیٰ زندہ ہو جائیں تو میرے پیچھے رہیں۔ یہاں ظہور امامؑ کے ساتھ عیسیٰؑ آئے۔ اب اگر عیسیٰؑ امام ہو جائیں اور یہ ماموم، وہ نماز پڑھائیں یہ ان کے پیچھے پڑھیں تو سمجھیے کہ کوالٹی گر گئی۔ اور اگر فاطمہؑ کا چاند آگے بڑھے اور مریم کا لال پیچھے کھڑا ہو تو سمجھ لیجیے کہ کوالٹی وہی مدینہ والے محمدؐ کی برقرار ہے۔

بہر حال میں نے ابتدائے کلام میں عرض کیا تھا کہ کلام متکلم کا آئینہ ہوتا ہے۔ قرآن نے بقائے نسل رسولؐ کا مژدہ سنایا۔ دنیا نے اس نسل کو مٹانا چاہا اگر نسل مٹ جائے اور قرآن کی بات غلط ہو جائے تو یہ بے بس انسان کا کلام اور اگر دنیا ہر کوشش کے بعد تھک جائے اور نسل رسولؐ باقی رہے اپنی آب و تاب کے ساتھ تو نسل رسولؐ کی ہر فرد زبان حال سے صداقت قرآن کی شاہد بنی ہوئی ہے، گواہ بنی ہوئی ہے، اور صداقت قرآن، قرآن کے کلام خدا ہونے کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

عزیزانِ گرامی! دنیا، مغرب کے آخری کنارہ پر لاس اینجلیس میں یہ عشرۂ محرم منعقد ہو رہا ہے اور سلسلہ کی یہ آخری مجلس بھی ہے اس لیے مناسب ہے کہ اس آخری مجلس میں کچھ آخری امام کا ذکر کر دوں۔ جس کے ذکر تک قرآن خود بخود پہنچا رہا ہے۔ یہ بھی ایک رُخ ہے قرآن واہل بیتؑ کے قیامت تک ساتھ ساتھ رہنے کا۔ قرآن کی طرف آؤ تو وہ اہلِ بیتؑ کی طرف کھینچتا ہے اور اہل بیتؑ کے پاس آؤ تو وہ قرآن کی یاد دلاتے ہیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ کوئی انسان اتنے دنوں تک زندہ کیسے رہ سکتا ہے؟ اس کے جواب بہت ہیں مگر وقت کم ہے۔ اس لیے صرف ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔ جو اللہ کو مانتے ہیں ان سے تو صرف اس قدر عرض کروں گا کہ یہ زندہ ہیں نہیں، زندہ رکھے گئے ہیں۔ اسی نے ان کو زندہ رکھا ہے جس نے اُن سے بھی سینیر حضرت عیسٰی کو زندہ رکھا ہے، ان گنت ملائکہ کو زندہ رکھا ہے، شیطان کو زندہ رکھا ہے، سگِ اصحابِ کہف، اصحابِ کہف کے کتے کو زندہ رکھا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ کتے اور شیطان تک کی زندگی پر ایمان ہے مگر ایک انسانِ کامل کی زندگی پر ناک بھوں چڑھائی جاتی ہے۔

لیکن آپ جانتے ہیں کہ نئی نسل کے نوجوان اس بات پر خاموش تو ہو جائیں مگر مطمئن نہ ہوں گے۔ ان کا مطالبہ ہوگا کہ عقل سے سمجھائیے۔ ان بچوں کو، ان نوجوانوں کو گمراہ نہ کہیے، گستاخ نہ کہیے، یہی صحیح مسلمان ہیں۔ دراصل ہم اور آپ جب اپنی علمی کم مائگی کے سبب ان بچوں کو مطمئن نہیں کر پاتے تو اپنی جہالت کا اقرار نہیں کرتے، ان کی گمراہی کا فتویٰ دے دیتے ہیں۔ ان بچوں کو سمجھانا روایتی قسم (TRADITIONAL) کے علماء کے بس میں نہیں۔ تو اس میں ان بچوں کا کیا قصور، ان نوجوانوں کا کیا گناہ۔ قرآن مجید نے کہا کہ وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ ہم نے جس رسولؐ کو بھیجا وہ اپنی

قوم کی زبان میں گفتگو کرتا تھا۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ اپنے زمانہ کو پہچانو، وقت کو پہچانو، وقت و زمانہ کے قدم بہ قدم چلو کبھی دھوکا نہ کھاؤ گے۔ مولیٰ علیؑ نے فرمایا کہ کَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ لوگوں سے ان کی سطح فکری کے مطابق (LEVEL OF UNDERSTANDING) کے لحاظ سے گفتگو کرو ورنہ خدا اور رسولؐ کی بات جھٹلا دی جائے گی۔ آج کا زمانہ سائنس و ٹکنالوجی کا ہے۔ ہماری زبان سائنس کی ہے۔ ہمارا طرز فکر سائنٹفک ہے۔ آج کی زبان میں، آج کی فکر سے نوجوانوں کو سمجھائیے، یہ سمجھ لیں گے، مطمئن ہو جائیں گے۔

تقلید عقاید میں جائز نہیں ہوتی، دم نہیں ہوتا یہ سجاوٹ کے سامان کی طرح بس صرف (DECORATIVE) ہوتے ہیں۔ دیکھنے میں اچھے لگتے ہیں، دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہیے اور بس۔ مگر انھیں عقیدوں کو جب کوئی سمجھ کر اختیار کرتا ہے، عقل کے راستہ سے مانتا ہے تو اس میں جان آجاتی ہے، روح پیدا ہو جاتی ہے۔ عقیدہ بے جان ہوتا ہے تو سمٹ کر زبان تک رہ جاتا ہے۔ عقیدہ جاندار ہوتا ہے تو انسان کے ایک ایک کام میں اس کی تصویر اس کی جھلک دکھائی دینے لگتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ امامؑ اتنے زمانہ تک کیسے زندہ رہ سکتے ہیں۔ آئیے امامت کو بعد میں سمجھیں 'زمانہ' کو پہلے سمجھنے کی کوشش کریں۔

برادران عزیز! صفتیں دو طرح کی ہو سکتی ہیں نسبی یعنی (RELATIVE) اور مطلق یعنی (ABSOLUTE) نسبی یا (RELATIVE) صفت وہ ہوتی ہے جو کسی شے کی بہ نسبت ہو۔ نسبی یا (RELATIVE) صفتوں میں حالات کی تبدیلی کے لحاظ تبدیلیاں آسکتی ہیں۔ بکرا بلی کے بہ نسبت بڑا ہے مگر بکرا لاکھ بڑا ہو، متشرع بھی ہو، داڑھی بھی ہو مگر گھوڑے کے سامنے آئے گا تو چھوٹا ہو جائے گا۔ گھوڑا لاکھ اونچا ہو مگر ہاتھی کے مقابل میں چھوٹا

ہو جائے گا، ہاتھی ابرہہ کا بھی ہو مگر پہاڑ کے سامنے آئے گا تو دکھائی بھی نہیں دے گا۔
یہ ساری بڑائیاں نسبی یا (RELATIVE) ہیں، دوسروں کی بہ نسبت ہیں۔ حالات کے بدلنے سے ان میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ مطلق یا (ABSOLUTE) وہ صفت ہوتی ہے یا وہ چیز ہوتی ہے جو واقعی، حقیقی، ناقابل تبدیل، ہر حالت میں ایک ہی رہنے والی ہو۔

انسان دورِ جہالت میں تھا تو نہ معلوم کتنی چیزوں کو مطلق اور (ABSOLUTE) سمجھتا تھا۔ جتنا جتنا علم بڑھتا گیا اتنا اتنا اطلاق اور (ABSOLUTENESS) کے بت ٹوٹتے چلے گئے اور معلوم ہوتا گیا کہ جن جن کو ہم مطلق اور (ABSOLUTE) سمجھ رہے تھے یہ سب (RELATIVE) یا نسبی ہیں۔ اس بات کو اسلام نے بہت پہلے کہا تھا کہ (ABSOLUTE) صرف ذاتِ الٰہی ہے یا اس کے تمام صفات ہیں، باقی جو کچھ ہے وہ سب نسبی یا (RELATIVE) ہے۔ (یہ بات تفصیل طلب ہے مگر اب اس کا موقع نہیں ہے)

ابھی کچھ عرصہ پہلے تک کے انسان کو یہ بھی غلط فہمی تھی کہ وزن مطلق اور ABSOLUTE ہے نسبی اور (RELATIVE) نہیں۔ یعنی مثلاً جو چیز ایک کلو کی ہے وہ ہمیشہ ایک ہی کلو کی رہے گی، قیامت تک ایک ہی کلو کی رہے گی جہاں لے جائیے ایک ہی کلو کی رہے گی۔ مگر جب زمانہ آگے بڑھا اور انسان نے (ASTRONOMY) اور جدید علم ہیئت کی بلندیوں میں پرواز شروع کی تو معلوم ہوا کہ وزن اپنی جگہ پر کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ ہلکی سے ہلکی شے ناقابل قیاس حد تک وزنی بھی ہو سکتی ہے اور وزنی سے وزنی شے بالکل بے وزن بھی ہو سکتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ چیز یا آپ خود اس کائنات میں کہاں ہیں؟

نظام قدرت ہے کہ یہاں کی ہر شے اپنے سے ہلکی شے کو اپنی طرف کھینچتی ہے، گھسیٹتی ہے۔ فضا میں اڑتے ذرے جب زمین سے تھوڑا دور ہوتے ہیں اور چھت سے قریب

تو چھت اس کو کھینچ کر اپنی چھاتی سے چپکا لیتی ہے۔ درخت سے ٹوٹنے والا پھل آسمان کی طرف نہیں جاتا بلکہ زمین کی کشش فوراً اسے اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ خود زمین کو آفتاب اور سورج کی کشش کائنات میں آوارہ گردی کر کے تباہ ہو جانے سے بچائے ہوئے ہے۔ یہ نظام پوری کائنات میں جاری و ساری ہے اگر ذرا گڑبڑ ہو (DISTURB) ہو تو کائنات درہم برہم ہو جائے۔

ہم اور آپ زمین پر ہیں آئیے یہیں کی بات کریں۔ زمین پر ایک پتھر کی سل پڑی ہے۔ زمین اسے اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ آپ نے اپنے ہاتھ کی قوت سے اس سل کو اٹھانا چاہا اور زمین زور لگا رہی ہے کہ آپ اس کا ٹکڑا اس سے چھیننے نہ پائیں اور آپ کھینچ رہے ہیں کہ یہ سل زمین سے چھین لیں۔ اسی کھینچا تانی سے جو بوجھ آپ کو محسوس ہوتا ہے، یہی وزن کہلاتا ہے۔

پرانے زمانہ کا انسان پانی میں تیرنے کا تو تصور کر سکتا تھا مگر فضا اور خلا میں تیرنے کا تصور اس کی فکر سے باہر تھا۔ لیکن آج خلا نورد (ASTRONAUTS) زمین و آسمان کے درمیان خلا میں تیرتے رہتے ہیں، بالکل بے وزنی کی حالت میں اس لیے کہ وہ آسمان میں اتنا بلند ہو گئے کہ زمین کی کشش (GRAVITY) کی حدیں ختم ہو گئیں اور جب کشش (GRAVITY) ختم ہو گئی تو وزن ختم ہو گیا۔

زمین ہمارے چاند سے ۶ گنا بڑی ہے اس لیے اس کی قوت کشش بھی چاند کی بہ نسبت ۶ گنا زاید ہے اور چاند کی کشش اسی تناسب سے کم ہے۔ اس لیے جو چیز یہاں آپ کو ۶ کلو کی محسوس ہو گی اس کا وزن چاند پر صرف ایک کلو رہ جائے گا اور اسی لیے جب ہمارے (ASTRONAUTS) خلا نورد چاند پر جاتے ہیں تو ان کا وزن ۶ گنا کم ہو جاتا ہے

اس لیے آپ نے فلموں میں دیکھا ہوگا کہ وہ چاند پر یوں چلتے ہیں جیسے زمین پر ربر کا گیند ٹپے کھاتا ہوا اُچھلتا ہوا چلتا ہے۔ اور اگر یہی انسان مریخ (SATURN) پر چلا جائے تو چونکہ وہ ہماری زمین کی نسبت بہت بڑا ہے اس لیے یہاں کے انسان کا وزن وہاں کئی گنا بڑھ جائے گا۔ اس کا ایک ایک قدم منوں وزنی ہو جائے گا۔ دو قدم راستہ چلنا دشوار ہو گا۔

بہ ہر حال اب تک کی تفصیل سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ وزن اپنی جگہ کچھ نہیں، اس کا بذات خود کوئی وجود نہیں۔ اس کا انحصار ہے کہ آپ یا کوئی چیز جہاں ہے وہاں کشش (GRAVITY) کی کیا پوزیشن ہے۔

اور یہاں تک پہنچ کر اپنے بچوں کو ایک بات اور بتا دوں کہ کسی انسان نے سوچا بھی نہ ہو گا کہ روشنی کی کرنوں میں بھی وزن ہوتا ہے۔ آج بھی شاید بہت سے لوگ اس بات کو سوچنے تک پر تیار نہ ہوں کہ یہ نورانی کرنیں بھی وزن رکھ سکتی ہیں۔

سرکار! ہمارا علم جس قدر بڑھتا جاتا ہے ہم کو ہماری حقارت کا احساس دلاتا جاتا ہے۔ پہلے ہم سمجھتے تھے کہ کائنات کا محور زمین ہے اس سے بڑی کوئی چیز نہیں۔ علم آگے بڑھا تو معلوم ہوا کہ جسے ہم سب کچھ سمجھ رہے تھے نظام ہستی (SOLAR SYSTEM) میں اس کی حیثیت وہی ہے جو ایک بادشاہ کے دربار میں طفیلیوں کی ہوتی ہے۔ اربوں سال سے شہنشاہ فلک آفتاب اس زمین کو اپنا طواف کرا رہا ہے۔ یہ بے چاری قوت کشش کی رسیوں میں جکڑی صبح شام اس کے صدقہ ہو رہی ہے۔ سورج کے سامنے زمین کی حیثیت اس سے زاید کچھ نہیں کہ آپ فٹ بال پر ایک گیہوں کا دانہ رکھ دیں۔ زمین کی گولائی ۲۴ ہزار میل ہے خط استوار پر اور سورج کی ۲۷ لاکھ میل۔ سورج سے بلند ہونے والے آگ کے

نہ کچھ عرض کیا کروں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ جتنا جتنا زمانہ آگے بڑھتا جاتا ہے اُتنا اُتنا قرآن کریم کے اعجاز کے نئے نئے پہلو ہمارے سامنے آتے جاتے ہیں۔ آپ مجھے دنیا میں کوئی کتاب ایسی نہیں دکھا سکتے کہ جس میں وہ خصوصیات ہوں جو قرآن کریم میں پائے جاتے ہیں۔ آج میں یہاں آپ کے سامنے قرآن کریم کی ایک ایسی جیتی جاگتی شان پیش کر رہا ہوں کہ تھوڑی زحمت گوارہ کر کے قرآن کریم کی اس شان کو آپ بھی ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

آپ انصاف سے بتائیں کہ دنیا میں آپ نے کوئی ایسی کتاب دیکھی ہے کسی بھی TOPIC پر ہو، کسی بھی SUBJECT پر ہو، کسی بھی موضوع پر ہو کہ اس میں حقیقت بیانی کا بھی لحاظ ہو، کوئی بات ماضی، حال اور مستقبل سے متعلق ایسی نہ آنے پائے جو DOUBTFUL ہو۔ اس کا اسلوب اور اس کا DICTION منفرد ہو۔ اس کی فصاحت اور بلاغت اعجاز نما ہو۔ اور پھر اس کتاب نے دنیا کا کوئی موضوع چھوڑا نہ ہو۔ ہر موضوع پر اُس نے کچھ نہ کچھ روشنی ڈالی ہو اور پھر ان سارے خصوصیات کے بعد اس میں ایک اور عجیب اور غریب خصوصیت یہ پائی جاتی ہو کہ اس میں جتنے حرف آئے ہوں وہ سب ایک خاص تناسب کے اعتبار سے ہوں۔ یہاں سے بہت دور حیدرآباد۔ حیدرآباد دو ہیں، ایک حیدرآباد ہندوستان میں اور ایک پاکستان میں۔ مگر جس حیدرآباد کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ حیدرآباد دکن ہے ہندوستان والا۔ وہاں ایک MUSEUM ہے جس کا نام سالار جنگ میوزیم ہے۔ اس سالار جنگ میوزیم میں ایک MANUSCRIPT - SECTION ہے

شعلے ہی ۲،۴۴ ۲،۴۴ ہزار میل تک بلند ہو جاتے ہیں۔ ہم سورج کی اس عظمت کے سامنے دہشت زدہ ہو گئے۔ مگر جب علم آگے بڑھا کہ جسے ہم شہنشاہ فلک سمجھ رہے تھے یہ بیچارہ تو تعلقہ دار یا تحصیلدار بھی نہیں۔ اسی لامحدود نما محدود کائنات میں ہمارے سورج سے سیکڑوں گنا نہیں، ہزاروں گنا نہیں، لاکھوں گنا بڑے ایسے اجرام موجود ہیں کہ اس سورج کے ایسے لاکھوں سورج اس کے پیٹ میں سما جائیں اور وہ ڈکار بھی نہ لیں۔ ایسے اجرام فلک کو (BLACK HOLE) بلیک ہول کہا جاتا ہے۔ یہ اجرام ہمارے غریب سورج سے لاکھوں گنا بڑے ہیں مگر دکھائی نہیں دیتے۔ ارے بھئی یہ کیسے ممکن ہے کہ ایسے ایسے بڑے اجرام دکھائی نہ دیں؟ اسے بھی سن لیجیے۔ آپ کو کوئی شے دکھائی کب دیتی ہے؟ جب روشن کرنیں کسی شے پر پڑتی ہیں اور پڑ کر واپس ہوتی ہیں تو وہ شے آپ کو دکھائی دیتی ہے۔ یہ (BLACK HOLES) بلیک ہولس اس قدر بڑے ہیں اور ان کی قوت کشش (GRAVITY) اس قدر شدید ہوتی ہے کہ اور تو اور یہ روشنی کی کرنوں کی ایسی لطیف شے کو بھی گھسیٹ کر نگل جاتے ہیں۔ تو جب روشنی کی کرنیں اس کی پکڑ سے، گرفت سے آزاد ہی نہ ہوں گی تو آپ تک پہنچیں گی کیسے؟ اور جب پہنچیں گی ہی نہیں تو یہ نظر کیا آئیں گے۔ یہ حجاب غیب میں لپٹے ہوئے ستارے اس بات کا پتہ دے رہے ہیں کہ جب کوئی شے حد سے زاید وزنی ہو جاتی ہے تو غائب ہو جاتی ہے۔ یاد رکھیے وزنی ہونا نسبی ہے اور خود "وزن" مطلق ہے۔ آئیے اب دیکھیں رسولؐ اہل بیتؑ کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ حدیث ثقلین تو آپ کو یاد ہو گی نا؟ رسولؐ اس حدیث اہل بیتؑ کو "ثقیل" یعنی وزنی نہیں فرما رہے ہیں بلکہ ثِقل یعنی وزن قرار دے رہے ہیں۔ یہ وزنی نہیں ہیں بلکہ خود وزن ہیں۔ آپ نے ملاحظہ فرمالیا کہ ایک وقت وہ آتا ہے جب وزنی شے نظروں

سے غائب ہو جاتی ہے تو اب جن کو وزنی نہیں خود وزن قرار دیا جا رہا ہو، ان میں اگر ایک غائب ہو تو اس پر حیرت نہ کریں گیارہ کا دکھائی دینا حیرت کی بات ہے۔

بہرحال آپ نے ملاحظہ فرما لیا کہ روشنی کی ایسی لطیف شے بھی کشش ثقل (GRAVITY) کے اصول سے باہر نہیں اور جب یہ بھی کشش ثقل کی زد میں ہے تو اس میں بھی وزن ہے۔ نور میں وزن ہے یہ حقیقت انسان کو آج معلوم ہوئی ہے مگر جن کی خلقت نور سے ہوئی وہ نور کی حقیقت سے نا آشنا کیسے ہو سکتے تھے۔ مدینۃ العلم کا چوتھا دروازہ علیؑ کا پوتا، علی بن الحسینؑ، زین العابدینؑ مناجات کر رہا ہے، جو آج صحیفہ کاملہ میں موجود ہے، صرف ترجمہ سنیں: میرا پروردگار ہر نقص سے پاک، جو آسمان و زمین کے وزن کو جانتا ہے، جو ہوا اور فضا کے وزن کا عالم ہے **سبحان الذی یعلم وزن النور والظلمات** سبحان اللہ، میرے معبود کی شان جو روشنی اور تاریکیوں تک کے وزن سے آشنا ہے۔ یورپ و امریکا کے سائنس دانوں کو آج روشنی کے وزن کی اطلاع ہوئی اور مدینہ کا یہ عالم علم لدنی ایسی نہ معلوم کتنی حقیقتوں سے اس زمانہ میں آشنا تھا۔

بہرحال گفتگو شروع ہوئی تھی امام کی زندگی سے، وہ بات تو رہ گئی اور غیبت کا امکان ثابت ہو گیا۔

آئیے پلٹ چلیں، امام کی زندگی پر گفتگو کر لیں۔ میں نے عرض کیا انسان کا یقین تھا کہ وزن مطلق اور (ABSOLUTE) ہے نسبی اور (RELATIVE) نہیں لیکن دور علم نے بتایا کہ وزن بھی نسبی ہے مطلق نہیں۔ بالکل اسی طرح بیسویں صدی کے شروع تک انسان کا خیال تھا کہ زمانہ، وقت یا ٹائم (TIME) مطلق اور (ABSOLUTE) ہے نسبی یا (RELATIVE) نہیں مگر اس صدی کے عظیم سائنس داں آئینسٹائن نے اس یقین کو بھی جہل مرکب قرار دے دیا

اور ثابت کر دیا کہ زمانہ وقت اور ٹائم (TIME) بھی مطلق نہیں، نسبی ہے۔ نظریہ اضافیت (THEORY OF RELATIVITY) کی تفصیل میں جائے بغیر اس نے جو نتیجہ نکالا ہے صرف اسے آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ آج کل کے بچے بھی جانتے ہیں کہ روشنی کی رفتار ایک سکنڈ میں ... ۱۸۶ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بہ فرض اگر کوئی شے اپنی رفتار میں رفتار نور سے قریب ہونے لگے تو جس قدر یہ رفتار رفتار نور سے قریب ہوتی جائے گی، وقت، زمانہ اور (TIME) اس کے لیے (BEND) ہوتا جائے گا، گھوم جائے گا سکڑ جائے گا۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ فرض کریں کہ کسی خلائی جہاز کی رفتار روشنی کی رفتار سے خاصہ قریب ہو گئی اور اس رفتار سے یہ جہاز زمین سے کسی آسمانی سیارے یا ستارے تک دس برس تک پرواز کرتا رہا، دس برس میں وہاں پہنچا اور دس برس میں واپس آیا' فرض کیجیے کہ اس میں سوار خلا باز کی عمر وقت روانگی بیس سال تھی تو جب یہ خلا باز زمین پر واپس آئے گا تو اس کی عمر واقعی صرف چالیس سال ہی ہو گی۔ مگر اس بیس سال کے سفر میں شدت رفتار کے سبب (TIME) اس کے لیے (BEND) ہو چکا ہو گا۔ وقت کی رفتار اس کے لیے بہت آہستہ ہو چکی ہو گی۔ اس لیے جب یہ زمین پہ واپس آئے گا تو یہاں کی دنیا ہی بدلی ہوئی دکھائی دے گی۔ یہاں کئی سو برس گزر چکے ہوں گے، صدیاں بیت چکی ہوں گی۔

زمانہ کی اسی نسبت اور (RELATIVITY) کی طرف قرآن مجید نے کہیں یوں اشارہ کیا ہے کہ وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ہ اللہ کا ایک دن تمھارے حساب سے ہزار سالوں کے برابر ہے اور کہیں بات کو اور آگے بڑھا کر فرمایا ہے تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَالرُّوْحُ اِلَیْہِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَۃٍ ط

ملائکہ اور روح الامین اللہ کی طرف ایک دن میں بلند ہوتے ہیں جس کی مقدار تمہارے حساب سے پچاس ہزار سال کے برابر ہوتی ہے۔

بہ ہر حال کم از کم اس زمانہ میں تو آئینسٹائن نے بتایا کہ کوئی شے نور کے قریب ہو تو زمانہ اس کے لیے سکڑ جاتا ہے (BEND) ہو جاتا ہے۔ تو اب اگر کوئی ذات خود نور ہو اور زمانہ اس کے لیے (BEND) ہو جائے، سکڑ جائے، وہ ہزاروں برس بعد ظاہر ہوں مگر چالیس سال ہی کے دکھائی دے رہے ہوں تو ان کی جوانی میں حیرت نہ کیجیے اپنے علم سے دور رہ جانے کا ماتم کیجیے۔

ظہور امامؑ کے سلسلہ میں روایات میں یہ بھی بات آگئی ہے کہ نفاق ختم ہو جائے گا جھوٹ مٹ جائے گا۔ لوگوں کو حیرت ہوتی تھی کہ یہ کیسے ہو گا۔ مگر زمانہ آگے بڑھا، سائنس نے ترقی کی تو یہ سمجھنا بھی آسان ہو گیا۔ آپ کو حال کی ایجاد (LIE DETECTOR) کے بارے میں تو معلوم ہو گا۔ اس کے معنی ہوتے ہیں دروغ گیر آلہ، جس کے ذریعہ معلوم ہو جاتا ہے کہ انسان جھوٹ بول رہا ہے کہ سچ۔ اس مشین کے پلگ انسان کے جسم کے مختلف مقامات پر لگا دیے جاتے ہیں، تھوڑے فاصلہ پر ٹی وی کا سا اسکرین، پردہ ہوتا ہے، آدمی نے گفتگو شروع کی اور اس نے دل و دماغ کی لہروں کو اسکرین پر منتقل کرنا شروع کیا۔ سچے انسان کا دل مطمئن ہوتا ہے اس لیے جب تک سچ بولتا رہتا ہے، گراف سیدھا سیدھا بنتا چلا جاتا ہے۔ جھوٹ بولنے والے کا دل دھڑکنے لگتا ہے، دل و دماغ کی ہم آہنگی ختم ہونے لگتی ہے اور نتیجہ میں گراف کی لکیریں بھی الٹی سیدھی، نیچے اوپر ہونے لگتی ہیں۔

ایجاد اور معجزہ میں فرق بس اتنا ہی ہے کہ ہمارے یہاں اسکرین الگ ہوتا ہے

انسان الگ اور معجزہ یہ ہے کہ انسان کی پیشانی اس کی اسکرین بن جائے گی۔ دل کے تصورات گراں کی شکل میں پیشانی پر آجایا کریں گے اور معلوم ہو جایا کرے گا کہ مومن ہے یا منافق، جھوٹا ہے یا سچا۔

آخر میں ایک بات عرض کر کے زحمت ختم کرنے کے لیے مصائب کی طرف آگے بڑھوں۔ آپ کے دل میں خیال آسکتا ہے کہ یہ جمہوریت کا زمانہ ہے (DEMOCRACY) کا دور ہے۔ اس زمانہ میں امامت کی ڈکٹیٹرشپ کیسے چلے گی۔ یہ زمانہ کے رجحان کے خلاف ہے؛ بے شک یہ جمہوریت کا زمانہ ہے۔ جس ملک میں آپ تشریف فرما ہیں یہاں صحیح معنوں میں جمہوریت ہے۔ یہاں تعلیم ہے لوگ سمجھ دار ہیں، اپنا اچھا برا خود سمجھ سکتے ہیں، خود فیصلہ کرتے ہیں۔ الیکشن میں کوئی دھاندلی نہیں ہوتی۔ ہم اور آپ جس علاقہ کے ہیں، ہندو پاک کے، وہاں تو ہر شے کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ مغرب کی تقلید میں لے تو لی جمہوریت (DEMOCRACY) لیکن سبحان اللہ، کیا جمہوریت اور کیا الکشن ہیں، کوئی ایسا فریب نہیں کوئی ایسا حربہ نہیں جو الکشن میں استعمال نہ ہوتا ہو۔

میں پرانے لکھنؤ کے ایک قدیم محلہ، جوہری محلہ میں رہتا ہوں۔ آزادی کے بعد بھی برسوں تک اس محلہ کی گلیاں بجلی کی روشنی سے محروم تھیں۔ مٹی کے تیل کی لالٹینیں جلتی تھیں وہ بھی کبھی جلیں کبھی نہیں۔ ایک الیکشن کے موقع پر محلہ والوں نے طے کیا کہ جب تک اس محلہ میں بجلی کی روشنی نہ آجائے گی ایک شخص بھی ووٹ دینے نہ جائے گا۔ یہ بالکل سچا واقعہ ہے، آپ یقین کریں۔ گورنمنٹ کو خبر ہوئی۔ ووٹنگ سے دو روز قبل محلہ کی گلیوں کے سامنے سڑک پر الکٹرک پول لاکر ڈال دیے گئے۔ محلہ والے خوش ہو گئے کہ ترکیب کام آگئی، الکشن کا دن آیا، خوشی خوشی ووٹ ڈالنے گئے۔ لوگ بیچارے ووٹ ڈال کر واپس آرہے تھے

اور پول دوبارہ ٹرکس پر لد کر جہاں سے آئے تھے وہاں واپس جا رہے تھے۔

بہر حال جمہوریت جہاں جیسی بھی ہو حقیقت یہی ہے کہ اس زمانہ میں ڈکٹیٹر شپ میل نہیں کھاتی۔ لیکن برادران عزیز، جمہوریت میں بھی قاعدہ ہوتا ہے کہ سارا کام وزارت چلاتی رہتی ہے (CABINET) چلاتی رہتی ہے۔ لیکن اگر حالات (CABINET) اور پارلیمنٹ کے قابو سے باہر ہو جاتے ہیں ملک میں نراج پھیل جاتا ہے تو صدر سب کچھ معطل کر کے سارے پاور زا اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔

قدرت بھی انسان کو موقع دے رہی ہے، چلاؤ دنیا کا نظام، جیسے چاہو چلاؤ لیکن اگر نراج پھیل گیا، انصاف ختم ہو گیا، ظلم وستم کی حکمرانی ہو گئی، دنیا ظلم وستم سے بھر گئی تو ہم نے بھی ایک صدر ایک (PRESIDENT) بچا رکھا ہے، وہ نکل کر سارا ایڈمنسٹریشن، سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لے گا اور دنیا کو ایک مرتبہ پھر عدل و انصاف سے بھر دے گا۔

برادران عزیز! آج سلسلہ کی آخری مجلس ہے اس لیے بڑی ناانصافی کی بات ہو گی اگر آپ حضرات کی محبتوں اور عنایتوں کا شکریہ ادا نہ کروں۔ میں دل کی گہرائیوں سے آپ حضرات کی محبتوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

میں یہ بات بھی کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ لاس اینجلیس کے مومنین میں جو بات دیکھی وہ تقریباً نایابی کی حد تک ہم میں کمیاب ہے۔ اور وہ یہ کہ آپ الحمدللہ متحد ہیں۔ آپ میں پارٹی بندی نہیں۔ یہ آپ کے اخلاص کی دلیل ہے۔ پارٹی بندی ہوتی ہی وہاں ہے جہاں خدا پرستی کے بجائے خود پرستی آ جاتی ہے۔ جہاں اخلاص کے بجائے ریاکاری اور شو کے جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس اتحاد کو بچائے رکھیے گا۔

دوسری گزارش ہے بچوں کے بارے میں۔ اسلام میں دین و دنیا کی تفریق نہیں۔

اسلام نہ ترکِ دین کی اجازت دیتا ہے نہ ترکِ دنیا کی۔ ہندوستان، پاکستان میں ہماری بیماری دوسری ہے اس لیے دوا بھی دوسری ہے۔ یہاں مرض دوسرا ہے اس لیے علاج بھی مختلف ہے۔ وہاں ہم جہالت کی بنا پر دنیا میں بالکل پچھڑ گئے ہیں اس لیے علاج اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ جنگی پیمانہ پر جدید علم کو قوم میں پھیلایا جائے۔ یہاں جدید تعلیم کے مواقع آپ کے بچوں کو بہتر سے بہتر حاصل ہیں مگر مادیت سے لادینیت سے اندیشہ ہے، اس لیے یہاں کے بچوں کو دینی و اخلاقی لحاظ سے سنبھالے رکھیں۔ اولاد سے بڑی کوئی نعمت نہیں ہوتی مگر نظامِ قدرت یہ ہے کہ ہر نعمت ایک امتحان ہوتی ہے۔ آپ کے یہ پیارے پیارے بچے آپ کا امتحان ہیں۔ اگر آپ کی غفلت سے یہ بگڑے تو آپ کو بارگاہِ الٰہی میں اس کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ آپ کے بچے بگڑے تو صرف یہی نہ بگڑیں گے پوری نسلیں ان کی تباہ ہو جائیں گی۔

اور آخری گزارش یہ ہے کہ ہر قیمت پر عزاداری کو قائم رکھیے گا۔ اسی عزاداری نے ہم کو بنی امیہ اور بنی عباس کے مظالم کے سیلاب سے بچایا ہے۔ یہی عزاداری انشاء اللہ آپ کو اور آپ کے بچوں کو یہاں کے کفر و الحاد اور مادیت کے ریلے سے بھی بچائے رکھے گی۔ اسی کے ساتھ عزاداری کو رسم نہ بننے دیں۔ شیطان آپ کے دماغوں میں معاذ اللہ امام حسینؑ کے بارے میں بھی وہی خیال نہ بٹھا دے جو اس نے عیسائیوں میں حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں بٹھا دیا کہ عیسیٰؑ نے معاذ اللہ سولی پر چڑھ کر ہمارے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا، اب ہمیں عمل کی ضرورت نہیں۔ عمل عقیدہ کا محافظ ہوتا ہے۔ اس لیے عیسائیوں کی پہلی نسل سے عمل گیا اور آئندہ نسلوں سے عقیدہ بھی رخصت ہو گیا۔

بس بھائیو! مجلس ختم کے قریب ہے۔ خدا اس صفِ عزا کو ہمیشہ قائم رکھے۔

آپ نے بڑا اہتمام کیا عزاداری میں۔ خدا قبول کرے لیکن اس آراستہ و پیراستہ سجے سجائے عزاخانہ میں فرش عزا پر آرام کے ساتھ بیٹھ کر جب حسینؑ کے غم میں آنسو بہائیے گا تو اس بے کس بہن کو حسینؑ کی ضرور یاد کر لیجیے گا جو برستے ہوئے کوڑوں، چبھتے ہوئے نیزوں، جھلستے ہوئے لو کے تھپیڑوں اور سورج کی تیز دھوپ کی چبھتی ہوئی کرنوں کے درمیان مجلس حسینؑ کی بنیاد رکھ رہی تھی۔ جس مجلس میں آپ تشریف فرما ہیں یہ مجلس ساکن ہے، مجلس پڑھنے والے کا منبر اپنی جگہ ساکن ہے لیکن زینب کی مجلس بھی چلتی پھرتی تھی اور اس متحرک مجلس کی ذاکرہ بھی برہنہ پشت اونٹ پر ایک جگہ سے دوسری جگہ اور دوسری جگہ سے تیسری جگہ مجلس کو ساتھ ساتھ لیے رواں دواں تھی۔ آج آپ اس شاندار عزاخانہ میں حسینؑ کا سوم منا رہے ہیں اور زینبؑ کے لیے بھی یہ سوم آیا مگر اس فرق کے ساتھ کہ یہاں چاہنے والوں کا مجمع ہے وہاں دشمنوں کا ہجوم تھا، یہاں رونے والے ہیں وہاں خوش ہونے والے تھے۔ یہاں عزاخانہ کے ایک حصہ میں حسینؑ کی ضریح ہے، عباسؑ کا علم ہے، شہداء کی یاد میں علم ایستادہ ہے، وہاں چاروں طرف حسینؑ، عباسؑ، علی اکبرؑ، قاسم، عون و محمد اور شہداء کے کٹے ہوئے سر تھے۔ یہاں حسینؑ کا دربار ہے وہاں ابن زیاد کا دربار تھا۔

بس عزاداران حسینؑ! زحمت ختم ہے۔ ظالم ابن زیادؑ کا بھرا ہوا دربار، رسولؐ کی آل دربار میں رسن بستہ، امام معصوم زنجیروں میں جکڑا ہوا، گلے میں طوق پاؤں میں بیڑیاں اور بھاری زنجیر۔ صرف پچاس برس گزرے تھے وفات رسول کو اور مسلمان اتنا بدل گئے کہ یہ منظر نظروں کے سامنے تھا مگر کوئی احتجاج نہ تھا کوئی اضطراب نہ تھا۔ جبکہ المیہ کربلا کے تقریباً ۱۳ سو سال بعد اس منظر کا تصور کر کے کوئی شیعہ شاعر نہیں ایک سنی شاعر سیماب اکبرآبادی

تڑپ گیا اور تڑپ کر کہا

سجادؑ اسیر جو ہوئے افسوس کسی نے یہ نہ کہا

یہ پاؤں ستون کعبہ ہیں، زنجیر کسے پہنا تا ہے

بہ ہر حال ظالم کا دربار۔ بیبیاں سر برہنہ۔ ملعون تخت حکومت پر۔ اور غضب یہ کہ پاؤں کے پاس ایک کاسہ میں سر حسینؑ۔ اور اس ملعون کی بار بار سر حسینؑ کے ساتھ گستاخیاں۔

تھوڑی دیر تک یہ صورت حال جاری رہی۔ پھر سر کو ایک کپڑے سے چھپا دیا گیا۔ ابن زیاد نے غلاموں کو اشارہ کیا، غلام اپنی جگہ سے ہٹے۔ تھوڑی دیر میں یہی غلام ایک اسیر کو زنجیروں میں جکڑے ہوئے دربار میں لے کر آئے۔ قیدی رسّیوں میں جکڑا تھا، موت سر پر منڈلا رہی تھی مگر موقف کی صداقت کا یقین قید میں بھی انسان کو آزاد رکھتا ہے، آئے دربار میں اور ابن زیاد کو سلام تک نہ کیا۔ کسی خوشامدی نے کہا مختار! تم نے امیر کو سلام نہ کیا، کہا مَالِیَ الْاَمِیْرُ سِوَی الْحُسَیْن میرا امیر حسینؑ کے علاوہ کوئی نہیں، ابن زیاد مسکرایا اور کہا مختار! قید کی سختی نے بھی حسینؑ کی محبت پر کوئی اثر نہ ڈالا مگر یہ تمہاری محبت حسینؑ سے کیسی ہے؟ محبت تو دو طرفہ ہوتی ہے، تم حسینؑ سے اتنا عشق کرتے ہو اور حسینؑ تمہاری طرف سے اتنے بے پروا کہ کوفہ آئے اور تم کو اطلاع بھی نہ دی۔ مختار نے کہا تو جھوٹ کہتا ہے، ممکن نہیں کہ مولیٰ کوفہ آئیں اور غلام کو خبر نہ ہو۔ کیا تمہیں یقین نہیں آتا مختار! حسینؑ کوفہ میں نہیں اسی دربار میں موجود ہیں۔ مختار نے حیرت سے چاروں طرف نظر ڈالنا شروع کی، کہیں حسینؑ دکھائی نہ دیے۔ ابن زیاد نے کہا اِدھر اُدھر کیا دیکھتے ہو، یہاں دیکھو۔ اشارہ کیا غلاموں کو، کپڑا ہٹا، حسینؑ کے کٹے ہوئے سر پر نظر پڑی، تڑپ گئے۔ مولیٰ آپ شہید ہو گئے غلام کو خبر نہ ہوئی اَلسَّلَامُ

عَلَیْکَ یَا اَبَا عَبْدَ اللّٰہِ، اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا بْنَ رَسُوْلِ اللّٰہِ ۔ ابن زیادؒ نے کہا مختار! تم سے حسینؑ کا کٹا ہوا سر نہ دیکھا گیا، ذرا اُدھر بھی دیکھو، یہ بھرے دربار میں کھلے سر علیؑ کی بیٹی زینبؑ کھڑی ہے، وہ دوسری طرف فاطمہؑ کی لاڈلی ام کلثومؑ بالوں کو بکھیرے کھڑی ہے ۔ یہ ننھی بچی سکینہ ہے جو حسینؑ کے سینہ پر سوتی تھی، یہ زنجیروں میں جکڑا حسینؑ کا وارث زین العابدینؑ ہے ۔ مختار نے بندھے ہاتھوں سے منھ پر طمانچے لگانا شروع کیے ارے میں زندہ ہوں اور فاطمہؑ کا چمن پامال ہوگیا ۔ رسولؐ کی نواسیاں رسیوں میں جکڑی گئیں ۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ

میں نے خود جا کر اپنی آنکھوں سے وہاں ایک قرآن مجید دیکھا ہے۔ اچھے خاصہ سائز کا قرآن ہے، اس میں پانچ چھ سو صفحات ہوں گے۔ اس قرآن میں صفت یہ ہے کہ پہلے سے لے کر آخری صفحہ تک جس صفحہ پر آپ چاہیں کسی ایک مکمل حرف COMPLETE LETTER کو آپ SELECT کر لیں، چن لیں۔ مثلاً آپ نے 'و' چن لیا۔ اس 'و' پر اگر آپ ایک PIN رکھیں، سوئی رکھیں اور اس پن کو دبانا شروع کریں تو وہ پن سیدھی آخری صفحہ تک جہاں تک چلی جائے گی اس 'و' کے نیچے 'و' ہی 'و' آتے چلے جائیں گے۔ یہ میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ یا مثلاً پہلے صفحہ پر 'ک' کے اوپر ایک سوئی رکھی اور اس کو سیدھا دبایا، آخری صفحہ تک تو اس سوئی کے نیچے سوائے 'ک' کے کوئی دوسرا حرف نہیں آئے گا۔ اگر 'ل' پر رکھ کر دبایا تو وہ سیدھی جہاں تک جائے گی اس کے نیچے 'ل' کے سوا کوئی دوسرا حرف نہیں آئے گا۔

یہ کتابت CALEGRAPHY کا تو کوئی کمال ہے ہی، اس میں کوئی شک نہیں لیکن میں آپ کو دعوت فکر دیتا ہوں ذرا غور کریں کہ اگر قرآن مجید میں حروف ایک نظم SYSTEM سے نہ آئے ہوتے۔ اگر قرآن مجید میں حروف ایک CALCULATION حساب کے اعتبار سے نہ آئے ہوتے تو یہ ممکن ہی نہ تھا کہ یہ فارمولا عمل میں لایا جا سکتا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں اعجاز کے بہت سے پہلو ہیں وہاں ایک عجیب و غریب پہلو یہ ہے کہ اس میں حرف حساب، تناسب اور CALCULATION کے اعتبار سے آئے ہیں۔ قرآن مجید کا یہ شان اس بات کی دلیل ہے کہ

ملنے کا پتہ ✿ عبّاسؑ بُک ایجنسی رستم نگر درگاہ حضرت عباسؑ لکھنؤ

ملنے کا پتہ عباسؑ بُک ایجنسی رستم نگر درگاہ حضرت عباسؑ لکھنؤ

بسمہ سبحانہ



ہمارے مطبوعات

= توبہ — آیۃ اللہ دستغیب شیرازی 15/-

= تربیتِ اولاد — مولانا سید جان علی شاہ کاظمی (پاکستان) 20/-

= اولین مؤذنِ اسلام بلالؓ — سعید عین آبادی 4/-

= قرآن اور سائنس — مولانا ڈاکٹر سید کلب صادق ۔ زیر طبع

= درگاہ حضرت عباسؑ تاریخ کے آئینہ میں ۔ "

= کائناتِ روشن مجموعہ مراثی نواب باقر علی روشن لکھنوی 20/-

○ مجالسِ عظیم ، آقائے شریعت مولانا کلب عابد صاحب مرحوم 25/-

○ جنابِ فضہؓ ، راحت حسین ناصری پاکستان 7/-

○ عرفانِ امامت ، (حالاتِ امام زمانہؑ) زیر طبع ۔

○ تفسیر کربلا ۔ (جواب واقعہ کربلا اور اس کا پس منظر) اک نئے مطالعہ کی روشنی میں 60/-

○ الخلفاء حصہ اول (المرتضیٰ کا مدلل جواب) ق ع کاظمی ۔ 30/-

○ " " حصہ دوم " " زیر طبع

(ر)ہنمایانِ اسلام کا ہندی ترجمہ ۔ سید علی نقی النقوی طاب ثراہ 25/-

ملنے کا پتہ:

عباس بک ایجنسی

درگاہ حضرت عباسؑ، رستم نگر ۔ لکھنؤ نمبر 3

یہ بے بس انسان کا کلام نہیں ہے، اس اللہ کا کلام ہے۔ جو ہر بات پر قدرت رکھتا ہے۔

اب اسی پاک، عجیب، غریب اور معجز نما کتاب میں یہ درج ہے کہ اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین اختیار نہ کرنا ورنہ نرک اٹھاؤ گے۔

برادران عزیز! یہ وہ زمانہ ہے کہ لوگ مذہب کو چھوڑ رہے ہیں، مذہب سے بھاگ رہے ہیں، ایک عام نظریہ ہے کہ آج کے دور میں لوگ مذہب کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ حالانکہ بات یہ نہیں ہے کہ لوگ مذہب کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں بلکہ بات یہ ہے کہ مذہب کو ماننے کے بعد مذہب کی بات بھی ماننا پڑے گی اور مذہب کی بات ماننا ان کے لیے ذرا ناقابل برداشت ہے۔ اس لیے انھوں نے سوچا کہ جڑ ہی اکھاڑ دو۔ جب جڑ ہی نہ رہے گی تو شاخوں کا کیا سوال ہے؟ ظاہر ہے کہ جب کوئی انسان کسی مذہب کو اختیار کرے گا تو اس کے ساتھ ساتھ اس کے کچھ VALUES اقدار بھی آئیں گے اور اس کے مطابق ہم کو زندگی گزارنا پڑے گی۔ تو پھر یہ آزادی جو آج ہم کو حاصل ہے کہاں رہ جائے گی۔ انسان ہمیشہ ذمہ داریوں سے بچنا چاہتا ہے اور اس کے لیے بہانے ڈھونڈا کرتا ہے۔

تو اس نے سب سے پہلا الزام جو مذہب پر لگایا وہ یہ ہے کہ مذہب بہت خطرناک چیز ہے، مذہب کی وجہ سے بڑی خوں ریزیاں ہوئی ہیں، بڑے فسادات ہوئے ہیں، بہت بے گناہ قتل ہوئے ہیں۔ لہٰذا مذہب کو ختم کر دو جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔ چونکہ مذہب کے نام پر جھگڑے ہیں، خوں ریزی ہے،

قتل و غارت ہے، اس لیے مذہب کو چھوڑا تو پھر اصول بن گیا کہ ہر وہ شئے جس کی وجہ سے جھگڑا ہو، خوں ریزی ہو، فساد ہو، اسے چھوڑ دینا چاہیے۔ یہ بات طے ہو گئی۔ اب میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا سیاست POLITICS کا دامن خوں ریزی سے بچا ہوا ہے۔ آج دنیا میں جتنی جنگیں ہو رہی ہیں یہ سب سیاست کی بنا پر ہو رہی ہیں یا مذہب کی بنا پر؟ اگر سیاست کی بنا پر ہو رہی ہیں تو آپ اسے بھی چھوڑ دیجیے۔ لیکن جب آپ WORLD WARS کی تہ میں جا کر دیکھیں گے تو جنگ کا اصل سبب تجارت نظر آئے گی۔ تجارتی مقابلہ آرائی نے اتنی بڑی جنگ کرائی جس میں لاکھوں انسان مارے گئے، کروڑوں زخمی ہوئے۔ لہٰذا تجارت کو بھی چھوڑیے کیونکہ تجارت کے نام پر بھی فساد ہوتا ہے اور خوں ریزی ہوتی ہے۔ ہمارے ہندوستان میں دیکھیے، پاکستان میں بھی دیکھ لیجیے اور ملکوں میں دیکھ لیجیے کہ جہاں زبان پر خوں ریزی ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں کی ریل گاڑیاں شمالی ہندوستان کی جنوبی ہندوستان میں جاتی ہیں اور پلٹ کر آتی ہیں تو اُس کے اوپر عبارت لکھی ہوتی ہے KISS FOR ENGLISH - KICK FOR HINDI ۔ وہاں ہندی انگریزی پر جھگڑا ہو رہا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ کہ زبان بھی چھوڑ کر چپکے بیٹھے رہیے۔ کیونکہ جب آپ بات کریں گے تو کسی نہ کسی زبان میں کریں گے اور زبان پر جھگڑا ہوتا ہے۔ اب آپ CULTURE رسم و رواج کو لے لیجیے، کتنے جھگڑے ہیں جو اس بنا پر ہوا کرتے ہیں۔

اور سنیے برا نہ مانیے گا، عام طور پر گھروں میں بڑا سکون رہتا ہے۔

لیکن جب ایک بارود کی پڑیا آجاتی ہے بیوی کی شکل میں تو سب کچھ درہم برہم ہوتا ہے کہ نہیں ؟ یہ بارود جو پھٹا تو بہن اِدھر گئی بھائی اُدھر گیا، بھانجا اُدھر اُڑ گیا اور بھتیجا اِدھر اور گھر میں یا شوہر ہے یا زوجہ ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ ہر گھر میں فساد کی جڑ ہے بہ قول آپ کے بیوی، لہٰذا پہلے اسے چھوڑیے ۔ بچوں کے جھگڑے بڑوں تک پہنچتے ہیں اس لیے انھیں بھی چھوڑیے ۔ اور آخری بات کہ جب تک آپ دنیا میں ہیں جھگڑوں سے نجات نہیں، لہٰذا بہتر ہے کہ دنیا ہی چھوڑ دیجیے ۔ خس کم جہاں پاک ۔

جب آپ مذہب کو صرف اس لیے چھوڑ رہے ہیں کہ جھگڑا ہوتا ہے مذہب سے، تو ہر وہ شئے، جس سے جھگڑا ہو آپ چھوڑ دیجیے اُسے ۔ پہلے بیوی کو چھوڑیے، بچوں کو چھوڑیے، جائداد کو چھوڑیے، باغوں کو چھوڑیے، تہذیب کو چھوڑیے تمدن کو چھوڑیے، زبان کو چھوڑیے، رسم و رواج کو چھوڑیے، تجارت کو چھوڑیے، سیاست کو چھوڑیے بلکہ دنیا ہی کو چھوڑ دیجیے ۔ تو چلیے مذہب کو بھی چھوڑ دیجیے ۔ مگر یہ مذہب آپ اسی وقت چھوڑ پائیں گے جب نہ خود آپ رہ جائیں نہ آپ کے پاس کوئی بھی چیز رہ جائے ۔ تو جھگڑے کا راز آپ کو سمجھا دوں بھائی نہ مذہب جھگڑا کراتا ہے، نہ سیاست جھگڑا کراتی ہے، نہ تجارت جھگڑا کراتی ہے، نہ رسم و رواج جھگڑا کراتے ہیں، نہ زبان جھگڑا کراتی ہے، نہ جائداد جھگڑا کراتی ہے، نہ بیوی جھگڑا کراتی ہے، ان میں سے کوئی جھگڑا نہیں کراتا بلکہ درحقیقت انسان کی اپنی طبیعت میں فساد ہے ۔ ہر شئے جو اس کو محبوب ہوتی ہے، ہر شئے جو اسے پیاری ہوتی ہے اس پر وہ جھگڑا شروع کر دیتا ہے تو طبیعت کے

فساد کو آپ مٹا دیجیے پھر نہ قوم پر جھگڑا ہو گا، نہ مذہب پر جھگڑا ہو گا، نہ تجارت پر جھگڑا ہو گا، نہ سیاست پر جھگڑا ہو گا، نہ ملک پر جھگڑا ہو گا، نہ جائداد پر جھگڑا ہو گا، کسی بات پر جھگڑا نہیں ہو گا، اگر آپ انسان کی طبیعت سے فساد کو مٹا دیں۔

اور آپ یاد رکھیں کہ انسان کی طبیعت سے اگر فساد کو مٹایا جا سکتا ہے تو صرف اور صرف مذہب کے ذریعہ سے، سچے مذہب کے ذریعہ سے۔ دنیا میں ایسی کوئی طاقت نہیں جو انسان کی طبیعت سے فساد کو مٹا دے۔ آپ دیکھیں کہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ آج انسان چاند پر جا رہا ہے اور ابھی تو پہلی منزل ہے، انسان کو نہ جانے کہاں جانا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ مسلمانوں کی جہالت کا یہ عالم کہ آج امریکنز چاند پر پہنچ گئے اور روس کی سواریاں چاند پر ٹہلتی پھر رہی ہیں اور مسلمانوں کا یہ عالم ہے کہ مجھے بمبئی میں بتایا گیا کہ جب پہلی مرتبہ انسان چاند پر گیا تو وہاں کے مُلّا صاحبان نے یہ فتویٰ دے دیا کہ یہ سب جھوٹ ہے نہ انسان چاند پر گیا نہ انسان چاند پر جا سکتا ہے۔ انسان چاند پر اس لیے نہیں جا سکتا ہے کہ اس چاند کو دیکھنے کے بعد تو ہم رمضان شروع کرتے ہیں اور عید مناتے ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ جب لوگ چاند پر گئے ہوں گے تو انھیں ضروریات زندگی لاحق ہوئی ہوں گی۔ تو خدا کیسے گوارہ کر سکتا ہے کہ جس مقدس شے کو دیکھ کر ہم روزہ رکھتے ہیں اسے گندہ کیا جائے، لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں۔ غرض یہ کہ آج انسان کہاں سے کہاں پہنچ گیا لیکن طبیعت کا فساد اگر مٹ گیا ہوتا تو ہائیڈروجن بم HYDROGEN BOMB نہ ایجاد ہوتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آج کا انسان کتوں کو پالنے کے لیے تیار ہے، بھیڑیوں کو برداشت کرنے کے لیے

تیار، شیروں کو پالنے کے لیے تیار مگر انسان کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ یاد رکھیے، اگر فساد مٹ سکتا ہے تو صرف اور صرف سچے مذہب سے، سچے دین اور سچے دین کی پابندی سے۔ اس لیے کہ دنیا کا ہر مادی سسٹم چھین لینا سکھاتا ہے اور مذہب دے دینا سکھاتا ہے۔ جھگڑا ہمیشہ چھین لینے پر ہوتا ہے دے دینے پر نہیں۔ دنیا سے جھگڑا اس وقت تک نہ مٹے گا جب تک انسانی کردار میں ایثار و قربانی راسخ نہ ہو جائے اور ایثار و قربانی سچے مذہب ہی کے ذریعہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ پُرامن زندگی گزارنا ہے تو مذہب کو اختیار ہی کرنا پڑے گا۔

مگر مشکل یہ ہے کہ مسئلہ اب بھی حل نہ ہوا۔ اس لیے کہ جب میں نے لامذہب افراد کو مذہب کی ضرورت کا احساس دلایا اور ان کو گھیر کے لے آیا کہ آپ کو مذہب کو ماننا ہی پڑے گا، اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تو معاملہ بجائے حل ہونے کے اور پیچیدہ ہو گیا۔ اس لیے کہ ایک انسان جو لامذہب تھا، کسی مذہب کو نہیں مانتا تھا، اس نے کہا چلیے ٹھیک ہے، ہم مذہب کو مانیں گے مگر بتائیے کون سے مذہب کو مانیں؟ عیسائیوں سے پوچھا، انھوں نے کہا کہ عیسائی ہو جائیے گا تبھی آپ کو نجات ملے گی ورنہ نہیں۔ ہندوؤں سے پوچھا انھوں نے کہا ہندو ہوئیے گا تبھی آپ کو مُکتی مل سکتی ہے ورنہ نہیں۔ مسلمانوں سے پوچھا انھوں نے کہا جنّت چاہتے ہیں تو مسلمان ہوئیے۔ لیجیے پھر جھگڑا شروع۔

مگر میں آپ کے سامنے ایک اصول کی بات کہنا چاہتا ہوں کہ جتنے بھی

دنیا میں مذاہب پائے جاتے ہیں جب ان سے پوچھیے گا کہ آپ کا ULTIMATE GOAL کیا ہے تو وہ یہی کہیں گے کہ ہمارا GOAL یہ ہے کہ انسان کو ہم خدا تک پہنچا دیں۔ ہندوؤں سے پوچھیے وہ بھی یہی کہیں گے، عیسائیوں سے پوچھیے وہ بھی یہی کہیں گے۔ مسلمان، ان کا بھی یہی کہنا ہے تو ہر مذہب کا ULTIMATE GOAL یہی ہے کہ انسان کو خدا تک پہنچا دیا جائے۔ ہندو، انھوں نے کہا ہم آپ کو خدا تک پہنچائیں گے، عیسائی، انھوں نے کہا ہم خدا تک پہنچائیں گے۔ مسلمان، انھوں نے کہا ہم خدا تک پہنچائیں گے۔ تو ہر مذہب ہم کو خدا تک پہنچانے والا ہے۔

مجھے کسی سے جھگڑا نہیں کرنا۔ مگر بس ایک بات آپ سے کہنا چاہتا ہوں ایک مثال کے ذریعہ۔ فرض کیجیے میں نے ہندوستان کے کسی ایک شہر میں مجلس پڑھنے کے بعد مجھے فرض کریں دہلی جانا تھا، مجھے معلوم نہیں تھا ہندوستان میں کون کون سی سواریاں ایجاد ہو چکی ہیں۔ مجلس ختم ہونے کے بعد میں نے اعلان کیا کہ میں جلد سے جلد دہلی جانا چاہتا ہوں، آپ میں سے جس کے پاس جو سواری ہو وہ مجھے کل صبح کو پہنچا دے۔ صبح ہوئی گھنٹی بجی، میں نے دیکھا کہ دروازے پہ ایک صاحب کھڑے ہیں انھوں نے کہا "حضور! کل آپ نے کہا تھا کہ جس کے پاس جو سواری ہو وہ مجھے دے دے دہلی جانے کے لیے۔ یہ سواری حاضر ہے" یہ کہہ کر انھوں نے ایک گدھے کا کان پکڑ کر میرے سامنے کر دیا۔ حضور، آپ اس پر بیٹھیں اور دہلی چلے جائیں۔ میں گھر کے اندر گیا، پھر گھنٹی بجی۔ اب باہر نکلا تو ایک اور صاحب، انھوں نے کہا آپ نے

اعلان کیا تھا کہ سواری چاہیے تو حضور، یہ سواری حاضر ہے۔ انھوں نے بیل گاڑی حاضر کر دی اور کہا اس پر بیٹھیے اور دہلی چلے جائیے۔ اب ذرا انصاف سے بتائیے کہ اگر میں گدھے پر بیٹھ کر دہلی کے لیے روانہ ہو جاؤں تو کیا دہلی نہیں پہنچوں گا؟ ضرور پہنچوں گا مہینہ سوا مہینہ میں جب اس گدھے کا دل چاہے گا پہنچا دے گا. اور بیل گاڑی پر بیٹھ کر اگر میں جاؤں تو بھی پہنچ جاؤں گا دو مہینے تین مہینے جتنے بھی لگیں۔ ایک صاحب کہنے لگے "میرے پاس موٹر سائیکل ہے" ایک اور صاحب آئے، وہ کار لیے کھڑے تھے۔ ایک صاحب ریل کا ٹکٹ لیے ہوئے تھے، یہ ٹکٹ حاضر ہے۔ ایک اور صاحب آئے وہ ہوائی جہاز کا ٹکٹ لیے۔ "حضور، یہ لیجیے چالیس منٹ میں دہلی پہنچ جائیے گا۔

اب آپ یہ بتائیں کہ وہ گدھا دہلی نہیں پہنچائے گا؟ وہ بیل گاڑی دہلی نہیں پہنچائے گی؟ ضرور پہنچائے گی؛ وہ کار دہلی نہیں پہنچائے گی؟ ضرور پہنچائے گی۔ وہ ریل دہلی نہیں پہنچائے گی؟ ضرور پہنچائے گی۔ وہ ہوائی جہاز دہلی نہیں پہنچائے گا؟ ضرور پہنچائے گا۔ اب بتائیے کہ جب یہ سارے وسائل میرے پاس موجود ہیں، تو بتائیے میں اس میں سے کس کو چنوں؟ اگر گدھا ہوں گا تو گدھے پر سوار ہو جاؤں گا۔ اگر میرا ذہن بیل کی طرح ہو گا تو بیل گاڑی پسند کروں گا۔ لیکن اگر روشن خیال ہوں تو نہ کار دیکھوں گا نہ ریل کو، ہوائی جہاز کا ٹکٹ لوں گا اور چالیس منٹ میں دہلی پہنچ جاؤں گا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب مختلف وسائل موجود ہوں انسان کو اس کی منزل تک پہنچا دینے والے مگر اس میں کچھ سُست ہوں، کچھ تیز ہوں، تو

ہمیشہ ایک ذہین انسان تیز ترین وسیلے کو اختیار کرتا ہے، قبول کرتا ہے اور سُست کو چھوڑ دیا کرتا ہے۔ تو عزیزوں بات طے ہوگئی۔ مجھے کسی سے جھگڑنا ہے نہ کسی مذہب پر نکتہ چینی کرنا ہے۔ ہر مذہب وہ وسیلہ ہے جس کے ذریعہ یہ دنیائے انسانیت خدا تک پہنچ سکتی ہے۔ مگر اس بیسویں صدی کی تیز رفتار دنیا میں ہم کو وسیلہ ایسا چاہیے کہ جو یہاں سے جائے بھی وہاں پہنچ بھی جائے پلٹ کر آ بھی جائے اور زنجیر در ہلتی رہے اور بستر گرم رہے۔

اب جب میں اسے اسلام تک لے کر آگیا تو نیا جھگڑا شروع ہوگیا، سُنّی کہتے ہیں سُنّی ہو جاؤ۔ شیعہ کہتے ہیں شیعہ ہو جاؤ۔ حنفی کہتے ہیں ہمارے ساتھ آجاؤ اور اسلام کے تو بہتّر ٹکڑے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ کسی کو نہ مانو۔ وہ مانو جو ہر مسلمان کہتا ہے۔ ہر مسلمان ہر نماز میں دس مرتبہ کیا کہتا ہے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ہم کو صراط مستقیم کی ہدایت دے۔ میں نے پوچھا صراطِ مستقیم دنیا میں کہاں ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ آخرت کے صراط سے دنیا کی صراطِ مستقیم سمجھ لو۔ میں نے کہا کہ 'صراط' آخرت میں کیا؟ انھوں نے کہا کہ وہ پل ہے جس سے سارے انسانوں کو گزرنا ہوگا۔ وہ جہنم کے اوپر بنا ہوا ہے۔ تو میں نے کہا کہ وہ کافی چوڑا ہوگا، کیونکہ اس پر سے کھربوں انسانوں کو گزرنا ہے۔ انھوں نے کہا، کیسی باتیں کرتے ہیں۔ جناب وہ تو بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز دھار۔ اس پر تو قدم رکھنا بھی دشوار ہوگا۔ مگر یہ مثال ہے کہ جب دنیا کی صراط مستقیم پر تم گامزن ہو سکوگے، تب اس صراط مستقیم پر چلنے کی تمھیں مہارت پیدا ہوگی۔ یعنی دنیا

ہیں۔ جو تمھاری زندگی ہے یہ بھی بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے۔ ذرا سا تمھارا توازن بگڑا اور تم اسلام سے خارج۔

اب سوال یہ ہے کہ جب راستہ اتنا باریک ہے تو اس پر چلا کیسے جائے گا تو ایک مثال پیش ہے کہ ایک کھلونا، بچپن میں میرے سامنے رکھا گیا ٹین کا آدمی یا بوا، اور اس کے ساتھ ایک ٹین کا اسٹینڈ تھا مونڈھے کا ایسا۔ وہ بوا اوپر سے انسان کی طرح تھا لیکن نیچے سے اس کے پیر نہیں تھے بلکہ صرف ایک باریک نوک تھی۔ ہم سے کہا گیا کہ ہم تمھاری ذہانت کے جب قائل ہوں گے جب تم اس بوے کو اس اسٹینڈ پر ٹکا دو۔ اب جناب جب کوشش کی وہ گر گیا۔ جب ایک نوک ہے اور ٹانگیں ہیں ہی نہیں تو وہ کیسے ٹکے؟ کبھی اِدھر گر گیا کبھی اُدھر گر گیا۔ تو ہم نے سوچا کیا کیا جائے۔ دیکھا تو اس کے ہاتھ اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے اور دو لکڑی کے گیند دور لا کر رکھ دیے گئے تھے۔ ہم نے سوچا ہو نہ ہو یہ لکڑی کے گیندوں کا ہی کوئی کرشمہ ہو گا۔ ہم نے اس کے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک گیند تھما دیا اور اب یہ دو برابر کے وزن دے کر جو اس کو کھڑا کیا تو وہ سیدھا کھڑا ہو گیا اسٹینڈ پر اور یوں کہ پہلے ٹکتا نہ تھا، اب گرتا نہیں۔ تو اس کا مطلب یہ کہ اگر کسی باریک راستہ پر ہم کو توازن برقرار رکھنا ہو تو سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ ہمارے دونوں ہاتھوں میں دو برابر کے وزن ہوں۔

اب یاد کیجیے حدیث ثقلین کہ رسولؐ نے دنیا سے جاتے جاتے فرمایا کہ میں تو جا رہا ہوں مگر صراطِ مستقیم پہ توازن برقرار رکھنے کے لیے دو برابر کے

وزن دے کر جا رہا ہوں، قرآن اور آل کی شکل میں۔ جب تک ان دونوں کو، ان دونوں کو تھامے رہو گے صراط پر گامزن رہو گے۔ خدا کا رسولؐ گیا ہے دنیا سے تو دو چیزیں چھوڑ کے گیا ہے، قرآن اور اہل بیتؑ۔ اب اگر کسی کے دماغ میں یہ خناس آگیا کہ صرف قرآن ہمارے لیے کافی ہے، اہل بیتؑ کی ضرورت نہیں، تو توازن ختم۔ اور کسی کے ذہن میں یہ خناس آگیا کہ اہل بیتؑ کافی ہیں ہمارے لیے، قرآن کی ضرورت نہیں تو بھی توازن ختم۔ تو نجات اس وقت انسان کو مل سکتی ہے کہ جب نہ اہل بیتؑ کو کافی سمجھے نہ قرآن کو۔ نجات اس وقت مل سکتی ہے کہ قرآن اور اہل بیتؑ دونوں کا دامن تھامے رہے۔

مگر یاد رکھنے کی بات ہے کہ یہ نہیں کہا ہے کہ تم ان کے قصیدے کہتے رہو گے تو گمراہ نہیں ہو گے۔ کہا یہ ہے کہ جب تک تم ان دونوں سے لپٹے رہو گے، چمٹے رہو گے گمراہ نہیں ہو گے۔ یاد رکھیے تمسک دوسری شے ہے اور تعریف دوسری چیز ہے۔ مثال کے طور پر میں نے ٹوکیو میں ایک نہایت خوبصورت اور تیز رفتار ٹرین دیکھی جو بلٹ ٹرین کہلاتی ہے۔ دور سے میں نے اسے دیکھا، واقعی خوبصورت تھی۔ میں اس کی تعریف کر رہا ہوں، قصیدے پڑھ رہا ہوں کیا خوبصورت تھی یہ ریل، کیا رفتار تھی اس کی۔ وہ گاڑی جا رہی تھی 'اوساکا'، تو کیا تعریف کرنے سے میں 'اوساکا' پہنچ سکتا ہوں۔ جی نہیں، 'اوساکا' اس وقت پہنچوں گا جب میں اس گاڑی پر سوار ہو جاؤں۔ اور گاڑی پر سوار ہونے کی یہ پہچان ہے کہ گاڑی چلے گی پٹری کے اوپر میں ہوں گا گاڑی پر، جدھر پٹری مڑے گی ادھر گاڑی بھی مڑے گی جدھر گاڑی مڑے گی میں بھی

مڑوں گا جدھر گاڑی نہیں مڑے گی میں بھی نہیں مڑوں گا۔ گاڑی سیدھی چلے گی میں سیدھا چلوں گا، گاڑی گھوم جائے گی میں بھی گھوم جاؤں گا۔ گاڑی کی جتنی رفتار تیز ہو گی اتنی رفتار میری بھی تیز ہو گی۔ گاڑی جہاں پر رک جائے گی وہاں پر میں بھی رک جاؤں گا۔ یہ ہوتا ہے تمسک کہ ہمارا ہر سکون، ہماری ہر حرکت، ہماری ہر سمت اس گاڑی کے تابع ہو گی۔ تو اگر حضورؐ نے فرمایا کہ قرآن اور اہل بیتؑ سے تمسک کرو تو اس کے معنی یہ نہیں کہ آپ خالی تعریفیں کرتے رہیں بلکہ تمسک کے معنی یہ ہیں کہ جہاں قرآن چلے، جہاں اہل بیتؑ چلیں، وہاں آپ چلیں جہاں رکیں وہاں رکیں جہاں مڑیں وہاں مڑیں جب آپ کی سمت ایک ہو گی رفتار ایک ہو گی، مڑنا اور ٹھہرنا ایک ہو گا تب آپ وہیں پہنچیں گے جہاں اہل بیتؑ پہنچیں گے، جہاں قرآن پہنچے گا۔

اس لیے جو بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی اب وہ آنے لگی۔ ائمہ طاہرینؑ نے یہ نہیں ارشاد فرمایا کہ تم جنّت میں ہو گے، بلکہ فرمایا کَانَ مَعَنَا فِی دَرَجَتِنَا جو ہمارے احکام پر چلے گا، ہماری تعلیمات پر چلے گا وہ جنّت ہی میں نہیں ہو گا بلکہ جنت میں ہمارے درجہ میں ہمارے ساتھ ہو گا۔ ہم یہ بات سنتے ہیں اور بڑے غور سے سنتے ہیں ارے بھائی ہم لاکھ ان کی پیروی لاکھ ان کی اطاعت کریں کہاں ہم کہاں وہ اُن کے دامن پر کوئی گناہ نہیں ہمارا دامن گناہوں سے بھرا ہوا ہے، کیسے ہو گا؟ وہ کبھی غلطی کرتے نہیں ہم ہمیشہ غلطی کرتے رہتے ہیں اور اگر غلطی نہ کرتے ہوتے تو ہماری آوازیں وہاں کیوں نہ پہنچتیں اور ہم کو وہاں سے جواب کیوں نہ ملتا۔ بھئی دیکھیے ظاہر

ہے کہ میں اپنے ہی ملک کا ذکر کیا کرتا ہوں کسی دوسرے ملک کا ذکر کروں گا تو لوگ برا مان سکتے ہیں۔ نماز ہم آپ پڑھتے ہیں یہ کیا ہے، ٹیلی فون اس آلہ کا کام ہے، اس مشین کا کام ہے جو بندہ کو بندہ سے ملاتا ہے اور نماز اس مشین کو کہتے ہیں جو بندہ کو خدا سے ملاتی ہے۔ وہ بندہ کا رابطہ بندہ سے قائم کرتا ہے یہ بندہ کا رابطہ خدا سے قائم کرتی ہے۔ خدا شاہد ہے، کہ مجھے شرم کتنی آتی ہے اپنے ملک کے یہ حالات بیان کرنے سے۔ مگر منبر پہ آپ کے سامنے بیٹھ کر کہہ رہا ہوں کہ مثلاً لکھنؤ میں اگر کہیں ٹیلی فون موجود ہے تو اسے دیکھ کر کہیں آپ اس غلط فہمی میں نہ پڑ جائیں کہ آپ اس سے بات بھی کر سکتے ہیں۔ ڈایل میں آپ کی انگلی گھس جائے گی، مگر اول تو انشاء اللہ لائن ہی نہیں ملے گی اور اگر ملی بھی تو مثلاً ملا رہے ہوں گے کلب صادق کو، اور لائن مل جائے گی بھگوان داس کی۔ ملا رہے ہوں گے کسی سے مل جائے گی کسی سے۔ میں آپ کے سامنے یہ بھی عرض کیے دیتا ہوں بھائی صاحب! بہت سے لوگوں کو شکایت ہو جاتی ہے کہ صاحب "میں نے تو واشنگٹن سے اس مشکل سے لائن ملائی اور آپ کے یہاں ٹیلی فون بجتا رہا، کسی نے اٹھایا ہی نہیں"۔ اماں وہ ٹیلی فون کہاں بج رہا ہے! آپ کو سنائی دے رہا ہے کہ بج رہا ہے وہاں، وہ چپکا بیٹھا ہوا ہے، سو رہا ہے۔ یہاں یہ سب نہیں ہوتا، کیا مجال جو غلط لائن مل جائے، کیا مجال کہ گھنٹی کا غلط سگنل آپ کو سنائی دے۔ مگر وہاں یہ سب ہوتا ہے۔ کیوں؟ یا ٹیلی فون سیٹ میں خرابی ہوتی ہے یا ایکسچینج میں، جو آپ کی لائن دوسرے سے ملاتا ہے جو رابطہ کا وسیلہ ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ رابطہ قائم کرنے

کے لیے مشین کا صحیح ہونا بھی ضروری ہے اور وسیلہ کا بھی بے عیب ہونا لازمی ہے۔

نماز اسی طرح بندہ کو خدا سے ملاتی ہے۔ وضو کیا، قبلہ رو کھڑے ہوئے نیت کی، تکبیرۃ الاحرام کے لیے ہاتھ نہیں اٹھائے بلکہ گویا مشین کا ماؤتھ پیس اٹھایا۔ اللہ اکبر کہہ کر ڈایلنگ شروع کی، آیتیں پڑھتے گئے، نمبر ملتے گئے۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ؕ تک پہنچے تھے کہ ڈایلنگ مکمل ہوگئی۔ اب براہ راست بات کرنا شروع کر دی۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ مالک ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے ہر مشکل میں ہر مسئلے میں مدد کے طلب گار ہیں۔ مگر مالک سے یہ گفتگو وہیں ہوگی جہاں سب کچھ ٹھیک ہو۔ اور اگر کہیں کچھ گڑ بڑ ہے، تو اللہ اکبر کہا ہی تھا کہ لائن کہیں اور اُلجھی ہوئی محسوس ہوئی۔ بات کرنا چاہتے ہیں معبود سے، آواز آنے لگی بیوی کی۔ ترکاری والے کی، نوٹوں کی سرسراہٹ کی، سکّوں کی کھنکھناہٹ کی۔ لیجیے معبود سے گفتگو کے بجائے حساب کتاب شروع ہوگیا۔ پڑھیے تاریخ اسلام کو، یہ سب افسانہ نہیں حقیقتیں ہیں ایسی نماز میں اگر جوں نے بھی کاٹا تو اس کا بھی احساس ہوگیا اور نماز کے ساتھ ساتھ جوں کی قربانی بھی پیش کر دی گئی۔ مگر اسی نماز کے پہلو بہ پہلو ایک نمازی وہ بھی ملے گا کہ معبود سے راز و نیاز میں محو ہوا، یوں کھو گیا کہ پاؤں میں چبھا تیر نکال لیا گیا اور نمازی کو خبر بھی نہ ہوئی۔

بہر حال بات یہاں سے نکلی تھی کہ معصوم نے یہ کیسے فرمایا کہ ان کے سچے چاہنے والے صرف جنت ہی میں نہ ہوں گے بلکہ جنت کے اسی درجہ میں

ہوں گے جہاں وہ تشریف فرما ہوں گے۔ واقعی یہ بات حلق سے نہیں اترتی۔ کہاں وہ کہاں ہم، وہ پاک ہم نجس۔ وہ بلند ہم پست۔ وہ معصوم ہم خطا کار۔ رحیم وکریم ہمارے گناہ بھی معاف کردے تو زاید سے زاید یہ کہ ہماری نجات ہو جائے گی۔ مگر ہم اور اہل بیتؑ کے درجہ میں پہنچیں؟ یہ کیسے ہوگا۔

میں عرض کر چکا کہ حدیث ثقلین نے ہمیں حکم دیا کہ ہم ان سے تمسک کریں، یعنی انھیں کے ہو رہیں، انھیں کے دامن سے لپٹ جائیں۔ اب تمسک میں کیا ہوتا ہے؟ یہ اگر دیکھنا ہے تو آئیے پھر آپ کو غریب ہندوستان لے چلوں، وہ میرا ملک ہے وہیں کی مثال دے سکتا ہوں۔

آئیے آپ ہندوستان کسی مغربی ایرلائن سے۔ صاف شفاف۔ دہلی اترے، وہاں سے لکھنؤ کے لیے انڈین ایرلائنس کا جہاز لیا۔ جہاز کا دروازہ بند ہوا تو آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ میزبانی کے لیے ایر ہوسٹس کے ساتھ مکھیاں بھی دو چار موجود ہیں۔ ایک مکھی آکر آپ کے کاندھے پر محبت سے بیٹھ گئی۔ جہاز روانہ ہوا، وہ نہ ہٹی۔ ۴۵ منٹ آپ کے کاندھے پر چپکی رہی۔ آپ لکھنؤ پہنچے، وہ ساتھ ساتھ رہی۔ آپ ٹیکسی پر سوار ہوئے، اس نے ساتھ نہ چھوڑا۔ آپ گھر تک آگئے وہ ساتھ ساتھ رہی۔ حضور وہ گندی آپ صاف شفاف، آپ کی غذا گندی، کہاں آپ کہاں وہ۔ لیکن یہ مکھی، گندی مکھی لپٹی رہی آپ سے تو پھر یہ نہیں ہو سکتا آپ اپنے گھر پہنچیں اور وہ کہیں اور پہنچ جائے جس گھر میں آپ داخل ہوں گے وہیں وہ بھی داخل ہوگی۔

اپنے گناہوں کو نہ دیکھیں، سیاہ نامہ عمل کو نہ دیکھیں، بس لپٹ

جائیں ان کے دامن سے، جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب ان کے ساتھ ساتھ رہیں۔ تو یقین کریں پھر یہ بھی ایسے کریم ہیں کہ آپ کو دھتکار نہ دیں گے۔ آپ دنیا میں ان کے ساتھ رہیں گے تو یہ آخرت میں آپ کو اپنے درجہ تک بلا لیں گے۔

بس برادران عزیز! اسی حدیث ثقلین میں رسولؐ نے یہ بھی فرمادیا تھا کہ اہل بیتؑ و قرآن میں قیامت تک جدائی نہ ہوگی اور اہل بیتؑ نے خود بھی دکھادیا کہ ہم میں اور قرآن میں جدائی نہیں ہو سکتی۔ جہاں ہم رہیں گے وہاں قرآن رہے گا جہاں قرآن رہے گا وہاں ہم رہیں گے۔ یہاں تک کہ اہل بیتؑ نے تو یہ بھی دکھادیا کہ ہمارے سر و تن میں جدائی ہو سکتی ہے مگر ہم میں اور قرآن میں جدائی نہیں ہو سکتی۔ حسینؑ کا تن ہے کربلا کے میدان میں اور سر ہے نوک نیزہ پر کوفہ میں۔ پچاس ساٹھ میل کا فاصلہ تن اور سر میں، مگر قرآن اور حسینؑ میں ایک انچ کا بھی فاصلہ نہیں۔ اس لیے کہ نوک نیزہ پر بھی حسینؑ قرآن ہی کی تلاوت کر رہے ہیں۔

عزاداران حسینؑ! آج محرم کی دوسری شب ہے۔ یعنی کل دوسری تاریخ ہے اور تاریخ کی مناسبت سے مجھے آپ کی خدمت میں مصائب کے کچھ جملے عرض کرنا ہیں۔ آپ سب مسافرت کے عالم میں ہیں اور میں بھی مسافرت کے عالم میں ہوں۔ مگر دنیا میں کوئی مسافر ایسا نہیں جیسا حسینؑ کا ایلچی مسلم بن عقیل۔ عزاداران حسینؑ! حسینؑ بھی مسافر تھے، عباسؑ بھی مسافر تھے، علی اکبر بھی مسافر تھے، عونؑ و محمدؑ بھی مسافرت میں تھے۔ لیکن مسافرت و غربت کے ماحول میں اگر چند ساتھی بھی ہوں تو غربت کا احساس کم ہوتا ہے۔ علی اکبر

کربلا میں تنہا نہیں، عباسؑ کربلا میں تنہا نہیں، عونؑ و محمدؑ کربلا میں تنہا نہیں، پورا قافلہ ہے۔ مگر ذرا جناب مسلم کی غربت کو دیکھے کہ تنہائی ہی تنہائی۔ کوئی بات کرنے والا نہیں، کوئی بات سننے والا نہیں۔

جناب مسلمؑ کے مرتبہ کو آپ کم نہ سمجھیں، امام کا وہ خط جو آپ نے اہل کوفہ کے نام لکھا ہے اس میں آپ نے تحریر فرمایا کہ "اہل کوفہ میں تمھارے پاس ایسے شخص کو بھیج رہا ہوں جو ثِقَتِی مِنْ اَھْلِ بَیْتِی جو میرے اہل بیتؑ میں شامل ہے اور جو میرا معتمد علیہ ہے، جس پر میں اعتماد کرتا ہوں"۔ اس کا مطلب یہ کہ جناب مسلمؑ امام نہیں ہیں مگر ایسے ہیں جن پر امامت کو اعتماد ہے۔

آ گئے، مسلم کوفہ میں اٹھارہ ہزار آدمیوں نے بیعت کر لی۔ اب وقت اگر تھوڑا بہت بچا ہوتا تو اس بات کو میں آپ کے سامنے نسبتاً تفصیل سے عرض کرتا کہ میرا اپنا نظریہ تو یہ ہے جو پہنچ رہا ہوں وہ یہی ہے اور خدا کرے کہ صحیح ہو کہ اٹھارہ ہزار بیعت کرنے والے خالی دھوکے کے لیے بیعت کر رہے تھے مسلمؑ سے۔ ہر چیز پہلے سے PREPLANNED تھی، ہر سازش پہلے سے طے شدہ تھی، کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ مسلمؑ نے جب نماز شروع کی ہے تو اٹھارہ ہزار آدمی ساتھ میں تھے۔ (صاحبان فکر ہمارے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں) اور جب نماز ختم کی تو ایک بھی نہ تھا۔

آپ انصاف سے بتائیے کہ جہاں نماز ہو رہی ہو اور کوئی PANIC پھیل جائے، خدانخواستہ کوئی بری خبر آجائے، کہ مثلاً پولیس آرہی ہے پکڑنے کے لیے، لوگ گھبراہٹ کا شکار ہو کر بھاگنے پر تیار ہو جائیں تو ایک کھلبلی مچے گی کہ

نہیں ؟ تو مثلاً میں نماز پڑھانے والا مجھے فوراً احساس ہو گا کہ پیچھے کچھ گڑبڑ ہو رہی ہے اور اگر پورا مجمع چپکے سے ایک ساتھ نکل جائے مجھے چھوڑ کے۔ تو یہ اس بات کی دلیل ہو گی کہ مجھے ذلیل کرنے کے لیے یہ سازش کی گئی تھی کہ میرے پیچھے نماز پڑھنے کے لیے سب کھڑے ہوں گے جب وقت معین آئے گا تو سب چپکے سے چلے جائیں گے۔ تو اٹھارہ ہزار آدمیوں کا مسلمؑ کو تنہا چھوڑ کر چلا جانا اور کسی PANIC کا نہ پھیلنا اس بات کی دلیل ہے کہ جو کچھ ہو رہا تھا وہ سازش کے تحت ہو رہا تھا۔

بہر حال مسلمؑ تنہا ہیں، اب کوئی مسلمؑ کے سلام کا جواب دینے والا بھی نہیں۔ گھومتے پھر رہے ہیں ادھر سے اُدھر، یہاں تک کہ پیاس کا غلبہ ہوا تھک گئے مسلمؑ۔ ایک دروازے پر بیٹھ گئے۔ دروازہ کھُلا ایک محترم عورت طوعہ باہر نکلی۔ اس نے کہا حالات بہت خراب ہیں، میرے دروازے پر نہ بیٹھو۔ کہا مجھے پیاس لگی ہے۔ اللہ اکبر، یہ کوفہ تھا کہ بلا نہ تھی۔ مومنہ گئی اندر پانی لے کر آئی پی لیا پانی۔ کہا اب جائیے۔ کہا کہاں جاؤں ؟ کہا اپنے گھر جائیے اور کہاں کہا اپنے گھر وہ جائے جس کا کوئی گھر ہو، میں کہاں جاؤں ؟ کہا آپ کون ہیں؟ کہا میں عقیل کا فرزند، حسینؑ کا ایلچی مسلمؑ۔ مومنہ حسینؑ کی چاہنے والی تھی، آقا آپ پر یہ بے کسی، آپ پر یہ وقت! دروازہ کھولا، آئیے۔ ایک حجرہ میں ٹھہرایا۔

حضرت مسلمؑ اس مومنہ کے مہمان ہوئے۔ رات کو لیٹے ہیں اپنے حجرہ میں، آرام کر رہے ہیں کہ خواب میں دیکھا کہ علیؑ تشریف لائے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ مسلم گھبرانا نہیں، بس کل شام سے پہلے پہلے تم ہمارے پاس

آجاؤ گے۔ سمجھ گئے کہ شہادت کی خبر ہے۔ تفصیلات میں واقعہ کی نہیں جاتا ہے۔ ابن زیادؑ کو خبر ہو گئی، مومنہ کے فاش بیٹے کے ذریعہ کہ مسلمؑ اس گھر میں ہیں۔ روایت بتاتی ہے کہ ابھی پو صبح کی پھٹی نہ تھی، اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مسلمؑ تو جاگ ہی رہے تھے، نمازوں میں عبادت میں مشغول تھے کہ ایک مرتبہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز مسلم کے کانوں میں پڑی اور مسلم جلدی سے کھڑے ہو گئے۔ طوعہ سے کہا طوعہ جلدی بڑھ، طوعہ دوڑتی ہوئی آئی۔ کہا کیا بات ہے کہا جلدی سے میرے ہتھیار لا۔ کہا ہتھیار کیا کیجیے گا اس اندھیرے منھ، کہا تو نے نہیں سنا مگر میں نے سُن لیا کہ لشکر آرہا ہے۔ گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز آرہی ہے۔ کہا مولا پھر میرے گھر میں رہ کر دفاع کیجیے، یہ ایک طرح سے چھوٹا سا قلعہ ہے۔ کہا میں یہ کر سکتا۔ سنیے جواب مسلم کا۔ کہا میں یہ کرتا، میری حفاظت اسی میں تھی لیکن مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے تیرے گھر میں رہ کر جہاد کیا تو ایسا نہ ہو کہ سپاہی تیرے گھر میں گھس آئیں۔ تو میری غیرت یہ گوارہ نہیں کرتی کہ ایک پردہ دار عورت کے گھر میں دشمن کے سپاہی گھس آئیں۔ میں کہتا ہوں مسلمؑ تم کو طوعہؒ کی پردہ داری کا اتنا خیال ہے! ذرا آکر زینبؑ کے خیموں کو بعد عصر عاشور دیکھو کہ اشقیار درانہ خیموں کے اندر گھس رہے ہیں اور کوئی بچانے والا نہیں۔

عزادارانِ حسینؑ! حضرت مسلم گھر سے باہر نکلے اور کوفہ کی گلیوں میں جنگ چھڑ گئی۔ اب میں تفصیل آپ کے سامنے کیا پیش کروں کہ مسلمؑ نے کس ماحول میں جنگ کی؟ سامنے لشکر، پس پشت لشکر، کوٹھوں کی چھتوں پر لشکر،

تیر برس رہے ہیں، تلواریں چل رہی ہیں، نیزے برس رہے ہیں، جن کو کچھ نہیں مل رہا ہے وہ کوٹھوں کی چھتوں سے پتھر مار رہے ہیں۔ کوٹھوں سے آگ کے انگارے پھینک رہے ہیں۔ دیکھیے بات ثابت ہو گئی نا! جو کہ میں نے پہلے کہا تھا کہ سب PREPLANNED تھا ورنہ یہ ایک دم کوفہ کی ساری آبادی مخالف کیسے ہو سکتی تھی۔ اس کا مطلب یہ کہ سب سوچی سمجھی بات تھی۔

بہر حال مسلم لڑتے چلے جا رہے ہیں اور خدا کی قسم مسلمؑ کی شجاعت کا جو نقشہ تاریخ نے پیش کیا ہے۔ تاریخ بشر میں نے وہ نقشہ نہیں دیکھا۔ ان کی شجاعت کا عالم یہ تھا کہ آگے بڑھتے تھے اور سوار کی کمر پکڑ کے اُچھال دیتے تھے وہ سوار چھتوں سے اونچا نکل جاتا تھا اور جب وہاں سے گرتا تھا تو تلوار کی دھار پر روک لیتے تھے۔ پانچ سو سوار لے کر آیا تھا محمد بن اشعث۔ اس نے کہلوایا ابن زیاد سے کہ اور بھیج۔ وہاں سے پانچ سو کی اور مدد آگئی۔ وہ بھی کٹنے لگی تو کہا اور بھیج۔ ابن زیاد نے کہلوایا، ایک تلوار تم کو ایسا پاگل بنائے دے رہی ہے، ابھی تو نا معلوم کتنی تلواروں کا سامنا کرنا ہو گا۔ محمد بن اشعث نے کہا ابن زیاد! کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ ہم کو کسی معمولی انسان سے لڑنے بھیجا ہے، کسی بنیے بقال سے لڑنے کو بھیجا ہے۔ ارے یہ بنی ہاشم کی تلوار ہے۔

آخر محمد بن اشعث کو یقین ہو گیا ہم یوں مسلم پر غلبہ نہ پا سکیں گے۔ لہٰذا چال بازی سے کام لیا گیا کہ ایک گڑھا کھود دیا گیا۔ گڑھے کو جلدی جلدی خس پوش کر دیا گیا۔ لشکر پیچھے ہٹا مسلمؑ جوشِ شجاعت میں آگے بڑھتے رہے، خبر نہ تھی کہ آگے خندق کھدی ہے۔ خندق میں گرے۔ اب جب خندق کے اندر

گر گئے تو بے بس ہو گئے۔ لوگ آگے بڑھے اور آگے بڑھنے کے بعد مسلمؑ کو رسیوں سے جکڑ لیا اور ایک گھوڑے پر بٹھا کر لے کے چلے۔ تو ابن اشعث کا بیان ہے خود، کہ جب میں نے مسلمؑ کو اسیر کر کے گھوڑے پر بٹھایا تو ایک مرتبہ مسلمؑ نے رونا شروع کیا تو کہتا ہے کہ میں نے کہا مسلمؑ جو اتنی بڑی مہم کو لے کر چلا ہو وہ گرفتار ہو جائے اور موت نظروں کے سامنے آئے تو رونے لگے۔ کہا محمد بن اشعث کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ میں اپنی زندگی کے لیے رو رہا ہوں؟ کہا پھر کیوں رو رہے ہو؟ کہا میں اپنے لیے نہیں رو رہا ہوں، میں تو حسینؑ کو لکھ چکا ہوں کہ کوفہ کے حالات سازگار ہیں، آپ چلے آئیے۔ اے محمد بن اشعث حسینؑ تنہا نہیں ہیں حسینؑ کے ساتھ عورتیں بھی ہیں، حسینؑ کے ساتھ بے کس بچے بھی ہیں۔ مجھے ان کی زندگی کا خطرہ ہے۔ مسلمؑ کی وفاداری کا عالم کہ موت نظروں کے سامنے ہے مگر اپنی فکر نہیں بلکہ اگر فکر ہے تو حسینؑ کی۔

اسی عالم میں گرفتار کیے ہوئے لوگ لائے اور ابن زیاد کے سامنے پیش کر دیا۔ ابن زیاد کو مسلم نے سلام نہیں کیا۔ کسی خوشامدی نے کہا کہ تم نے امیر کو سلام نہیں کیا تو کہا میرا امیر سوائے حسینؑ کے اور کوئی نہیں ہے۔

بس عزادارانِ حسین! زحمت آپ کی ختم کر دینا چاہوں گا۔ بس اتنا آپ کے سامنے اور عرض کرنا چاہوں گا کہ یہ محرم کا مہینہ ہے۔ یہ حسینؑ کی عزاداری کا صدقہ ہے کہ محرم کی مجالس میں کچھ سن لیا کرتے ہیں۔ مگر فاطمہ زہراؑ اس مجلس میں تشریف لاتی ہیں تو یہ حسرت لے کر کہ میرے بچے کا رونے والا کون ہے؟ عزادارانِ حسینؑ! آپ اس بات کا خیال رکھیں کہ مجلس عزا میں آپ کی آنکھوں

سے جو آنسو ٹپکتے ہیں وہ فرش عزا پر نہیں گرتے بلکہ براہ راست رومال فاطمہؑ میں جایا کرتے ہیں اور جناب فاطمہؑ بڑی تمنا لے کر مجلس عزا میں آیا کرتی ہیں کہ کون میرے بچے کا ماتم کرنے والا ہے، لہٰذا بہتے ہوئے آنسوؤں کو آپ ان تاریخوں میں روکنے کی کوشش نہ کریں۔ کیونکہ ایک بڑی عبادت یہ بھی ہے کہ ہم اس مظلوم کا ماتم کریں کہ جس کی چاہنے والی بہن موجود تھی مگر رو نہ سکی۔ اس کی بیٹی موجود تھی مگر آنکھوں سے آنسو بہا نہ سکی۔

بس عزادارانِ حسینؑ! حکم دیا ابن زیادؑ نے، لے جاؤ مسلمؑ کو اور دارالامارہ GOVERNER HOUSE کی چھت پر اور وہاں لے جا کے انھیں قتل کر دو اور قتل کرنے کے بعد ان کی لاش کو زمین پر گرا دو۔ عزادارانِ حسینؑ روایتیں بتاتی ہیں کہ مسلمؑ کو قاتل لے کے چلا اور مسلمؑ اس عالم میں بھی عبادت میں مشغول۔ دعائیں پڑھتے ہوئے، آخر وہ ملعون لے گیا چھت کے اوپر، وہاں لے جا کے مسلم کو شہید کیا اور لاش کو بازار کوفہ میں اوپر سے پھینک دیا۔

بس عزادارانِ حسین! ایک جملہ اور آپ کی زحمت ختم۔ مسلم پر بے کسی اور تنہائی میں جو کچھ گزرنا تھی وہ گزر گئی۔ حسینؑ اُدھر کوفہ کی جانب بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ کچھ خبر نہیں کہ میرے بھائی پر کیا گزری۔ راستہ میں امام نے ملاحظہ فرمایا کہ دو آدمی کوفہ کی طرف سے آرہے ہیں۔ امام حسینؑ ذرا رکے کہ یہ قریب آئیں تو میں ان سے اپنے بھائی کا حال پوچھ لوں۔ لیکن وہ حسینؑ کو دیکھ کر راستہ کاٹ کے چلے گئے۔ امامؑ بھی آگے بڑھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد حسینؑ کے دو سپاہی آئے اور کہا کہ مولا! تھوڑی دیر پہلے ہم نے دیکھا تھا کہ دو آدمی

کوفہ سے آرہے تھے اور آپ ان سے بات کرنا چاہ رہے تھے۔ تو ہم نے آپ کی مرضی سمجھی تھی کہ آپ ان سے اپنے بھائی کا حال پوچھنا چاہتے تھے۔ لہٰذا ہم قافلہ کو چھوڑ کر ان کے پاس چلے گئے ان سے جاکر کوفہ کا حال پوچھا، انھوں نے مولا آپ کے بھائی کی خبر ہم کو بتائی ہے۔ مگر کہیے تو یہیں بتادیں اور کہیے تو خیمہ کی پشت پر چلیے، وہاں چل کر بتادیں۔ امامؑ نے کہا کہ مجھے ان لوگوں سے کچھ چھپانا نہیں ہے، جو کچھ کہا ہے وہ مجھ سے کہہ دے۔ عزادارانِ حسینؑ انھوں نے کہا کہ مولا وہ تو یہ کہتے تھے کہ ہم نے کوفہ کو اس وقت چھوڑا ہے جب کہ آپ کے بھائی کی لاش کے پیروں میں رسّی بندھی ہوئی تھی اور مسلم کی لاش کو کوفہ کے بازاروں میں کھینچا جارہا تھا۔

حسینؑ نے فرمایا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ ہ یہ کہہ کر خیمہ میں تشریف لے گئے۔ مسلم کی بچی جس کا نام رقیہ تھا اس کو آواز دی۔ کہا رقیہ! ذرا میرے پاس آجا۔ چار پانچ برس کی بچّی دوڑتی ہوئی آئی۔ حسینؑ بیٹھ گئے، بچی کو زانو پر بٹھایا، سر پہ دستِ شفقت پھیرا، رخساروں پر پیار کیا۔ اس کے بعد جنابِ زینبؑ سے کہا زینبؑ ہم نے فلاں منزل پر دو گوشوارے خریدے تھے وہ ذرا لے آؤ۔ گوشوارے لائے گئے۔ امامؑ نے اپنے ہاتھ سے اس بچی کے کانوں میں گوشوارے پہنائے۔ ایک مرتبہ اس بچی نے مسلم کی بچی ہے بڑی تیز اور ذہین بچی ہے۔ نظر اٹھاکر حسینؑ کو دیکھا اور کہا چچا آپ تو ہمیشہ ہی ہم سے محبت کا برتاؤ کیا کرتے تھے لیکن آج تو آپ کا وہ مخصوص برتاؤ ہے جو آپ یتیم بچوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ اے میرے چچا ذرا یہ بتائیے میرے بابا کی کوفہ

میں خیر ہے؟ حسینؑ نے بچی کو سینہ سے لگالیا کہا کہ بچی اگر مسلم دنیا میں موجود نہیں ہیں تو آج سے میں تیرے باپ کی جگہ ہوں۔ میں کہتا ہوں مولا، یتیم بچوں کو اسی طرح دنیا میں تسلّی دی جاتی ہے لیکن جب آپ کی یتیم بچی کربلا کے میدان میں نکل کر آئی تو اسے تسلّی کیوں کر دی گئی؟ آپ رقیہ کے رخساروں پر یوں پیار کر رہے ہیں اور وہاں سکینہ کے طمانچے لگائے گئے۔ آپ نے بچی کے کانوں میں گوشوارے پہنائے ہیں وہاں کانوں سے گوشوارے یوں اتارے گئے کہ کانوں کی لووں سے خون کی بوندیں ٹپکنا شروع ہو گئیں۔

تیسری مجلس

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ط بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط
وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ وَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ
مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ہ (سورہ آل عمران آیت ۸۵)

اس آیہ کریمہ کو آپ کی خدمت میں برابر پیش کر رہا ہوں جس میں ارشاد اقدس الٰہی ہے کہ اسلام کے علاوہ اگر کوئی بھی انسان کسی بھی مذہب یا طرز فکر یا طرزِ زندگی کو اختیار کرے گا تو وہ دین وہ مذہب اور وہ طرزِ فکر اور طرزِ زندگی اور طرزِ بندگی ہم اس سے قبول نہیں کریں گے۔ اور ایسا انسان اس دنیاوی زندگی سے گزرنے کے بعد جب آخرت کی دائمی زندگی میں داخل ہو گا تو اسے اس بات کا خود احساس ہو جائے گا کہ اس نے اسلام کو چھوڑ کر اپنا ہی نقصان کیا تھا۔

تمہید میں قرآن مجید کی الہامی شان کے بارے میں آپ کی خدمت میں کچھ باتیں کرتا ہوں اور کوشش کر رہا ہوں کہ سادہ زبان اور عام فہم منطق کی روشنی میں آپ حضرات کے سامنے کچھ عرض کروں۔ اس

بات سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا ہے کہ انسان کے چاروں طرف جو ماحول ہوتا ہے، انسان جو دیکھتا ہے، سنتا ہے یا پڑھتا ہے، اسی سے اس کے خیالات مرتب ہوتے ہیں۔ پھر ان ہی سب چیزوں کا عکس اس کی باتوں اور گفتگو میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہی اصول قوموں کے لیے بھی ہے، اسی لیے کہا جاتا ہے اَلشِّعْرُ دِیْوَانُ الْعَرَبِ یعنی عربوں کی تاریخ، عربوں کی تہذیب، اور عربوں کا پورا تمدن ان کے اشعار میں ریکارڈ اور محفوظ ہے۔ اسی لیے جاہلی (قبل اسلام) زمانہ کے قصیدوں کو اگر آپ ملاحظہ فرمائیں، نظموں کو دیکھیں تو آپ کو اس زمانہ کا ماحول ان میں جھلکتا ہوا دکھائی دے گا۔

عربی شاعری بہت بلند معیار رہے، واقعی پڑھنے کے قابل ہے۔ اور پرانے زمانے میں، جاہلی دور میں جیسے شاعر عربی زبان نے پیدا کر دیے وہ آج بھی چیلنج بنے ہوئے ہیں۔ لبید کا جواب عربی شاعری میں نہیں مل سکا۔ امرؤالقیس کا ایسا شاعر پھر نہیں پیدا ہو سکا۔ یہ ایسے عظیم شاعر تھے، نہ صرف اپنے دور کے بلکہ آج بھی دنیائے عرب ان کا لوہا مانتی ہے۔ لیکن آپ ان کے کلام کو دیکھیے تو کیا نظر آئے گا یا تو عشق و عاشقی کی باتیں دکھائی دیں گی یا ریگستان کی منظر نگاری ہوگی یا پھر اونٹ آپ کو دکھائی دیں گے۔ بڑے خوبصورت پیرائے میں گھوڑوں کی تعریفیں ہوں گی، یا تلوار کی تعریف ہوگی، نیزے کا بیان ہوگا یا پھر اپنی بہادری کی داستانیں ہوں گی۔

اس زمانے کا بہت بڑا شاعر تھا امرؤالقیس اس کا ایک شعر میں

آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں نمونہ کے طور پر صرف ایک شعر۔ شعر بہت اچھا ہے۔ منظر کشی کرتا ہے کہ عرب کے ریگستان میں اونٹ پر بیٹھا ہوا صحرا عبور کرتا چلا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت کتنا وقت لگتا تھا اور کن کن مشکلات کا سامنا کرنا ہوتا تھا، اس کو تو آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ اونٹنی پر بیٹھا ہوا لق و دق ریگستان سے گزر رہا ہے، اس موقع پر کہتا ہے ؎

صدری بھا افضیٰ ام البیداءُ　　بِشیَمُ اللیالی ان تشکک ناقتی

کہتا ہے میں اپنی اونٹنی پر بیٹھا ہوا ناپیدا کنار ریگستان کو عبور کرتا ہوا چلا جا رہا ہوں۔ مگر وہ اونٹنی جو مجھے اچھی طرح جانتی ہے وہ اس سوچ میں پڑی ہے کہ سوار کے پاؤں کے نیچے ریگستان کی وسعتیں زیادہ ہیں یا سوار کے سینہ میں دل زیادہ وسیع اور کشادہ ہے۔

واقعی یہ بہت اچھا شعر ہے، اپنی اولوالعزمی کو بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ مگر اس میں بھی ریگستان اور اونٹ کا تذکرہ۔ تو عربی شاعری کو اگر آپ دیکھیں تو اس میں آپ سوائے ریگستان، چشمے، نخلستان یا پھر بہادری کی داستانیں۔ تلوار، گھوڑا یا اونٹ بس یہ چیزیں آپ کو ملیں گی۔ اس لیے کہ ان کے پیش نظر اس کے علاوہ اور کچھ تھا ہی نہیں۔ آدمی جو کچھ دیکھے گا اسی لحاظ سے وہ اپنے خیالات کو یکجا کرے گا۔ انھوں نے ریگستان، اونٹ، گھوڑے، خیمہ، تلوار وغیرہ کے سوا کچھ دیکھا ہی نہیں تھا اسی لیے ان کی شاعری میں بھی سوائے ریگستان، اونٹ، گھوڑے، خیمہ و تلوار کے کچھ ملے گا ہی نہیں۔

میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہی زمانہ ہے قرآن مجید کے نزول کا۔ تو اگر کلام مجید کلامِ محمدؐ ہے اور کلامِ خدائے محمد نہیں ہے تو اس میں بھی آپ کو یہی محدود ماحول دکھائی دینا چاہیے۔ ریگستان، نخلستان، تلواریں، گھوڑے وغیرہ دکھائی دینا چاہیے۔ اس لیے کہ محمدؐ عربی نے اس کے علاوہ اور کچھ دیکھا ہی نہیں ہے۔ مگر عجیب و غریب بات ہے، اس زمانہ کی عربی شاعری کو جب ہم اٹھا کر دیکھتے ہیں تو نخلستان کا بیان، چشموں کا بیان، ریگستان کا بیان، گھوڑوں کا بیان ہے یا پھر اونٹوں کا بیان ہے، تلواروں کا بیان ہے، بہادری کا بیان ہے، لوٹ مار کا بیان ہے اپنی شجاعت کی ڈینگیں بس۔ مگر اسی ماحول میں نازل ہونے والے قرآن پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو پہلی ہی سورہ کی پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۝ پہلی سورہ کی پہلی آیت اور تعریف ہوتا ہے خالق کی۔ تو اگر یہ کلام محمدؐ ہوتا تو یہ کہنا چاہیے تھا کہ ساری تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے سرزمین عرب کو خلق کیا۔ اس میں ریگستان بنائے، نخلستان بنا دیے، اس ریگستان کو عبور کرنے کے لیے اونٹ کا ایسا جانور بنایا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب ہونا چاہیے تھا کیونکہ اس زمانے کا ماحول یہی تھا۔ لیکن آپ غور کیجیے کہ اس محدود اور بند ماحول میں نازل ہونے والی کتاب کی ابتدا کیونکر ہوتی ہے؟ ارشاد ہوتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۝ ساری تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جو ساری دنیاؤں کا پیدا کرنے والا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بہت سی دنیاؤں کا، بہت سے عالموں کا تصور ہی محمدؐ عربی کے دماغ میں کیسے پیدا ہو سکتا ہے اس دور

میں جب کہ عربوں کو خود اپنے جزیرہ نما کے حدود تک کا پتہ نہ تھا۔

پھر مزے کی بات یہ کہ قرآن مجید میں ۲۶ پیغمبروں کا ذکر ہے نام لے کر اور اگر کوئی حافظ یہاں پر تشریف فرما ہیں تو ان سے تصدیق کروالیں۔ ۲۶ پیغمبروں کا ذکر ہے۔ ہر پیغمبر کے لیے یہ ملے گا کہ ہم نے اس نبی کو فلاں گاؤں، فلاں قوم، فلاں قبیلہ میں بھیجا۔ حضرت یونسؑ کے لیے قوم کی گنتی بھی بتا دی گئی کہ فَاَرْسَلْنَاهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ٥ ہم نے ایک لاکھ یا کچھ زیادہ لوگوں کی طرف ان کو مبعوث کیا۔ تو اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ جب قرآن کا انداز ابتدا ہی سے ایسا چلا آرہا ہے تو جب ہمارے رسولؐ کا ذکر ہوگا تو ان کے لیے بھی کہا جائے گا کہ ان کو ۳-۴ لاکھ کے لیے مبعوث کیا یا اگر زمین کا ذکر ہوگا تو کہا جائے گا کہ حجاز کا رسول بنا کر ان کو بھیج دیا، نجد کا رسول بنا کر بھیج دیا، عربوں کا رسول بنا کر بھیج دیا۔ آپ انصاف کریں اس جاہلیت و جہالت کے دور میں ذہین سے ذہین انسان بھی اپنی فکر میں کتنی وسعت دے سکتا ہے۔ عرض کر چکا ہوں کہ کلام میں ہمیشہ ماحول و زمانہ کا عکس ہوتا ہے۔ اس لیے کلام دیکھ کر آپ خود شاعر کا نام نہ لے سکیں مگر زمانہ ضرور بتا دیں گے۔ مثلاً آپ کے سامنے نجم آفندی مرحوم کی یہ بیت پڑھ دوں کہ ؎

عباسؑ نامور کا علم لے کے جائیں گے　　ہم چاند پر حسینؑ کا غم لے کے جائیں گے

اگر یہ بیت آپ کے سامنے پڑھوں تو آپ خواہ شاعر کا نام نہ بتا سکیں مگر زمانہ ضرور بتا دیں گے کہ بیت اسی زمانہ میں کہی گئی ہے جب انسان چاند پر جانے کے لیے پر تول رہا ہوگا۔

توجہ فرمائی آپ نے، جب حضورؐ کا زمانہ وہ زمانہ ہے کہ جس میں معلومات محدود ہیں، دماغ بند ہیں تو وہاں بس یہی ہونا چاہیے تھا کہ ہم نے ان کو حجاز کے لیے رسولؐ بنا کر بھیجا ہے، عربوں کے لیے رسولؐ بنا کر بھیجا ہے۔ مگر اس زمانہ میں نازل ہونے والا قرآن مجید ہر نبی کے دائرہ نبوت کو چھوٹے چھوٹے حلقوں اور دائروں میں محدود کرتا جا رہا ہے، فلاں قبیلہ میں بھیجا، فلاں گروہ میں بھیجا، فلاں امت میں بھیجا۔ مگر جب ہمارے رسولؐ کا ذکر ہوتا ہے تو ارشاد ہوتا ہے وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ٥ (سورہ انبیاء آیت ۱۰۷) ہم نے آپ کو رسولؐ بنا کر بھیجا ہے، رحمت بنا کر بھیجا ہے مگر ساری دنیاؤں کے لیے، سارے جہانوں کے لیے۔ یہ انداز خود بتا رہا ہے کہ یہ محدود نظر رکھنے والے انسان کا کلام نہیں، اس اللہ کا کلام ہے جس کی نظر عالمین پر ہے۔

میں کہتا ہوں پالنے والے! یہ ان کے دائرے کو اتنا وسیع تو نے کیوں کر دیا؟ تو شاید ارشاد ہو کہ یہی دکھانے کے لیے کہ ہماری نظر حال پر بھی ہے مستقبل پر بھی۔ ہمیں معلوم ہے کہ آدمؑ آئیں گے اور چلے جائیں گے، ابراہیمؑ آئیں گے اور چلے جائیں گے، موسیٰؑ آئیں گے اور چلے جائیں گے، عیسیٰؑ آئیں گے اور چلے جائیں گے، ایوب آئیں گے اور چلے جائیں گے اور ان کی امت میں سے کسی کی یہ طاقت نہ ہوگی کہ وہ زمین کو چھوڑ کے خلاؤں میں جائے۔ ہاں محمدؐ ہمارا آخری رسولؐ ہے۔ ان کے بعد کوئی رسول آنے والا نہیں۔ ان کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں نہ اصلی نہ ضمنی، نہ قادیان سے

نہ ایران سے ۔ ان کی رسالت آخری رسالت ہے جو قیامت تک جاری رہے گی۔ ان کا زمانۂ رسالت وہ ہو گا کہ جب انسان چاند پر پہنچے گا اور ان کے دور رسالت میں ہو سکتا ہے کہ انسان کسی دوسرے سیارہ پر پہنچ جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی دوسرے نظام شمسی میں چلا جائے ۔ ہو سکتا ہے کسی دوسری کہکشاں میں چلا جائے ۔ تو انسان زمین کو چھوڑے گا تو اکڑ کر کہے گا ہمارا اسلام سے کیا تعلق رہ گیا، ہم نے وہ زمین ہی چھوڑ دی جہاں محمدؐ عربی رسولؐ بن کر آئے تھے ۔ تو ارشاد ہوتا ہے تم دائرۂ کشش زمین سے باہر نکل سکتے ہو مگر دائرۂ رسالتِ محمدیؐ سے باہر نہیں نکل سکتے کسی کہکشاں پر چلے جاؤ، کسی سیارہ پر چلے جاؤ جہاں جہاں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ملیں گے وہاں وہاں مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ بھی ملے گا۔ (صلوٰۃ)

یہی ایک آیت نہیں دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے تَبَارَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ۝ (سورہ فرقان آیت ۱) یہاں بھی وہی ہے کہ بہت مبارک ہے وہ ذات کہ جس نے اپنے بندے پر قرآن نازل کیا تاکہ وہ ہمارے عذاب سے ڈرانے والا بنے، کس کے لیے عالمین کے لیے ۔ توجہ کیجیے! میں یہ کہتا ہوں کسی مسلمان کو ان آیتوں میں یا آیتوں کے ترجمہ میں شک تو نہیں ؟ اور اگر شک نہیں تو پھر ہر مسلمان بھائی کے سامنے ایک سوال رکھتا ہوں اور وہ سوال یہ ہے کہ جب حضورؐ آئے ہیں ساری دنیاؤں کے لیے تو حضورؐ کی ساری زندگی اس چھوٹی سی دنیا میں کیوں محدود رہ گئی ؟

یہ زمین جس پر آپ بیٹھے ہوئے ہیں اس کو آپ جتنا بڑا سمجھیں، اس کی حیثیت ہی کیا ہے؟ یہ کائنات میں ایک ذرہ سے زائد حیثیت نہیں رکھتی. آپ اس کو جتنا چاہیں بڑا سمجھیں، آپ ASTRONOMY اور CASMOLOGY پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ سورج زمین سے لاکھوں گنا بڑا ہے اور اس کا نظام شمسی اربوں میل میں پھیلا ہوا ہے۔ مگر ہمارے حساب سے یہ اربوں میل تک پھیلا ہوا نظام بھی کائنات کے نقشہ میں اتنا بڑا بھی نہیں کہ ایک نقطہ رکھ کر اس کی طرف اشارہ کیا جا سکے۔ تو جب پورا نظام شمسی SOLAR SYSTEM اتنا چھوٹا ہے تو اس میں اس ننھی منی زمین کی حیثیت ہی کیا؟ تو آئے ہیں سارے جہانوں کے لیے اور رہ گئے ایک چھوٹی سی زمین کے اوپر۔ یہ تو کوئی اصول کی بات نہیں ہوئی۔

آپ اس ملک میں تشریف فرما ہیں۔ یہ لمبا چوڑا ملک کیلی فورنیا سے لے کر نیو یارک تک پھیلا ہوا ہے۔ اسے عبور کرنے میں براہ راست پرواز کو بھی ۶ گھنٹے لگتے ہیں۔ یہاں کے صدر ہیں مسٹر ریگن۔ تو کیا مسٹر ریگن صدر منتخب ہونے کے بعد سے وہائٹ ہاؤس کے باہر نہیں نکلے ہیں اور کیا ان کو زیب دیتا ہے کہ سارے ملک کے صدر بنیں اور وہائٹ ہاؤس میں گھوم پھر کر رہ جائیں۔ نہ ایسا کبھی ہوا ہے اور نہ ایسا کبھی ہو سکتا ہے۔ ہر سربراہ اپنے ملک میں گھومتا رہتا ہے۔ اسی لیے آپ دیکھ لیں مسٹر ریگن کو، آج وہ لاس اینجلس میں ہیں کل فلاڈلفیا میں، دو دن کے بعد نیو یارک میں ہیں پھر ہیوسٹن میں۔

اب میں سارے مسلمانوں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ حضورؐ آئے تو تھے سارے جہانوں کے لیے اور رہ گئے اس دنیا کے اندر۔ یہ بات کچھ سمجھ میں آنے والی نہیں ہے۔ اس زمین کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں، یہ تو زیرو ہے، صفر ہے۔ بس یاد رکھیے کہ اگر ہم حضور کی معراج جسمانی کے قائل نہیں ہوں گے تو اس سوال کا جواب نہیں دے سکتے۔ اسی لیے کسی نبی کو معراج نہیں ملی، کسی رسول کو معراج نہیں ملی مگر حضورؐ کو معراج ملی۔ کائنات کی سیر کرائی گئی بلکہ معلوم کائنات کے ماوراتک حضورؐ کو لے جایا گیا اور اس کا ذکر قرآن میں بھی کر دیا گیا کہ یہ حقیقت شک و شبہ سے بالاتر رہے۔ تاریخ کو مشکوک قرار دیا جا سکتا ہے، قرآن کو نہیں۔ اسی لیے پندرھویں پارے میں ارشاد کر دیا گیا سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ط اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ۝ (سورہ بنی اسرائیل آیت ۱)

مجھے معلوم ہے کہ یہاں یہ بھی بحث پیدا کر دی گئی ہے۔ کچھ بھائی کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ کو معراج جسمانی نہیں ہوئی تھی، پیغمبرؐ کا جسم نہیں گیا تھا معراج میں، بلکہ پیغمبرؐ نے صرف ایک خواب دیکھا تھا۔ میں کسی پر کوئی تنقید نہیں کرتا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جب کوئی قوم یا کوئی فرد احساس کمتری کا شکار ہوتی ہے تو اس کو نیچے نیچے دیکھنے کی عادت ہو جاتی ہے۔ اس احساس کمتری کے سبب ہم کو اتنا نیچے دیکھنے کی عادت ہے کہ رسولؐ اپنے جسم کو اتنا اونچا اٹھا رہے ہیں، ہم نظر نہیں اٹھا پا رہے ہیں۔

اب سے کوئی دس بارہ سال پہلے کی بات ہے۔ ایک سچا واقعہ سنادوں، اس وقت تک لکھنؤ میں ٹی۔ وی نہیں آیا تھا۔ اب یہ وبا وہاں بھی آگئی ہے۔ دہلی میں ٹی۔ وی آچکا تھا۔ لکھنؤ کے کچھ حضرات یہاں موجود ہیں، انھیں معلوم ہے کہ لکھنؤ میں جو ذوق اور شوق اور "بازیاں" پھیلی ہوئی ہیں، ان میں کبوتر بازی بھی ہے۔ خاص طور پر پرانے لکھنؤ میں بہت کبوتر اڑتے دکھائی دیں گے اور اسی لیے ہر دو چار گھروں کے بعد چھت پر بانس کی چھتری لگی ہوئی دکھائی دے گی۔ خدا معلوم وہ کبوتروں کے بٹھانے کے لیے ہوتی ہے یا کبوتروں کو پکڑنے کے لیے؟ مجھے پتہ نہیں، لیکن یہ ضرور ہے کہ دو چار گھروں کے بعد آپ کو وہ چھتری دکھائی دے جائے گی۔
اب میں اتفاق سے گیا دہلی، لکھنؤ کے ایک صاحبزادے میرے ساتھ دہلی تشریف لے گئے، اس وقت دہلی میں ٹیلی ویژن آچکا تھا۔ میں ایک ہوٹل میں ٹھہرا گرمی کا زمانہ تھا، میں اوپر کھلی چھت پر سو رہا تھا، وہ صاحبزادے بھی اسی چھت پر سو رہے تھے۔ صبح جب آنکھ کھلی تو انھوں نے کھلی اور بلند چھت سے چاروں طرف نظر دوڑائی اور پھر مسکرا کر فرمانے لگے اخاہ جناب یہاں تو ماشاء اللہ لکھنؤ سے بھی زیادہ کبوتر باز ہیں۔ میں نے کہا آپ کو کیسے پتہ چلا؟ کہنے لگے دیکھیے کتنی چھتریاں یہاں دکھائی دے رہی ہیں۔ میں نے کہا بھیا یہ چھتریاں نہیں، یہ ٹیلی ویژن کے اینٹنا ہیں۔
ملاحظہ کیا آپ نے۔ ان کو کبوتر کی چھتریاں ہی دیکھنے کی عادت تھی اس لیے ٹیلی ویژن کا اینٹنا بھی انھیں کبوتر کی چھتری ہی دکھائی دیا۔ تو مسلمانوں

کو خواب دیکھنے کی ایسی عادت ہو گئی ہے کہ رسولؐ کی معراج کو بھی ان کو خواب ہی دکھائی دے رہی ہے۔ آپ ملاحظہ کیجیے، خود اللہ فرما رہا ہے کہ سُبحَانَ الَّذِی۔ آپ سبحان اللہ کب کہتے ہیں؟ الحمد للہ! آپ کے سبحان اللہ کا معیار بہت بلند ہے۔ جب ایسی ہی کوئی بات آپ کو پسند آتی ہے تو آپ سبحان اللہ کہتے ہیں۔ لیکن میں نے خود کبھی اپنے کسی نکتہ پر سبحان اللہ کہا؟ نہیں۔ کیونکہ نکتہ ہے ہی نہیں اس لائق کہ میں سبحان اللہ کہہ کر گویا اپنی داد خود دوں۔ اب ذرا غور کیجیے کہ کائنات کا پیدا کرنے والا، اس کے نزدیک معراجِ نبیؐ کتنا زبردست کارنامہ ہے کہ جب معراج کا ذکر کرتا ہے تو خود اپنی تعریف سے کرتا ہے سُبحَانَ الَّذِی۔ سبحان اللہ، ہماری کیا قدرت ہے کہ ہم نبیؐ کو فرش سے عرش پر لے گئے۔

مگر کچھ مسلمان ایسے بھی ہیں جو اس کے باوجود کہتے ہیں کہ حضورؐ نے خواب دیکھا تھا۔ تو کیا پیغمبرؐ نے کہا تھا کہ میں نے خواب دیکھا تھا؟ ہرگز نہیں۔ میں پوری ذمہ داری کے ساتھ آپ کے سامنے یہ کہہ رہا ہوں کہ شیعہ، سنی جتنی روایتیں ہیں سب کو کھنگال ماریے، ایک منزل پر بھی رسولؐ یہ کہتے ہوئے نہیں دکھائی دیں گے، میں نے خواب دیکھا تھا۔ رسولؐ معراج کی تفصیل بیان کرتے ہوئے دکھائی دیں گے کہ یہ ہوا، یہ ہوا، یہ ہوا۔ کبھی نہ کہا کہ میں نے خواب دیکھا تھا۔ یہاں تک کہ دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے بھی حضورؐ نے یہ نہیں کہا کہ میں نے خواب دیکھا تھا۔

اب ایک قصہ میں اپنا سنا دوں۔ جب تک قصہ تمام نہ ہو جائے

آپ میرے بارے میں کوئی رائے نہ قائم کیجیے گا۔ امریکہ تو میں ہر سال آتا رہتا ہوں مگر گذشتہ سال میرے ساتھ یہ واقعہ ہوا کہ روس کے صدر کا میرے پاس یہ پیغام آیا کہ تم ہر سال امریکہ کا دورہ کرتے رہتے ہو ایک بار روس کا بھی دورہ کر لو۔ میں نے کہا، میرے پاس تو ٹکٹ وکٹ ہے نہیں نہ اتنے پیسے ہیں تو انھوں نے جناب وہاں سے ایک چارٹرڈ پلین میرے لیے بھیج دیا۔ بہت عزت و احترام سے بلایا گیا۔ میں نے روس کے مشہور مقامات کا دورہ کیا، روسی صدر سے بھی میری روبرو باقاعدہ آمنے سامنے بیٹھ کر بات ہوئی۔ ملاحظہ کیا آپ نے، میں آپ کو سنا رہا ہوں سفر کی داستان اور آپ کو یہ خیال کہ روس کمیونسٹ ملک، حکومت مذہب دشمن، یہ کیسے وہاں بلائے گئے۔ بہر حال آپ نے یہاں کے اخباروں میں شائع کرا دیا، ہمارے مولوی صاحب روس کے صدر کی دعوت پر وہاں گئے تھے اور انھوں نے ان کے روبرو بیٹھ کر بات چیت کی۔ اور آئندہ سال میں پھر یہاں آیا تو جناب انٹرویو لینے کے لیے مختلف اخباروں کے نمائندے میرے سامنے کھڑے تھے کہ صاحب وہاں آپ کیسے چلے گئے تھے؟ بتائیے آپ سے کیا بات ہوئی، کیسے گفتگو ہوئی کن مسائل پر بحث ہوئی؟ جب انھوں نے مجھ سے سوال کرنا شروع کیے تو میں نے مسکرا کر کہا کہ جناب میں نے سارا واقعہ یہاں بیان کیا تھا صرف ایک جملہ کہنا بھول گیا تھا کہ یہ میں نے خواب دیکھا تھا۔ بتائیے آپ کی کیا رائے ہوگی میرے بارے میں۔ آپ کہیں گے، عجیب نامعقول آدمی ہیں۔

یہاں ہم نے اتنا مشہور کر دیا، اخباروں میں دے دیا، انٹرویو ہونے کے سامان تیار ہو گئے، ٹی۔وی کیمرے سامنے لگے ہوئے ہیں۔ اب سال بھر کے بعد ان کو یاد آرہا ہے تو کہہ رہے ہیں میں نے خواب دیکھا تھا تو شاید لاس اینجلیس میں مجھے پھر آنا نصیب نہ ہو۔ تو میں بدنصیب آپ کے سامنے سال بھر کے بعد کہہ بھی رہا ہوں کہ میں نے خواب دیکھا تھا اور حضورؐ دنیا سے رخصت ہو گئے اور یہ نہیں کہا کہ میں نے خواب دیکھا تھا تو اب بتائیے، حضورؐ کی کون سی بتائی ہوئی بات قابلِ اعتبار رہ گئی۔

اب حضورؐ جنت کی تعریف کریں گے میں کہوں گا ممکن ہے حضورؐ نے یہ بھی خواب دیکھا ہو گا، جہنم کی داستان بیان کریں گے میں کہوں گا ممکن ہے حضورؐ نے یہ بھی خواب دیکھا ہو تو اس کا مطلب یہ کہ حضورؐ خواب نہیں دیکھ رہے، اصل میں ہم خود خواب دیکھ رہے ہیں۔

بس برادرانِ عزیز! یاد رکھیں میرے عزیز مسلمان بھائی۔ ہر نبی کو اس کے زمانہ کے مطابق معجزہ دیا گیا۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں جادو کا زور تھا ویسا ہی معجزہ دے دیا گیا۔ حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ میں میڈیکل سائنس کا، طب کا زور تھا، ویسا معجزہ دیا گیا۔ تو مسلمانوں سے میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ حضورؐ کا زمانہ کیا ہے۔ اگر حضورؐ کا زمانہ وہی تھا جو چودہ سو برس پہلے تھا تو مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔ اگر مسلمان کہتے ہیں کہ حضورؐ کا زمانہ قیامت تک ہے تو پھر حضورؐ کو ایسا معجزہ ملنا چاہیے تھا جو ہزاروں برس بعد آنے والے زمانہ کے مطابق ہو۔ آج کے زمانہ کی خصوصیت کیا

ہے۔ اس زمانہ کی خصوصیت ہے سرعت رفتار اور خلاؤں کی تسخیر اور دوسرے PLANETS سیاروں پر۔ تو پھر یاد رکھیے کہ چونکہ حضورؐ بھی قیامت تک کے لیے رسولؐ بنا کر بھیجے گئے تھے لٰہذا قیامت تک کے زمانہ کو نظر میں رکھنے کے بعد ایک معجزہ ایسا دے دیا گیا کہ تمھارے خلائی جہاز خواہ کتنی ہی تیز رفتاری اختیار کرلیں مگر ہمارے نبیؐ کی گردِ قدم تک بھی نہ پہنچ سکو گے۔ (صلوٰۃ)

لوگ کہتے ہیں کہ اتنی جلدی کیسے چلے گئے، سرے پر نکل گئے کائنات کے، اوپر نکل گئے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کائنات کو عبور کر لیا اور بستر گرم رہا، زنجیرِ در بھی ہلتی رہی اور واپس بھی آگئے۔ یہ امکان ہیں نہیں ہے۔ سب کچھ فکشن ہے، کہانی ہے، ڈرامہ ہے۔ سب افسانہ اس لیے آپ کی سمجھ میں آرہا ہے کہ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ گئے۔ حالانکہ نہ میں نے کبھی کہا کہ پیغمبرؐ گئے اور نہ کبھی قرآن نے کہا کہ پیغمبرؐ گئے۔ قرآن نے بھی کہا اور میں بھی کہہ رہا ہوں، خدا لے گیا۔ تو اب اگر خدا کی کوئی بات آپ کی سمجھ میں آگئی ہو تو یہ بات بھی میں آپ کو سمجھا دوں۔ جہاں تک میرا امکان ہے میں چاہتا ہوں کہ بات CLAEAR ہو جائے، صاف ہو جائے۔

برادرانِ عزیز! آواز کی ایک رفتار ہے۔ آپ ایک سو گز کے فاصلہ سے کھڑے ہو جائیں۔ میں یہاں کھٹ سے کروں گا تو ایک سکنڈ کے بعد وہاں آپ کو آواز سنائی دے گی۔ یہ ہے آواز کی رفتار۔ کیا وہ بارہ سو میل تقریباً ایک گھنٹہ میں سفر کرتی ہے؟ اور میں یہاں ریڈیو پر تقریر کر رہا ہوں

اور یہاں سے دس گیارہ ہزار میل کے فاصلہ پر ہے لکھنؤ تو ٹھیک اسی لمحے یہ آواز سنائی دے رہی ہے، تو یہ کیسے سنائی دے رہی ہے؟ اس کو تو کئی گھنٹہ میں وہاں پہنچنا چاہیے تھا۔ تو آپ کہیں گے کہ آواز کی رفتار تو کم ہے مگر ہم نے تمھاری زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کو ایک تیز رفتار سواری پر سوار کر دیا۔ اس تیز رفتار سواری کا نام ہے ریڈیائی لہر۔ تو اب یہ تمھاری آواز نہیں جا رہی ہے بلکہ یہ تیز رفتار ریڈیائی لہر تمھاری آواز کو لیے جا رہی ہے۔ تمھاری آواز وہاں تک نہیں جا سکتی تھی، اگر پہنچ بھی جاتی تو ۱۲۔۱۴ گھنٹے میں پہنچتی مگر ہم نے تمھاری زبان سے نکلے ہوئے جملوں کو ریڈیائی لہر کی تیز رفتار سواری پر سوار کر دیا تو وہی فاصلہ ایک سکنڈ کے بھی سولھویں حصہ میں طے ہو گیا۔

ملاحظہ کیا آپ نے، اس کا مطلب یہ کہ آپ پیغمبرؐ کی یہ حیثیت انسان کی سست رفتاری کو دیکھ رہے ہیں اور وہاں اللہ یہ فرما رہا ہے یہ گئے نہیں بلکہ ہماری طاقت تھی کہ ہم ان کو لے گئے۔ اب اللہ کی طاقت کیا ہے وہ بھی آپ کے سامنے میں عرض کر دوں۔ آپ کے سامنے نہ کہوں تو کس کے سامنے کہوں۔ جناب آج کی دنیا میں جو سب سے زیادہ تیز رفتار شے مانی جاتی ہے وہ ہے رفتارِ نور۔ مگر اس کائنات میں آپ اپنے معلومات کے اعتبار سے رفتارِ نور کو چاہے جتنا تیز سمجھیں جو تقریباً دو لاکھ میل کم و بیش ایک سکنڈ میں طے کر لیتی ہے۔ اللہ اکبر! کتنی تیز رفتار نور کی رفتار کہ ایک سکنڈ میں دو لاکھ میل کم و بیش۔ لیکن کائنات اتنی بڑی ہے بھائی صاحب کہ یہ رفتار بھی چیونٹی کی رفتار ہے۔ کائنات کو طے کرنے کے لیے کائنات میں سب سے

زیادہ اگر کوئی تیز رفتار ہے تو وہ کشش ثقل کی لہریں ہیں، جو فاصلہ کائنات روشنی دو لاکھ میل فی سکنڈ کی رفتار سے کروڑوں سال میں بھی طے نہیں کر سکتی مگر جو کشش ثقل کی لہریں ہیں ان کی رفتار اتنی تیز ہے کہ ایک سکنڈ کے دسویں حصہ میں کائنات کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ میں یہ لہریں پہنچ جاتی ہیں۔ جب اللہ کشش ثقل کی لہروں کو رفتار دے سکتا ہے تو مرضیٔ الٰہی کائنات کے مرکزِ ثقل حضورؐ کریم کو یہ رفتار دے دے تو حیرت کی کیا بات ہے؟

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ حضورؐ منزلِ معراج میں تشریف لے گئے اور جب پلٹ کر آئے تو علیؑ بن ابی طالب نے فرمایا کہ حضورؐ معراج کا حال آپ بیان کریں گے یا میں بیان کروں؟ اور پھر واقعی پوری تفصیل بیان بھی کر دی۔ اس منزل پر بعض لوگوں کو غلط فہمی ہو جاتی ہے اور ہونا بھی چاہیے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ ہم علیؑ سے محبت کرتے ہیں اس لیے جہاں کوئی منزل آئی ہم ہمیشہ علیؑ کو آگے بڑھا دیتے ہیں۔

میں عرض کرتا ہوں کہ ہم کبھی علیؑ کو رسولؐ سے آگے نہیں بڑھاتے ہاں صرف ایک جگہ بڑھا دیتے ہیں، باقی ہر جگہ رسولؐ کو آگے رکھیں گے۔ وہ ایک جگہ کہ جہاں علیؑ کو آگے بڑھائیں گے وہ ہے میدانِ جنگ۔ میدانِ جنگ میں رسولؐ کو پیچھے رکھیں گے علیؑ کو آگے بڑھا دیں گے۔ تو یہ علیؑ کو بڑھانا نہیں تو اور کیا ہے کہ جو کچھ رسولؐ نے جا کر وہاں دیکھا وہی علیؑ نے بیٹھے بیٹھے یہاں دیکھ لیا۔ ابھی یہاں تو سمجھانا دو منٹ کی بات ہے، یہاں

کون سی مشکل بات ہے۔ میں یہاں بیٹھا ہوں لاس اینجلیس میں۔ تھوڑے فاصلہ پر یہاں سے کیپ کناورل ہے جہاں سے خلائی جہاز چاند پر جاتے رہتے ہیں۔ وہاں سے کچھ خلا باز چلے چاند کا سفر کرنے کے لیے۔ میں یہاں پر بیٹھا ہوا ان کی فلم دیکھ رہا ہوں۔ کیسے گئے، کیسے خلا میں پہنچے، کیسے زمین کا طواف کیا، کیسے چاند کی طرف روانہ ہوئے، کیسے چاند پر اترے، کیسے چاند سے پھر روانہ ہوئے۔ یہ سب منظر میں ٹی۔ وی پر دیکھ رہا ہوں۔ اس کے بعد میں نے دیکھا وہ آکر پھر سمندر میں اترے پھر جناب ان کو اُٹھایا گیا اور جہاز میں رکھا گیا۔ اب وہ جہاز ان کو لے کے چلا۔ اب جہاں وہ جہاز سے آنے والے تھے وہیں کا ٹکٹ میں نے بھی لے لیا پلین کا۔ جب وہ وہاں اترے جہاز سے تو میں نے ان سے مصافحہ کیا اور کہا، حضور! چاند پر جانے کا واقعہ آپ بیان کریں گے یا میں بیان کر دوں؟ کیا یہ میں ان سے آگے بڑھ گیا! ارے وہ وہ ہیں اور میں میں ہوں۔ مگر جو ان پر گزر رہی تھی وہ سب میں دیکھ رہا تھا۔ تو میں ان سے آگے نہیں بڑھا وہ مجھ سے آگے ہیں۔ تو برادرانِ عزیز! اگر برقی لہروں کے وسیلوں سے مجھے چاند پر جانے والوں کی معراج کا منظر دکھایا جا سکتا ہے زمین پر بیٹھے بیٹھے تو اگر روحانی لہروں سے علیؑ ابن ابی طالب پیغمبرؐ کی معراج کا حال دیکھ رہے ہیں تو اس میں کون سی بڑی بات ہے۔ (صلوات)

داستان تو بہت تفصیلی ہے لیکن بس اتنا اور سن لیجیے۔ تشریح کر دوں میرے برادرانِ اہلِ سنت جو یہاں تشریف رکھتے ہیں، ذرا غور سے سنیں۔

میں کبھی کسی کے دل کو توڑا نہیں کرتا، نہ کبھی خلاف تہذیب کوئی بات کیا کرتا ہوں۔ لیکن یہ ایک اور قسم کی بات ہے۔ اگر ان کو مجھ پر بھروسہ ہے تو بھروسہ فرمالیں، اگر مجھ پر بھروسہ نہیں ہے تو اپنے کسی عالم سے پوچھ لیں۔ میں ذاتی ذمہ داری پر آپ سے کہہ رہا ہوں کہ جب آپ تجزیہ کریں گے کہ بعض مسلمانوں کو یہ غلط فہمی کیوں ہو گئی ہے کہ حضورؐ کی معراج جسمانی نہیں ہوئی بلکہ خواب دیکھا تھا تو اس کی جڑ میں قابلِ ذکر بس ایک روایت ہے ام المومنین حضرت عائشہ کی۔ وہ معظمہ یہ فرماتی نظر آتی ہیں کہ شبِ معراج پیغمبرؐ کا جسم میرے جسم سے جدا نہیں ہوا۔ اب ظاہر ہے کہ مسلمان اس بی بی کی بات کو کیسے جھٹلا سکتے ہیں جو ان کی نظر میں صدیقہ ہوں۔ اس بنیاد پر بعض مسلمان یہ کہنے لگے کہ پیغمبرؐ کو معراج ہوئی تھی مگر روحانی، یعنی پیغمبرؐ نے خواب دیکھا تھا۔ ان کا جسم بی بی کے پہلو ہی میں رہا تھا۔

میں اپنے مسلمان بھائیوں سے بکمال ادب یہ عرض کرتا ہوں کہ اس روایت کو اپنے یہاں سے کھرچ کر پھینک دیں، اگر اپنے پیغمبرؐ کی عزت چاہتے ہیں ورنہ اگر یہ روایت یورپین اسکالروں تک پہنچ گئی تو اور مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ افسوس صد افسوس کہ مسلمان ذرا بھی غور نہیں کرتے۔ ارے پیغمبرؐ کو معراج کہاں سے ہوئی ہے؟ قرآن پڑھیے۔ سُبۡحَانَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ قرآن کی لفظیں ہیں کہ مکہ سے معراج ہوئی ہے قبل ہجرت، ہجرت سے پہلے سرزمینِ مکہ سے پیغمبرؐ کو معراج ہوئی، یہ قرآن کہہ رہا ہے۔ اور جب بی بی

کی طرف آپ اس روایت کو منسوب کر رہے ہیں وہ پیغمبرؐ کے پہلو میں بعد ہجرت مدینہ میں تشریف لائیں، وہ اس سال پہلوئے پیغمبرؐ میں تھی ہی کہاں جو یہ فرماتیں کہ پیغمبرؐ میرے پہلو سے جدا نہیں ہوئے۔

تو ایک روایت ملتی ہے اور اس کا حاصل یہ کہ پیغمبرؐ کو معراج ہوئی ہے مکہ سے، ہجرت سے پہلے، اور ہجرت کے بعد پیغمبرؐ کے گھر میں یہ بی بی تشریف لائیں۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے بعض لوگوں کو اتنی جلدی ہے پہنچا دینے کی کہ وہ مکہ ہی میں پہنچائے دے رہے ہیں۔ لیکن بھائیو! ذرا سوچیے، ذرا غور کیجیے، کتنی بری بات ہے۔ کہیں یورپین اسکالروں کو خبر ہو گئی تو ایک اور مصیبت کھڑی ہو جائے گی، لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ مسلمانوں کی روایتوں کا یہ عالم کہ روایت گڑھنے پر آتے ہیں تو کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ دروغ گو را حافظہ ...... جھوٹے کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ ان کو یہ بھی یاد نہیں رہ گیا کہ یہ بی بی مکہ میں تھیں بھی یا نہیں۔

بس برادران عزیز! میں کہتا ہوں کہ پیغمبرؐ کے لیے شایانِ شان تھا کہ ان کو اس منزل پر بلا لیا جائے کہ جہاں یا پیدا کرنے والا ہو یا پیدا ہونے والا ہو، یا عبد ہو یا معبود ہو، یا خالق ہو یا مخلوق ہو۔ بات کی وضاحت کے لیے ایک مثال دے دوں۔ اس ہال میں آپ پورا اندھیرا کر دیجیے، بس دو ایک بلب روشن رہنے دیجیے۔ پھر ایک پلیٹ فرش پر رکھ دیجیے چھوٹی پلیٹ ایک ڈیڑھ بالشت کی۔ میں آپ سے پوچھوں گا کہ اس پلیٹ کا سایہ کتنی دور تک پڑ رہا ہے؟ آپ کہیں گے جتنی بڑی پلیٹ ہے اتنا ہی

سایہ ہے۔ میں کہوں گا ایک فٹ آپ اسے اونچا کیجیے تو پلیٹ اتنی ہی بڑی رہی مگر اس کا سایہ تھوڑا پھیل گیا، میں نے کہا ذرا اور اٹھائیے، آپ نے اور اٹھایا، پلیٹ تو اتنی ہی بڑی رہی، پلیٹ کو بلب سے ملا دیا تب جہاں جہاں تک پہلے اس بلب کی روشنی پھیل رہی تھی وہاں وہاں تک اس پلیٹ کا سایہ پھیل جائے گا۔ برادرانِ عزیز! یاد رکھیے کہ اللہ نے اپنے لیے کہا ربّ العٰلمین اور ان کے لیے کہا ہے رحمۃً للعالمین۔ یعنی جہاں تک اس کی ربوبیت کا دائرہ ہے وہاں تک ان کی رحمت کا سایہ ہے۔ اس لیے ضروری تھا کہ ان کو اس منزل بلند تک لے آیا جائے کہ جہاں عبد و معبود کے درمیان سے سارے فاصلے گویا ختم ہو جائیں کہ جہاں جہاں تک اس کی ربوبیت کا دائرہ تھا وہاں وہاں تک اس کی رحمت کا سایہ پھیل جائے۔ (صلوٰۃ)

بس برادران عزیز! یہ ہے پیغمبرؐ کی معراج کا مختصر سا بیان۔ مگر یاد رکھیے کہ پیغمبرؐ کے جسم کی معراج عرش پر چند لمحوں کے لیے تھی مگر کردار کی معراج زمین پر زندگی بھر رہی۔ ایک نفسیاتی بات عرض کر دوں جو کم و بیش تمام انسانوں میں پائی جاتی ہے کہ اگر وہ مہمان ہو جائے کسی ایسی ذات کا جو بہت عظیم ہو، تو اس کے مزاج میں ایک طرح کی بڑائی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ سلام کے جواب تک میں دشواری ہوتی ہے۔ یہ ہوتا ہے کہ نہیں؟ اب آپ ذرا انصاف سے بتائیے کہ پیغمبرؐ تشریف لے گئے اس منزلِ قدس پر، اللہ کے مہمان ہوئے جہاں سوائے نور کے اور کچھ نہیں، جہاں محبتوں بھری باتیں ہوئیں، جہاں آوازیں آ رہی ہیں کہ اُدْنُ مِنِّیْ

اور قریب آؤ اور قریب آؤ۔ کون بلا رہا ہے، خالقِ کائنات، مالکِ کائنات۔ اب غور کیجیے، کائنات کے خالق کا مہمان بن کر زمین پر آیا تو اس کو کون سا مقام ملا؟ یہاں اس کو ڈھیلے مارے جا رہے ہیں، یہاں اس کو پتھر مارے جا رہے ہیں، یہاں اس کی راہ میں کانٹے بچھائے جا رہے ہیں۔ خدا کی قسم! اگر معمولی انسان ہوتا تو اس کو اس ماحول میں ADJUST کرنا ممکن نہ ہوتا مگر جب اس کو پتھر مارے گئے تو پتھر مارنے والوں کو سینہ سے لگا لیا۔ اس کو گالیاں دی گئیں تو گالیاں دینے والوں کو دعائیں دیں۔ جب اس کی راہ میں کانٹے بچھائے گئے تو راہ میں کانٹے بچھانے والوں کی مشکلوں کو حل کیا۔

یاد رکھیے، وہ جسم کی معراج ہے اور یہ روح کی معراج ہے۔ میں بھی پیغمبرؐ کی معراجِ روحانی کا قائل ہوں مگر وہ خواب نہیں معراجِ کردار ہے۔ پیغمبرؐ کے جسم کی معراج کو دیکھنا ہو تو وہاں دیکھو، کردار کی معراج میں دیکھنا ہے تو یہاں دیکھو۔ ڈھیلے کھا رہے ہیں، جانتے ہیں کہ اللہ نے سب اختیار میں دے دیا ہے، اپنا اختیار دکھا دیا، اشارہ کیا چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ جس میں اتنی قوت ہو، اتنا اختیار، اتنا اقتدار، وہ ڈھیلے کھا رہا ہے اور مسکرا رہا ہے، پتھر کھا رہا ہے اور ہنس رہا ہے۔ کائنات کا پیدا کرنے والا کہتا ہے کہ کہو تو ان کا تختہ پلٹ دوں مگر یہ تھرتھرا کے کہتے ہیں کہ پالنے والے! یہ جانتے نہیں، اگر یہ جانتے ہوتے تو ایسا ہرگز نہ کرتے۔ یہ نادانی میں کر رہے ہیں، عذاب نہ بھیج، ان کو توفیق عطا کر کہ یہ میرا رتبہ پہچان لیں۔

میں کہتا ہوں مشرکین پیغمبرؐ کو کیا جانتے، ارے بھئی مسلمان تو جانتے ہیں۔ تو وہ شکوہ تو حضورؐ کو آج بھی باقی ہے۔ ذرا ایک واقعہ سن لیجیے۔ ابھی چند برس پہلے کی بات ہے۔ میرٹھ ہے ایک شہر ہندوستان میں، وہاں ایک جلسہ ہو رہا تھا، جلسۂ سیرت النبی سڑک پر ہزاروں آدمی شریک تھے۔ مقرر دو تھے، ایک شیعہ اور ایک بہت سینیر دوسرے مولانا وہ عمر میں بھی بڑے تھے اور مرتبہ بھی بہت بلند تھا، ایک مشہور تنظیم کے صدر تھے۔ پہلے ان کا نام پکارا گیا۔ اب ہندوستان کا ماحول یہاں کے ایسا تو ہے نہیں۔ سَو شیعہ کھڑے ہوئے ہیں سَو سُنّی۔ دو سَو ہندو کھڑے ہیں اور کچھ سکھ۔ پگڑیاں بھی دکھائی دے رہی ہیں اور چوٹیاں بھی دکھائی دے رہی ہیں۔ داڑھیاں بھی دکھائی دے رہی ہیں اور مونچھیں بھی دکھائی دے رہی ہیں۔ ہر مذہب کے لوگ شریک ہیں۔ سکھ بھی ہیں کرسچین بھی۔ ہندو بھی ہیں مسلمان بھی۔ دوست بھی ہیں دشمن بھی۔ خوش ہونے والے بھی ہیں اور جلنے والے بھی۔ ہزاروں افراد کا مجمع ہے۔

میں تمام مسلمان بھائی جو یہاں بیٹھے ہیں، ان کے سامنے عرض کرنا چاہتا ہوں۔ فرض کیجیے کہ میرا انتقالِ پُر ملال ہو گیا اور میری یاد میں آپ ایک جلسہ منعقد کرتے ہیں لاس اینجلیس میں۔ مجھ میں ہزاروں برائیاں ہیں صرف ایک آدھ اچھائی ہے تو ذرا انصاف سے بتائیے کہ جب میری یاد میں یہاں جلسہ ہو گا تو اس میں آپ میری اچھائی بیان کریں گے کہ برائیاں؟ ہزاروں برائیاں آپ میری چھوڑ دیں گے مگر وہ ذرہ برابر کی

تولہ برابر کی ایک اچھائی ہے، وہ بیان کریں گے۔ مگر مولانا موصوف کو سیرت رسولؐ میں کوئی اچھائی نہ دکھائی دی۔ صرف رسولؐ کی بھول یاد رہ گئی۔ ان کا موضوعِ تقریر تھا "رسولؐ بھولتے تھے"۔

بھائی اگر رسولؐ بھولتے بھی تھے تو آپ کیوں نہیں بھول رہے ہیں رسولؐ کا بھولنا۔ یہ بھولے وہ بھولے، یہاں بھولے وہاں بھولے۔ بھائی کسی صورت سے رسولؐ کا بھولنا نہیں بھولتے۔ جتنی بھولیں انھیں تاریخ میں مل سکیں وہ سب انھوں نے پیش کیں۔ میں واقعی پیچ وتاب کھا رہا تھا کہ یہاں ہندو، عیسائی، سکھ، سب کے سب کھڑے ہوئے ہیں اور آپ رسولؐ کی بھولیں بیان کر رہے ہیں کہ یہاں پر یہ بھول گئے وہاں پر وہ بھول گئے اور یہاں پر یہ لفظ بھول گئے، بات کر کے بھول سگئے، اپنا کام کر کے بھول گئے۔ اب کاش کہ میں نے یہ بات نہ چھیڑی ہوتی آپ کے سامنے اب چھیڑ کر پھنس گیا۔ آخر میں کہنے لگے، میں اس کی زیادہ وضاحت تو نہیں کر سکتا کیونکہ پتہ نہیں کیسے ان کی ہمت تھی کہ اس مجمع میں کہنے لگے ایک چیز اور رسولؐ بھولے۔ بھئی اب کیا بھولے؟ جو کہا اسے میں اشاروں میں کہوں گا، زیادہ وضاحت سے نہیں کہوں گا خود سمجھ لیجیے گا۔

ایک دن صبح کی نماز کا وقت تھا۔ صحابہ کرام کی صفیں مسجد میں کھڑی ہو گئیں، حضورؐ کا انتظار ہو رہا تھا کہ حضورؐ حضرت عائشہ کے حجرہ سے باہر تشریف لائے اور آنے کے بعد نماز کا ارادہ کر کے کھڑے ہوئے۔ اللہ اکبر کہنا چاہتے تھے کہ ایک مرتبہ جیسے کچھ یاد آیا، جیسے کچھ بھول گئے

ہوں۔ اب کیا بھولے، کہا کہ وہ گھر کے اندر واپس تشریف لے گئے، اور تھوڑی دیر کے بعد تشریف لائے تو حضورؐ کی زلفِ مقدس سے تازہ پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ سمجھ گئے آپ کہ کیا بھول گئے تھے؟ پھر صحابہ کرام نے پوچھا کہ حضور کیا ہوا تھا؟ نماز چھوڑ کر آپ کہاں چلے گئے تھے؟ حضورؐ نے پوری داستان دوہرائی۔ حادثہ یہ ہوا تھا کہ صبح کو غسل کرنا ضروری تھا اور میں غسل کرنا بھول گیا تھا۔

بخدا اس منبر کی قسم کھا کے کہتا ہوں، جب میں نے پلٹ کر مجمع کی طرف دیکھا تو بخدا سکھ ہنس رہے تھے، عیسائی ہنس رہے تھے، ہندو ہنس رہے تھے۔ دیکھا آپ نے! آئے ہیں سیرتِ رسولؐ بیان کرنے کے لیے اور دوسروں کو ہنسنے کا موقع دے رہے ہیں۔ میں اپنی تقریروں میں کسی پر تنقید نہیں کیا کرتا لیکن جب بات ناموسِ رسولؐ کی آجائے تو تو مروت کیسی! چنانچہ جب میں اسٹیج پر آیا اور میں نے تقریر شروع کی تو میں نے کہا کہ ایسے حضرات رسولؐ کی تعریف کرنے آجاتے ہیں جو خود رسولؐ کو نہیں پہچانتے، وہ رسولؐ کو کیا پہچنوائیں گے؟ اور پھر جو کچھ مجھ کو تقریر کرنا چاہیے تھی وہ میں نے کی۔ میں ڈر رہا تھا کہ سُنّی اکثریت کے مجمع میں سُنّی عالم پر تنقید کر رہا ہوں۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ خود سُنّی حضرات نے میری عزت افزائی فرمائی اور بہت ہی زیادہ پسندیدگی کا اظہار کیا۔

بس برادرانِ عزیز! وقت ختم ہو رہا ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے اور

قرآن پر مبنی ہے کہ رسولؐ کو معراج جسمانی ہوئی، مگر یاد رکھیے کہ اگر رسولؐ کو معراج ہوئی تو علیؑ کو بھی معراج ہوئی، پھر حسنؑ کو بھی معراج ہوئی۔ رسولؐ کی معراج تھی عرش پر گئے اور علیؑ کی معراج، جس کے قدم عرش پر تھے علیؑ کے قدم اس کے دوش پر تھے، یہ علیؑ کی معراج تھی۔ اور حسینؑ کی معراج یہ ہے کہ رسولؐ سجدے میں ہیں اور حسینؑ پشت کے اوپر ہیں اور مرضئ الٰہی یہ ہے، ارشادِ قدرت یہ ہے کہ میرے رسولؐ! یہ نماز میری ہے جب تک حسینؑ اپنی مرضی سے پشت پر سے اتر نہ جائیں آپ سجدہ سے سر نہ اٹھائیں. میں پھر عرض کرتا ہوں آپ کے سامنے، رسولؐ کی ایک معراج یہ تھی کہ وہ عرش پر گئے، دوسری معراج یہ تھی کہ زمین پر ڈھیلے مارنے والوں کو سینہ سے لگایا اسی طرح یہ حسینؑ کے جسم کی معراج ہے کہ پشت رسولؐ پر آئے اور کردار کی معراج کربلا کے میدان میں نظر آرہی ہے۔

بس عزادارانِ حسینؑ! آج محرم کی دوسری تاریخ ہوگئی۔ مجھے یہ بات کہنا نہیں چاہیے مگر آپ کے سامنے کہتا ہوں کہ یہ رونے کے دن ہیں، انھیں آنسوؤں نے آپ کو زندگی بخشی ہے، انھیں آنسوؤں نے آپ کو زندہ رکھا ہے۔ خدا شاہد ہے ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ نہ دولت ہمارے پاس نہ تعداد نہ حکومت، ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ یہی بہتے ہوئے آنسو ہیں کہ جنھوں نے بحیثیتِ قوم باقی رکھا ہے۔

بس عزادارانِ حسینؑ! کربلا کی طرف حسینؑ بڑھ رہے ہیں۔ جناب مسلمؑ کی شہادت کی اطلاع مل چکی لیکن جناب مسلمؑ کی شہادت کی خبر ملنے کے بعد بھی

قافلۂ حسینی رک نہیں رہا ہے۔ آپ کوفہ کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں یہاں تک کہ امامؑ کے سپاہیوں میں ایک سپاہی رکابوں پر زور دے کر کھڑا ہوا اور اس نے کہا اللہ اکبر! یہ ریگستان یہ صحرا، مگر مجھے کچھ دور پر کھجوروں کے درخت سے دکھائی دے رہے ہیں۔ امامؑ نے ان پر نظر ڈالی اور فرمایا نہیں میرے ساتھی، تمھاری نظر دھوکا کھا رہی ہے۔ یہ کھجوروں کے درخت نہیں، نہ اس کی پتیاں ہل رہی ہیں بلکہ یہ کوئی فوجی دستہ ہے جو ہماری طرف آ رہا ہے۔ ابھی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ ایک ہزار کا لشکر امامؑ کے سامنے آ گیا۔ عزیزانِ گرامی! مجھے معلوم ہے کہ میری تقریر کا انگلش میں ساتھ ساتھ ترجمہ ہو رہا ہے اس لیے واقعات کی تفصیل میں جانے کے لیے مجبور ہوں۔ آپ کو تو سب واقعات معلوم ہیں لیکن یہ بچے ہمارے چھوٹے چھوٹے معصوم بیٹھے ہیں، ان کو واقعات کا پتہ نہیں۔ ان کے لیے واقعات کی تہہ میں جانا ضروری ہے۔ تو یہ لشکر وہ تھا کہ جسے ابن زیاد GOVERNOR نے کوفہ کی طرف سے بھیجا تھا حسینؑ کو گرفتار کرنے کے لیے۔ اس سے پہلے حسینؑ جس منزل سے روانہ ہوئے تھے، اپنے ساتھیوں کو امامؑ نے حکم دیا تھا جتنا پانی ہو سکے بھر لو، جتنے پانی کا ذخیرہ STOCK کر سکتے ہو کر لو۔ لوگوں نے کہا فرزند رسولؐ! کیا ضرورت ہے؟ ہماری ضرورت بھر کا پانی موجود ہے ہماری مشکوں میں۔ مگر امامؑ کے فرمان پر ضرورت سے بہت زیادہ پانی ساتھ لے لیا گیا۔ اب وہ لشکر آ گیا سامنے ایک ہزار سپاہی مسلح لوہے میں ڈوبے ہوئے۔ کہا کیوں آئے ہو؟ مقصد بیان کر دیا کہ

فرزندِ رسولؐ! یا تو ہم آپ کو گرفتار کر کے لے جائیں گے کوفہ اور اگر آپ انکار کریں گے تو ہم آپ سے جنگ کریں گے۔ مقصد واضح ہو گیا کہ آنے والے خون کے پیاسے ہیں۔ مگر امامؑ نے کہا، ساری باتیں تو بعد میں ہونگی پہلے بتاؤ کہ تمھاری آنکھوں میں یہ زردی کیوں چھائی ہوئی ہے؟ چہرے اتنے مرجھائے ہوئے کیوں ہیں؟ گھوڑے اتنا ہانپ کیوں رہے ہیں؟ کہا ہمارے پاس پانی ختم ہو گیا ہے اور پیاس نے ہماری یہ حالت بنا دی ہے۔ امامؑ نے کہا بس اب ساری باتیں بعد میں ہوں گی، پہلے میں تم سب کو پانی تو پلوا دوں۔

دیکھیے وہ معراج جسم کی ہے کہ پشت رسولؐ پر ہیں، یہ کردار کی معراج ہے۔ آپ نے اپنے ساتھیوں سے کہا اور ساتھی بھی کیا وفاشعار تھے، خدا کی قسم آگے بڑھے اور بڑھنے کے بعد ان ایک ہزار سواروں کو پانی پلا دیا گیا یہاں تک امامؑ نے حکم دیا کہ جب سوار پی چکیں تو جانوروں کے سامنے پانی کے تھال رکھو اور ایک ایک گھوڑا جب تک دو دو تین تین مرتبہ پانی سے منھ نہ اٹھا لے اس کے سامنے سے پانی کا کاسہ نہ اٹھایا جائے۔ خود حر کے لشکر کا ایک آدمی کہتا ہے، میرے اوپر پیاس کی اتنی شدت طاری تھی کہ امامؑ کے لشکر کا ایک سپاہی مشکیزہ میرے دہانے کے پاس بار بار لاتا مگر میں گھبراہٹ میں پانی نہیں پی پاتا تھا۔ تو ایک مرتبہ امامؑ اترے گھوڑے سے۔ اترنے کے بعد مشکیزہ کا دہانہ سیدھا کر کے میرے ہونٹوں سے لگا دیا اور میری پیاس امامؑ نے اپنے ہاتھ سے بجھائی۔

عزاداران حسینؑ! اب میں ایک سوال کروں گا کہ آپ کے سامنے جب ایک ہزار سپاہی موت کے قریب پہنچ گئے تھے پیاس کی شدت سے تو پیاس کس نے بجھائی؟ ارے میں کہتا ہوں کیا ان میں سے کوئی میدانِ کربلا میں موجود نہیں تھا کہ جو حسینؑ پر ترس کھاتا نہ سہی کم سے کم حسینؑ کی بچی سکینہؑ پر تو ترس کھالیتا۔ حسینؑ کے چھ مہینے کے لال علی اصغرؑ پر تو ترس کھالیتا۔ مگر حسینؑ کی انسانیت تھی اور ان کی حیوانیت۔ یہ اصلی اسلام تھا اور وہ نقلی اسلام۔ بس واقعات کو مختصر کر کے آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اتنے میں نماز کا وقت آگیا تو امامؑ نے کہا کہ حر تو اپنی نماز الگ پڑھے گا یا ہمارے ساتھ پڑھے گا۔ کہا آپ کی موجودگی میں آپ کے ساتھ نماز پڑھوں گا۔ چنانچہ امامؑ آگے کھڑے ہوئے اور امامؑ کے پیچھے امامؑ کے سپاہی اور حر اور اس کے سپاہی۔ سب نے مل کر نماز ادا کی اس کے بعد پھر گفتگو شروع ہوئی۔ امامؑ نے کہا اب تیرا کیا ارادہ ہے؟ کہا کہ یہی کہ میں آپ کو کوفہ لے چلوں گا، کوفہ نہیں چلیں گے تو بات بڑھ جائے گی۔ کہا نہیں، میں کوفہ نہیں جاؤں گا، مجھے اجازت دے دے کہ میں مدینہ چلا جاؤں۔ کہا مدینہ تو میں آپ کو نہ جانے دوں گا۔

بس اس کے بعد بات آگے بڑھی۔ امامؑ نے اپنے ساتھیوں سے کہا آگے بڑھو۔ حر آگے بڑھا اور آگے بڑھ کر امامؑ کے گھوڑے کی لجام پر ہاتھ ڈال دیا کہ آگے نہ بڑھنے پائیں۔ اس منزل پر عزاداران حسین! ایک روایت میں ہے کہ جیسے ہی یہ خبر بیبیوں کو ہوئی کہ امام حسینؑ کے

لجام فرس پر سردارِ لشکر حر نے ہاتھ ڈال دیا ہے تو بیبیوں کے رونے کی آواز آئی کہ آج فرزندِ فاطمہؑ کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ ایک آدمی جسارت کر رہا ہے۔ حسینؑ نے حُر سے کہا، تیری ماں تیرے ماتم میں بیٹھے، کیا چاہتا ہے؟ حر نے جنگ سے ڈرایا مگر امامؑ نے اس منزل پر جو جواب دیا وہ سن لیجیے۔ فرمایا حُر تو کیا مجھے دھمکیاں دے رہا ہے؟ تو کیا مجھے ڈرا رہا ہے؟ یہ بتا دے، تو کیا کر سکتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ تو اور تیرا لشکر مجھے قتل ہی تو کر دے گا، میں تو قتل ہونے کے لیے ہی گھر سے نکلا ہوں۔ جو موت کے لیے گھر سے نکلا ہے تو اسے موت سے ڈراتا ہے۔

بس برادرانِ عزیز! اب میں نے حر کے بارے میں اتنا کچھ عرض کیا ہے تو چاہتا ہوں کہ آج کی مجلس میں حر ہی کا ذکر کر دوں۔ بس عزادارانِ حسینؑ! آخر بات طے ہوئی کہ اچھا نہ مدینہ جائیں نہ کوفہ جائیں، درمیان سے راستہ اختیار کیا جائے۔ چنانچہ ایک درمیانی راستہ اختیار کیا گیا اور حسینؑ جیسے کھنچتے ہوئے کربلا کی طرف چلے۔ یہاں تک کہ جب کربلا کے میدان میں پہنچ گئے تو حسینؑ کا گھوڑا چلتے چلتے خود ہی رُک گیا۔ حسینؑ نے بار بار گھوڑے بدلے آخر پوچھا اس سرزمین کا کیا نام ہے۔ کسی نے کہا غاضریہ ہے، کسی نے کہا نینوا ہے، کسی نے کہا شطِ فرات ہے۔ میں کہتا ہوں کہنے والے چپ ہو جائیں، اب اس کے بعد کوئی نام نہ لے۔ مگر ایک گوشہ سے آواز آئی، فرزندِ رسولؐ اسے کربلا بھی کہتے ہیں۔ بس کربلا کا نام سننا تھا کہ حسینؑ نے کہا کہ بس ٹھہر جاؤ، ہمارا قافلہ یہیں اترے گا، یہیں ہمارے مدفن ہوں گے۔

بس عزادارانِ حسینؑ! میں نے کہا تھا آپ کے سامنے کہ حر کا تذکرہ کر کے مجلس ختم کر دوں گا۔ یہ واقعہ ہے کربلا کے میدان کا سب سے بڑا مجرم حُر تھا کیونکہ اگر حُر حسین کو گھیر کر میدانِ کربلا میں نہ لایا ہوتا تو نہ پانی کی بندش ہوتی نہ بچے شہید ہوتے نہ عباسؑ کے بازو کٹتے، نہ علی اکبرؑ کے سینہ پر برچھی لگتی۔ یہ کچھ نہ ہوتا نہ سیدانیاں اسیر ہوتیں تو جو کچھ ہوا ہے اس کی پہلی ذمہ داری جاتی ہے حُر پر۔ بس اب وقت ختم ہو گیا ہے، بیان کر کے ختم کرنا چاہتا ہوں۔

عزادارانِ! صبح عاشور نمودار ہوئی تو حر تڑپ کر پسر سعد کے پاس آیا کہا، کیا واقعی حسینؑ سے جنگ کرنے کا ارادہ ہے؟ کہا کہ ہاں جنگ ہوگی حر! اور ایسی جنگ ہوگی کہ کربلا کا میدان لاشوں سے پٹ جائے گا۔ کہا صلح کی کوئی صورت نہیں؟ کہا نہیں، اب صلح کی کوئی صورت نہیں ہے۔ بس اب تک تذبذب میں تھا مگر یہاں سے چلا تو جسم کا ایک ایک حصہ کانپ رہا تھا، چہرہ کا رنگ زرد تھا۔ اس کا ایک ساتھی قرہ بن قیس ملا۔ اس نے کہا اے حر! مجھ سے کوئی پوچھتا کہ کوفہ میں سب سے زیادہ بہادر کون ہے تو میں تیرا نام لیتا مگر آج تو تھرتھرا کیوں رہا ہے؟ حر نے کہا میں مرنے سے نہیں ڈرتا مگر میرے ایک طرف جنت ہے اور دوسری طرف جہنم۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں کہ کدھر جاؤں! یہ کہتے کہتے آگے بڑھ گیا۔ آگے بڑھنے کے بعد بیٹے کو آواز دی یَا بُنَیَّ لَا صَبْرَ لِیْ عَلَی النَّارِ۔ بیٹا! میں مر سکتا ہوں مگر جہنم میں نہیں جا سکتا۔ بیٹا

دیکھ سامنے وہ جنّت کا شہزادہ کھڑا ہوا ہے اگر جنت میں چلنا ہے تو ادھر چل۔ بیٹا بھی ساتھ آگیا دونوں نے اپنے گھوڑوں کو رفتار کے ساتھ اڑایا دونوں لشکروں کے درمیان پہنچ کر حر نے اپنا گھوڑا روکا۔ بیٹا بھی رکا، گھوڑے سے اترا، بیٹے سے کہا یہ چہرہ حسینؑ کو دکھانے کے لائق نہیں ہے، پہلے ردا میرے چہرے پر ڈال دے کہ یہ چہرہ چھپ جائے۔ اے بیٹا! میں نے بڑا جرم کیا ہے۔ آج فاطمہؑ کا چمن میری گستاخی کی وجہ سے، میری ناسمجھی کی وجہ سے پامال ہو جائے گا، بیٹا! میں بہت بڑا مجرم ہوں۔ بیٹا! یہاں زنجیر تو موجود نہیں، کم از کم اتنا تو کر کہ میرے ہاتھوں کو رومال سے باندھ دے۔ میں چاہتا ہوں کہ میں حسینؑ کے پاس ایک مجرم کی شکل میں جاؤں۔ بیٹے نے باپ کے ہاتھ باندھے، چہرے پر ردا ڈال دی۔ حر نے آگے بڑھنا شروع کیا۔ حسینؑ کربلا میں گھوڑے پر سوار، آسمان پر نظریں، بارگاہِ الٰہی میں راز و نیاز کی باتیں۔ حُرؓ ایک مرتبہ آیا تڑپ کر اور حسینؑ کے پیروں سے لپٹ گیا اور کہا کہ فرزند رسولؐ! فرزند رسول! یہ نہیں کہا، خدا کی قسم یہ نہیں کہا کہ میری خطا معاف کر دیجیے، کہا کہ یہ بتائیے کہ کیا میری خطا معاف ہو سکتی ہے؟ مطلب یہ کہ جرم اتنا بڑا ہے کہ حرؓ کو امید نہیں ہے کہ میری خطا معاف ہو جائے گی۔ مگر جیسے ہی حُر نے کہا میری خطا معاف ہو سکتی ہے حسینؑ نے حُرؓ کا سر اٹھا کر سینہ سے لگا لیا اور کہا، میں بشارت دیتا ہوں کہ میں نے معاف کر دیا، میرے خدا نے بھی معاف کر دیا۔ اور اب جو حرؓ نے سر اٹھا کر دیکھا تو دیکھا کہ حسینؑ کی

آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ کہا فرزندِ رسولؐ! میں اپنی خطا پر رو رہا ہوں، آپ کیوں گریہ کر رہے ہیں؟ کہا کہ حرؓ تو اپنی خطا پر شرمندگی میں رو رہا ہے اور ہم کو شرمندگی یہ ہے کہ اے حرؓ! جب تو دشمن بن کر آیا تھا تو میں نے تیری مہمانی کی تھی، جب دوست بن کے آیا ہے تو ہمارے پاس پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے کہ اپنے مہمان کی خدمت میں پیش کر سکوں۔ حر نے کہا اے فرزندِ رسول! یہ آپ کی شان کریمی تھی کہ آپ نے میری خطا کو معاف کر دیا لیکن میں نے گناہ کیا ہے، اس کا مجھے کفارہ ادا کرنا ہے۔ کہا کیا کفارہ ادا کرنا ہے؟ کہا شہید تو مجھے بھی ہونا ہے اور میرا لختِ جگر، مرے دل کا ٹکڑا، میرا بچہ بھی شہید ہوگا۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ پہلے یہ میرے سامنے شہید ہو، میں دنیا سے اٹھوں تو اس کا داغ لے کر جاؤں۔

حسینؑ لاکھ لاکھ روکتے رہے مگر حر نے اتنا اصرار کیا کہ آخر حسینؑ مجبور ہو گئے تو کہا کہ اچھا اگر تیری یہی مرضی ہے تو یہی سہی۔ حر کا بیٹا میدان میں گیا، حمید ابن مسلم جو لشکر پسر سعد کا ایک سپاہی ہے، اس کا بیان ہے جب تک حر کا بیٹا جنگ کرتا رہا، میں دیکھ رہا تھا کہ حرؓ کے چہرے پر زردی تھی کیونکہ وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا بیٹا پھر اُس طرف نہ چلا جائے۔ مگر جب اپنے خون میں ڈوب کر گھوڑے سے گرا تو حرؓ کے چہرہ پر سرخی آگئی۔ کہا کہ پالنے والے! تیرا شکر یہ کس زبان سے ادا کروں، میری قربانی کو تو نے قبول کر لیا، میرا کفارہ تیری بارگاہ میں قبول ہو گیا۔ کہنے کو تو کہہ دیا، مگر جوان بیٹے کا معاملہ تھا، اپنی جگہ پہ ٹھہر نہ سکا۔ تیزی

سے بیٹے کی طرف روانہ ہوا۔ مگر پہنچا تو دیکھا حسینؑ پہلے پہنچ چکے ہیں، زمین پر بیٹھے ہیں، پسر حر کا سر گود میں ہے۔ خاک خون پاک کر رہے ہیں۔ حر دیکھتا رہا۔ حر کے بیٹے نے فاطمہؑ کے بیٹے کی گود میں آخری ہچکی لی تو حرؓ لاش اٹھانے جھکا۔ بس ایک مرتبہ حسینؑ تڑپ کر کھڑے ہو گئے۔ حر کے سینے پر ہاتھ رکھ کے پیچھے ہٹایا، کہا کیا میت اٹھائے گا جوان بیٹے کی! یہ نہیں ہو سکتا، باپ بیٹے کی میت نہیں اٹھاتا، میں اٹھاؤں گا تیرے لال کا جنازہ۔

عزادارو! حر کے بیٹے کی میت حسینؑ نے اٹھائی مگر علی اکبرؑ کی لاش اٹھانے کے لیے کوئی نہ آیا، بوڑھا باپ، جوان کی لاش اٹھائے نہیں اٹھتی، کبھی اٹھاتے ہیں کبھی زمین پر رکھ دیتے ہیں۔ آخر کچھ بچے دوڑے ہوئے آئے، جوان کی لاش اٹھائی، حسینؑ پیچھے پیچھے ماتم کرتے ہوئے روانہ ہوئے۔

چوتھی مجلس

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ وَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۵ (سورہ آل عمران آیت ۸۵)

برادران عزیز! عشرۂ محرم کی تاریخیں بہت تیزی سے گزر رہی ہیں اور آج محرم کی تیسری تاریخ ہے۔ آیت میں نے وہی پڑھی ہے آپ کے سامنے جو اس سے پہلے پڑھتا رہا ہوں جس میں ارشاد اقدس الٰہی ہو رہا ہے کہ اسلام کے علاوہ اگر کوئی انسان کسی دوسرے مذہب کو، کسی دوسرے دین کو، کسی دوسرے طریقۂ فکر اور طرز زندگی کو اختیار کرے گا تو ہم اس سے وہ دین قبول نہیں کریں گے اور ایسا انسان جب آخرت کی منزل میں داخل ہوگا تو اسے خود اس بات کا احساس ہو جائے گا کہ وہ نقصان اٹھانے والوں میں رہا۔

ایک بات میں آپ کی خدمت شروع میں عرض کر دوں، ممکن ہے کہ یہ بات آپ محسوس کریں کہ مجلسوں کے موضوع بدل رہے ہیں تو اس

کی وجہ میں آپ کے سامنے عرض کر دوں کہ آپ چینل CHANNEL بدلتے ہوئے دیکھ رہے ہیں مگر ان ہاتھوں کو نہیں دیکھ رہے ہیں کہ جنھوں نے چینل CHANNEL بدلا ہے۔ سب میرے کرم فرما ہیں، جہاں تک میرا امکان ہے میں کسی کی بھی دل شکنی کرنا نہیں چاہتا۔ لہٰذا مجلس کے خاتمہ کے بعد جب کوئی شخص کہتا ہے کہ کل مثلاً آپ یہ موضوع پڑھ دیجیے تو میں اس کو پڑھ دیتا ہوں۔ ہر روز نئی فرمائش آتی ہے اور میں اسے پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں تو اس لیے یہ موضوع بدلتے رہیں گے اس کا کوئی چارہ نہیں ہے، بہر حال جہاں تک میرے امکان میں ہے، میں لوگوں کی فرمائش کی تکمیل کرتا رہوں گا۔

تمہید میں قرآن مجید! برادران عزیز! یہ بات آپ کے سامنے اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ میں ایک مسلمان ہوں اور قرآن میرا عقیدہ ہے اور ایمان ہے بلکہ یہ ایک حقیقت بھی ہے اور یہ ایک شکوہ بھی ہے کہ قرآن، احادیث رسولؐ، اقوال ائمہ طاہرینؑ، نہج البلاغہ، صحیفۂ کاملہ یہ خالی مذہبیات کے خزانے نہیں ہیں بلکہ یہ سائنسی SCIENTIFIC معلومات کے بھی سمندر ہیں اور اگر میں کہتا ہوں کہ زیادہ نہیں صرف پچاس، ساٹھ آدمی ایسے مل جائیں کہ جو سائنس کی کسی ایک برانچ BRANCH میں DEDICATED تخصص SPECIALISATION رکھتے ہوں اور وہ SPECIALISATION کے ساتھ ساتھ عربی پڑھ لیں اور عربی پڑھنے کے بعد قرآن مجید، احادیث، نہج البلاغہ وغیرہ کا مطالعہ کریں تو میں سمجھتا ہوں کہ ہزار علماء کی تبلیغ ایک طرف اور

ان پچاس سائنس دانوں کی تبلیغ ایک طرف۔

میں اپنی پوری ذمہ داری پر آپ کے سامنے یہ بات رکھتا ہوں اس لیے کہ میں تو بالکل ہی جاہل ہوں، معمولی انسان ہوں۔ خدا کی قسم اپنی بے بضاعتی کا قدم قدم پر احساس ہوتا ہے۔ تھوڑا سا درک، تھوڑا سا مَس، تھوڑا سا TOUCH ہے مجھے ASTRONOMY سے۔ تو میں برابر قرآن پڑھتا ہوں، احادیث کو دیکھتا ہوں، ائمہ طاہرینؑ کے ارشادات کو دیکھتا ہوں، نہج البلاغہ کو پڑھتا ہوں تو نہ جانے کتنی باتیں مجھے مل جاتی ہیں جب کہ میری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں، تو جو لوگ سائنسی مضامین میں مہارت رکھتے ہیں اور جن کی نظریں بہت گہری ہیں وہ ان سمندروں میں ڈوب کر نہ معلوم کیسے کیسے جواہرات دنیا کے سامنے رکھ سکتے ہیں۔

اب قرآن مجید ہی کو دیکھیں جس میں یہ صفت پائی جاتی ہے کہ دنیا کے جتنے علوم ہیں وہ سب سمٹ کر قرآن کے دامن میں آگئے ہیں۔ جیسے قرآن کا ساری دنیا سے مطالبہ ہے، تمھارے پاس جو علم ہے، تم جس فیلڈ میں SPECIALISATION کیے ہوئے ہو اس کی عینک لگا کر ہم کو پڑھو تو بہت سی باتیں تم کو ایسی معلوم ہو جائیں گی جو دنیا والے تم کو نہیں بتا پائیں گے۔ تو یہ صفت خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اس کا کلام ہے جس نے اس کائنات کی مشینری چلائی ہے، جو نظامِ کائنات پر نگراں ہے۔ آج علم اور سائنس میں بھی کوئی سائنس داں آپ کو ایسا نہیں مل سکتا ہے جو دعویٰ کرے کہ سائنس کی جتنی BRANCHES ہیں ان سب پر

میرا قابو ہے۔ اس لیے کہ جو PHYSICS جانتا ہے وہ CHEMESTRY نہیں جانتا ہے، جو کمسٹری جانتا ہے وہ BIOLOGY نہیں جانتا جو BIOLOGY جانتا ہے وہ ZOOLOGY نہیں جانتا جو ZOOLOGY جانتا ہے BOTANY نہیں جانتا۔ تو بھلا کوئی کتاب ہمارے پاس ایسی ہے کہ جس میں دنیا کی ہر سائنس آگئی ہو؟ اور کتاب ہے چودہ ۱۴۰۰ سو برس پہلے کی۔ تو ہم کو قدرتی طور پر یہ بات ماننا پڑے گی کہ محدود نظر رکھنے والے انسان کا کلام نہیں ہے یہ کوئی SUPERIMPOWER قدرت مطلقہ ہے SUPREME KNOWLEDGE علم کل ہے جس کے کلام نے قرآن مجید کی شکل اختیار کرلی ہے۔

ایک بات یہ ہے کہ جو دعویٰ قرآن مجید نے کیا ہے وہ دنیا کی کسی کتاب نے آج تک نہیں کیا نہ قرآن سے قبل نہ قرآن کے بعد۔ اور وہ یہ کہ لا رطب ولا یابس اِلّا فی کتابٍ مُّبین ٥ یہ پوری کائنات سمٹ کر اس قرآن میں آگئی۔ اور دوسری اس سے عجیب وغریب بات ہے کہ جس کو حضرت علیؑ ابن ابی طالب نے فرمایا قرآن کے بارے میں یعنی ابھی انسان یہ سوچ رہا تھا کہ یہ کتاب پھیلے تو زمان ومکان کو اپنے دامن میں سمیٹ لے کہ علیؑ ابن ابی طالب نے آگے بڑھ کر کہا ابن عباس سے ایک سورہ کی تفسیر بیان ہو رہی ہے۔ سورہ فاتحہ جس میں کل سات آیتیں ہیں اور سات آیتوں کی تفسیر میں پوری رات ختم ہو گئی۔ اور تفسیر بیان بھی علیؑ ابن ابی طالب کسی کند ذہن اور کسی DUILL غبی سے نہیں کر رہے ہیں، ابن عباس سے جو حبر الامہ کہے جاتے ہیں۔

حد سے زائد ذہین اور سمجھدار، اشاروں میں مطلب سمجھ لینے والے، مگر اس کے باوجود ساری رات ختم ہو گئی صرف سات آیتوں کی تفسیر میں اور تفسیر نہ ختم ہوئی۔

جب سپیدۂ سحر طلوع ہونے لگا تو علیؑ نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی اور فرمایا، ہاں ابن عباس! اب کیا کیا جائے کہ رات ختم ہو گئی اور ابھی بات نہیں ختم ہوئی۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ اچھا چلو ابن عباس! تم بھی چلو ہم بھی چلیں نماز پڑھنے، مگر چلنے سے پہلے اتنا سن لو قرآن کے بارے میں کہ جو کچھ پورے قرآن میں ہے سمٹ کر آگیا ہے سورۂ حمد میں اور جو کچھ سورہ حمد میں ہے وہ سمٹ کر آگیا ہے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں، جو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں ہے وہ سمٹ کر آگیا ہے "ب" میں اور جو کچھ "ب" میں ہے وہ سمٹ کر آگیا ہے اس نقطہ میں جو "ب" کے نیچے دیا جاتا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید میں ایک دوسری صفت پائی جاتی ہے۔ پھیلے تو اس کائنات کو اپنے دامن میں لے لے۔ اور پھر سمٹے تو ایک نقطہ بن جائے۔ (صلوٰۃ)

اب ٹھیک ہے، آپ نے فرما دیا سبحان اللہ! آپ کی سمجھ میں آیا، لیکن یہاں پر بہت سے ایسے بچے بھی ہوں گے جو یہ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک کتاب سمٹ کر صرف ایک DOT میں آجائے، نقطہ میں آجائے۔ تو آج کا بچہ کہہ سکتا ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے جناب کہ چھ ہزار سے زائد آیتیں ہیں پورے قرآن

ہیں اور ایک سو چودہ[۱۱۴] سورے ہیں اور تیس[۳۰] پارے ہیں، یہ سب سمٹ کر کیسے ایک نقطہ میں آجائیں گے؟

اب دیکھیے اگر یہ بات آپ کسی سے اس صدی کے شروع میں پوچھتے تو آپ کو نہیں سمجھایا جاسکتا تھا۔ لیکن آج میں آپ کو سمجھا سکتا ہوں۔ آپ تو ایک ایسی دنیا میں بیٹھے ہوئے ہیں کہ جہاں کتابوں کا شمار نہیں کیا جاسکتا کہ روز کتنی کتابیں چھپ کر آتی ہیں۔ کتابیں چلی آتی ہیں جگہ بھرتی جاتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کہاں رکھی جائیں اتنی کتابیں؟ پھر دنیا میں ایسے مخطوطے MANUSCRIPT پائے جاتے ہیں جن کا ہر اہم لائبریری میں ہونا ضروری ہے مگر ان کے نسخے بہت محدود ہیں، یہ ہر لائبریری میں پہنچیں کیسے؟ مگر ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔ ان دونوں مشکلوں کو حل کرنے کے لیے سائنس آگے بڑھی، اس نے MICROFILM ایجاد کردی۔ یعنی بڑی بڑی کتابیں چھوٹی چھوٹی فلموں میں سما گئیں۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی، سائنس کے تجربات ہوتے رہے، مائکروفلم کے بعد مائکروفش MICROFISH بنی۔ وہ بھی آپ نے دیکھی ہی ہوگی، میں نے دیکھی ہے۔ ایک چھوٹا سا پلاسٹک کا ٹکڑا ۳ × ۴ انچ کا مثلاً اور اس کو جب آپ نے روشنی کے رُخ سے دیکھا تو اس میں سیکڑوں چھوٹے چھوٹے، چھوٹے چھوٹے رائی کے دانے کے برابر DOTS دکھائی دیں گے۔ بھائی یہ ہے کیا؟ یہ دھبے اس پر کیسے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ اس کو دھبہ نہ کہیے ورنہ آپ کی عقل پر دھبہ لگ جائے گا۔ کہا پھر کیا ہے؟ کہا آئیے ہم آپ کو دکھاتے ہیں۔ لے گئے

اس کے SPECIAL PROJECTOR پر اس کو لگا دیا۔ جب PROJECTOR پر اس کو لگا دیا تو یہ بات ہمارے سامنے عیاں ہوئی کہ وہ جو چھوٹے چھوٹے SPOTS جو آپ کو دکھائی دے رہے تھے وہ SPOTS نہ تھے بلکہ وہ کتاب کا ایک ایک PAGE تھا جو ENLARGE ہو کر ہمارے سامنے آگیا۔ دیکھیے کتاب سمٹ رہی ہے، کتاب سمٹ کر پہلے آئی MICROFILM کی شکل میں پھر MICROFICHE کی شکل میں اور بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی۔ یہ تو ہے تعمیر کی راہ میں کام اور تخریب کی راہ میں DESTRUCTION کی راہ میں سائنس اس سے بھی آگے بڑھ گئی۔ جب سائنس کے اوپر مذہب کا قابو نہیں رہتا ہے تو سائنس ایک قدم CONSTRUCTION میں چلتی ہے تو دس قدم DESTRUCTION میں چلتی ہے۔ اب DESTRUCTION میں کیا ہوا؟ آج کی دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کفر کا خاتمہ ہو گیا اور نفاق کا پھیلاؤ ہو گیا۔ آج الفاظ بہت خوبصورت ہوتے ہیں اور اس کی تہوں میں چھپے ہوئے معانی و مفاہیم بڑے گندے ہوتے ہیں۔ نام ہے EMBASSY اور کام جاسوسی ہوتا ہے کہ نہیں؟ یہاں کے راز وہاں بھیجے جا رہے ہیں اور وہاں کے راز یہاں آ رہے ہیں۔ معاہدہ نہ ہوتے ہوئے بھی معاہدہ ہوتا ہے کہ ہماری جاسوسی تم کرو گے، تمہاری جاسوسی ہم کریں گے دونوں میں سے کوئی برا نہیں مانے گا۔ یہ شیطان نے شیطان سے ہاتھ ملایا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہاں کے DOCUMENTS وہاں کیسے جائیں